

چونکا دیئے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

ڈاک

مئی 2013



درتوبہ

سائل دعا بخاری

16

سبک رفتاری سے دل دو مانگ کو روک کے
کھتے میں چکڑی ہوئی ایک شاہکار کہانی

آغوش

راشد نذیر طاہر

33

انہی کہانیوں کے حاشیائی لوگوں کے لئے ایک
گوشِ لطیف، حیرت انگیز مگر سبق آموز کہانی

عشق حیات ہے

اقصیٰ رباب

41

چاہت دلوں سے سرشار ایک نوجوان کی
روداد جس نے محبت کی خاطر موت پر غلبہ پایا

رولوکا

اے وحید

50

وہابی پر مبنی ایک ناول کا ایک حصہ جس کی حیرت انگیز
کہانی جلدی کٹر سٹیلی آپ کو کھوکھلا کر دیں گی

غیر انسانی مخلوق

محمد رضوان قیوم

71

نیکو ناکہ ایک ناول کا ایک حصہ ہے کہ ناولیہ اور ناولی
خلق دیکھیں عام انسانوں کی طرح وقتی ہیں

موت کی مسکراہٹ

عثمان غنی

79

میش و نائل کے گرداب میں غوطہ زن جسم
پرستہ طاری کرتی ایک عبرت ناک روداد

انتقام

نظارت نصر

87

لغزش، دنگل، دہشت ناک اور غیر انگیز
کہانیوں کے حاشیائی لوگوں کے لئے ایک کہانی

خونی مردے

صفدر شاہین

92

ریت کے گنگوٹ پر جس پر جسم لئے دلی
لیک عجیب و غریب حیرت ناک انوکھی کہانی

سنہری تابوت

ایم اے راحت

110

شاہکار کہانیوں کے حاشیائی لوگوں کے لئے
ایک عجیب و غریب حیرت انگیز اور تھریلر کہانی

شعلے کی موت

ایس امتیاز احمد

133

عجیب سحر انگیز..... حیر انگیز اور دل دو مانگ
دہلانا اور روکنے کھڑے کرنا شاہکار

ہمدرد روح

ساجدہ راجہ

139

کیا یہ حقیقت ہے کہ بعض روئیں بھی ساہیا
سال سرگرداں وقتی ہیں۔ ایک گوشِ کہانی

موت کی سختی

غلام نبی نوری

149

آکھٹ بدعاش اور جسم و جاں پر خوف و لرزہ
طاری کرتی سبق آموز اور حقیقی روداد

قبر

احسان بھر

155

دل دو مانگ پر دہشت اور دہشت طاری کرتی
ایک نوبت کی ایک خوفناک اور ڈرائی کہانی

آخری دعا

کے۔ اے۔ راجپوت

167

رونگٹے کھڑے کرتی..... رنگ و بے میں
سنسنی پھیلائی جسم پر لرزہ طاری کرتی کہانی

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

174

تجسس اور سسٹم سے بھرپور واقعات جو
پڑھنے والوں کو ہلے چلتے حیرت میں ڈال دیں گے

سنیاسی راج کمار

عامر ملک

197

حرفِ حرف اور سطر سطر تجسس اور انجمنے میں
واقعی حقیقت سے دو چار گوش اور غریب کہانی

قوس قزح

ادارہ

211

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جن میں قارئین
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

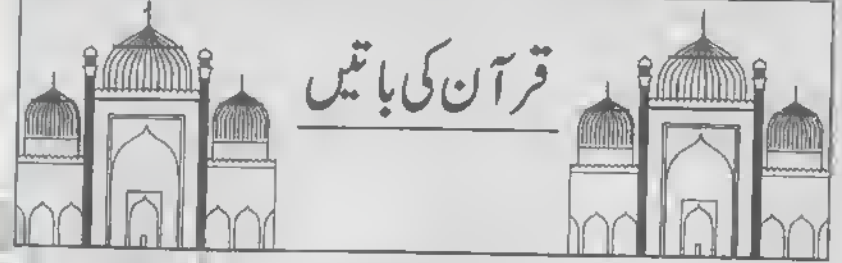
خونی سفر

شہزادہ چاند زیب عباسی

216

سوچ کی دادی میں جو بے پروا ذوق و مانگ
کو فرشتہ جیسی دل فریب اور حیر انگیز کہانی

قرآن کی باتیں



- ☆ اگر تم بارش کے سبب تکلیف میں ہو یا بیمار ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تمہارا راکھو مگر ہو شیاء ضرور ہوا اللہ نے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 102)
- ☆ اور بارش میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز کر دیتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 164)
- ☆ اسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے۔ پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آگیا۔ اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لئے آگ میں جاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور پانی جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے اس طرح اللہ صحیح اور غلط کی مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (سورۃ رعد 13 آیت 17)
- ☆ اور وہی تو ہے جو لوگوں کے نام امید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا اور اپنی رحمت یعنی بارش کی برکت کو پھیلا دیتا ہے اور وہ کارساز اور سرالو ترغیف ہے۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 28)
- ☆ تو انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے بے شک ہم ہی نے پانی برسایا۔ پھر ہم ہی نے زمین کو چیرا پھاڑا پھر ہم نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاری اور نخول اور کجوریں اور گتے گتے باغ اور میوے اور چارباہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چارپایوں کیلئے بنایا۔ (سورۃ عیسٰی 80 آیت 24 سے 32)
- ☆ اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے۔ اور جو کچھ گھٹ رہا ہے اسے بھی جانتا ہے، اور جو کچھ بڑھ رہا ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ (سورۃ رعد 13 آیت 8)
- ☆ ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو توہمڑے کی شکل دی۔ پھر توہمڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا پس بڑی ہی برکت ہے اللہ۔ (سورۃ مؤمنون 23 آیت 14)
- ☆ اس نے انسان کی پیدائش کی ابتدا گارے سے کی ہے۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی

جو تغیر پانی کی طرح ہے۔ (سورۃ عبہ 32 آیت 8)

- ☆ ہم نے انسان کو ایک مخصوص نطفے سے پیدا کیا۔ (سورۃ دھر 76 آیت 2)
- ☆ اللہ نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا۔ پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔ پھر اس کے لئے زندگی کی راہ آسان کی۔ (سورۃ عیسٰی 80 آیت 19 سے 20)
- ☆ انسان کو ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ (سورۃ طارق 86 آیت 6)
- ☆ پڑھو، اے نبی! اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، تجھے ہوئے خون کے ایک قطرے سے انسان کی تخلیق کی پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا ہے جسے وہ نہ جانتا تھا۔ (سورۃ علق 96 آیت 1 سے 5)
- ☆ اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری ہے گی اور عمل نیک کرے گی اس کو ہم دونا ثواب دیں گے اور اس کے لئے ہم نے عزت کی روزی تیار کر رکھی ہے۔ اسے پیغمبر کی پیروی اتم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم پر ہیزار گار رہتا چاہتی ہو تو کسی اجنبی شخص سے نرم نرم باتیں نہ کیا کرو تا کہ وہ شخص جس کے دل میں کسی طرح کا مرض ہے کوئی امید نہ پیدا کر لے۔ اور ان میں دستور کے مطابق بات کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہارِ جہل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ اور نماز پڑھتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہو۔ اے پیغمبر کے اہل بیت، اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کا میل یکمل دور کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔ اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں پڑھیں جاتی ہیں ان کو یاد رکھو بے شک اللہ باریک بین اور باخبر ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 31 سے 34)
- ☆ یا ان کی مثال مینہ کی سی ہے کہ آسمان سے برس رہا ہو اور اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو اور بادل گرج رہا ہو اور بجلی کو اندھیرے ہو تو یہ کڑک سے ڈر کر موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور اللہ کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کی بصارت کو اچک لے جائے جب بجلی چمکی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں کی شنوائی اور آنکھوں کی بینائی دونوں کو زائل کر دیتا۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 19 سے 20)
- (کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“، بشکریہ شیخ بک ابنجی کراچی)

[illegible]

شگفتہ حسین کراچی سے، ڈر کے تمام پڑنے اور کھنے والوں کو میرا یا میرا اسلام، 3 مہینے کے بعد حاضر ہوئی ہوں، اس کے لئے (Sory) کیونکہ معرفت کی وجہ سے ڈر میں نہیں بیٹھ سکی، اس کے لئے دوبارہ (Sory) آپ آتے ہیں اس ماہ کی کہانیوں کی طرف تو دیئے تو اس ماہ کی ساری ہی کہانیاں اچھی ہیں۔ پہلے نمبر پر "سنہری تالحت" دوسرے نمبر پر "بلک ناٹنگ" "خون ٹیکو" بچھا، آئیے، بے یمن درج موت کا کھر، روحوں کا مسکن یہ سب کہانیاں بھی Best تھیں۔ آخر میں سب ڈر کے پڑنے اور کھنے والوں کے لئے بہت ہی دعا میں اور ڈر کے لئے بھی دل سے دعا، وڈا بجست دن رات ترقی کی منازل طے کرے۔ آمین۔

☆ ☆ گفتگو صاحب: فوادش نامہ پڑھ کر خوش ہوئی، کہانوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خط لکھنے کے لئے پتہ لکھیں۔ آج کل معروف زمانہ سب ہیں، وقت ملتا نہیں بلکہ اکثر وقت نکالا جا تا ہے، کیوں ٹھیک ہے ناں۔

اقصىٰ رباب فیصل آباد سے، السلام علیکم کا کافی عرصے بعد خط کے ذریعے ڈیڈا انجمن میں مولیت اختیار کر رہی ہوں مگر اس عرصے میں خطوط کی منتقلی بگڑا رہی ہے، ہر ماہ ان تمام لوگوں کا شکر ہے جنہوں نے میری کہانیاں پسند کیں۔ آپ سب کی تعریف میرے لئے بہت قیمتی ہے۔ بہت خوش ہوتی ہے جب خطوط میں انعام دیکھتی ہوں۔ بہت شکر ہے سب کا۔ ابھی تک ”ڈیڈا انجمن“ کے ایک اچھے راسخ کی موت کا دکھ دل میں محسوس ہوتا ہے۔ جنہیں نیکم کی لہروں نے اپنے اندر چھپا لیا۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ سب کے لئے دعا کریں۔ اور سب کی دعاؤں کی طلبگار۔

☆ ☆ انصافی صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ڈرکیمپل میں شمولیت اختیار کی اور امید واثق ہے کہ آئندہ بھی خطابچ کر شکر یہ کا موقع دیتی رہیں گی۔

آستروندھاوا کرا گیا ہے، السلام علیکم اپرل کا ڈرڈا بجٹ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ہاتھوں میں آیا۔ چاہے کردی خوشی ہوئی، میری ناقص شروع سے آخر تک کی تمام تحریک اپنی مثال آپ ہیں کسی ایک کی تعریف حق تعالیٰ ہوگی کیونکہ تمام رائے نے اپنی اپنی جگہ خوب سے خوب تر لکھا اور یہ خوشی بھی ڈرڈا بجٹ کی ہے کہ اپنے تمام کارکن کا بھرپور خیال رکھتا ہے اور چھوٹے بڑوں کی پسندیدہ کہانیاں شائع کرتا ہے، ویڈیوز ڈرڈا بجٹ، میں ایک کہانی ارسال کر رہی ہوں اور امید ہے کہ شکر یہ کاموقع تک پہنچے۔ ڈرڈا بجٹ حیرت رقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆ ☆ ☆ آستر صاحب: خطہ غلطی: کہانوں اور رازوں کی تعریف کے لئے ویری ویری ٹھیکس، آپ کی کہانی بہت ہی چھوٹی ہے، کہانی کے صفحات کچھ اور بڑھائیں اور تمام تحریر پر دو بار قلم گھما کر آخری کو بے نگار کر دیتا ہے امید ہے خود نرمانا میں ملے گی۔

صدف حسین: کراچی، السلام علیکم، امید کرتی ہوں ڈرامہ پورا انشاف خوش درختم ہوگا۔ دو مہینے کے بعد ڈرامہ کی محفل میں حاضر

جوہری ہوں، اس کی تیز مصروفیت رہی، اس کے باوجود رکھ رکھاؤ ضرور کیا اور کوئی کہانی، آرٹیکلز، خطوط، قرآن کی باتیں، توس و قزح اور غزل غرض کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ سب سے پہلے میں ضروری کے شمار کے لیے بات کروں گی۔ قسط دار کہانیوں کو بنا کر (کنیکٹوہ) جوہری ہی زبردست ہیں) فرسٹ نمبر پر ”غلاء سے دہائی“ سیکینڈ پر ”شیطان کا پوڑی“ اور تھرڈ پر ”کلون“ تھی، ان راسخ حشرات کو بہت بہت مبارکباد ہوئی۔ اب آتے ہیں مارچ کے شمارے پر تو ناٹک کی بات کروں گی، پچھلے مہینے ہی زبردست تھا اس کے برعکس اس ماہ کا بالکل بھی انجمن نہیں تھا۔ خطوط کی محفل میں سب دوستوں سے ملاقات ہوئی، بہت اچھا لگا۔ قادیہ، نسیم، اسرارہ، نوشین، غلام نجی توری، احسان عمر، ایس اتیاز احمد، شرف الدین جلالی ان مبارک رمضان کو میرا بہت سلام۔ آرٹیکلز بہت زبردست تھے۔ اشعار کی محفل میں ”محمد اسحاق، انجم، حکیم خان حکیم، غلام نجی توری، انشاں رمضان، فریہ، خانم، وادہ نیکنوی اور بتیس خان کی شاعری بہت زبردست تھی۔ کہانیوں میں پہلے نمبر پر ”پاکل جنتی“ چہند آئی عمران قریشی میرے Favourite راسخ ہیں۔ دوسرے نمبر پر ”دستچھ ہاؤس“ اور ”بدعا“ تیسرے نمبر پر ”خون جگر“ اچھی لگی۔ کہانی ”بدعا“ کے جو راسخ ہیں راجہ جدر سنگھ بیدی بہت اچھے اور بڑے راسخ ہیں۔ دوسری کہانیوں میں ”موت کا گھر فرار، بے چمن روح، نئی کوشی اور بدردو خان کا مسکن“ اچھی لگیں۔ ”سیب“ اچھی نہیں تھی۔ قسط دار کہانیوں میں رولکو ہراہ کی طرح بیسٹ آف دی ملٹیپل رہی۔ ”سنہری تابوت“، ”گھر تھی“، ”بلیک ہائیگر“ کو اب چلے جانا چاہئے۔ آخر میں سب کے لئے دُعا میری دعا تھیں اور سلام۔ اللہ حافظ۔

☆☆ صدف صاحبہ: بڑی خوشی کی بات ہے کہ حسب وعدہ آپ آئندہ اپنی مصروفیات سے ڈر کے لئے آدھا گھنٹہ کھینے کے لئے نکال لیا کریں گی۔ قطعی ناگوسے کہاںوں کی تعریف اور آئندہ بھی شکر یہ کاموں دینے کے لئے شکر یہ قبول کریں۔

اسماوہ نوشہین فیمل آباد ہے، السلام علیکم، اپر کی کاڈ پر پڑھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا، میری نئی کہانی اور کتاب ارسال خدمت ہے، امید ہے پسند آئے گی، بہت ساری دعا میں اور سلام، بتییس خان، شرف الدین جیلانی، ایس حبیب خان، فائزہ رحمن، شگفتہ حسین، عائشہ ارمان، زاہدہ عطا محمد، فارہ تبسم، ظلم نبی نور، صدف حسین، محمد علی چشتی، محمد اسلم غازی، راجہ باسط مظہر، محمد وارث آصف، ایس اتیاز احمد، رحمن غنی، قدیر رانا اور ڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام راسٹر ڈاور پڑھنے والوں کے لئے اور بہت سارا پیار کا شکریہ ادا کرتا ہوں، بوجہ ساجدہ راجہ اور فیملی رباب کے لئے اور فیملی رباب کے لئے Advance Happy Birthday کا میج۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں۔

☆ اسرارِ صلاح: کئی ماہ بعد آپ کی کہانی موصول ہوئی، بہت بہت شکر یہ اور اب امید کرتے ہیں کہ طویل قیرحاضری کے متعلق غور فرمائیں گی اور شکر یہ کا سونے خرویدیں گی۔ ادارہ اور تمام قارئین کی طرف سے بھی افسوس اور بابِ صلاح کو سراگرہ مبارک ہو۔

فساد بہ تبسم نصیبک سوزِ غمور ہے، آداب! اور کے تمام قارئین کا سٹمز، اسٹاف اور تمام عملے کی بری طرف سے سلام، اپریل 2013 کے شمارے سے جلد ہی ملاقات ہوئی، سرد درخت نہایت شاعرانہ جلدی سے خطوط دیکھے، اپنا خط پڑھا کر خوش ہوئی، بلقیس خان کا شکریہ ادا کیا، دیگر خطوط میں غلام فی نور، نورین اعظم، ساجد و راجا، ساحل و دعا بخاری، شفیق علی اور مریم ماہ منیر کے خطوط محبت بھرے انداز میں پیش تھے۔ کہانیاں میں رولو کا میسٹ آف تھقی تھی۔ سنہری تالیف اور بلیک ٹائیگر بھی اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ ناگ مٹی، راج لاوی، بانو الفطر، مسکن اور سہراں اور جاتی و نیال میں ہول کرنے والی تھیں، افشاں رمضان، انوری، اقصیٰ رباب اور نوشین خان جلیز و اہس آئیں، آپ کا انتظار ہے۔ قوس قزح میں اقصیٰ رباب و غلام فی نور، انوری و رمضان، نوشین خان، شرف الدین جیلانی اور مریم ماہ منیر کے کلام اچھے دل موہ لینے والے تھے، بھائی غلام فی نور کی صاحب میں نے آپ کی و فلم کتاب خرید کر پڑھی، واقعی میں انتہائی دل افروز تھی، اللہ آپ کے قلم میں حیرت انگیز پیدا کرے۔ آمین۔

☆ ☆ ☆ فارغی صاحبہ: تیس لاکھ کے ساتھ خدا گفتے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکر ہے، اور ڈائجسٹ سے آپ کی لگن واقعی قابل دید ہے، امید ہے ہر ماہ اس لاکھ کے ساتھ شکر ہے کاموں کی پتلی رہیں گی۔

ساحل دعا بخاری بصیر پورا کا ڈھوہ آپ کا ارسال کرو تو از نامہ بابت کہانی ”درویش“ ملاحظہ اور اس کے جواب میں لکھا گیا تھا کہ آپ کی کہانی مہمبول نہیں ہوئی، جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں، واصل ہر کہانی رجنر میں انٹری ہوتی ہے اور جو صاحب انٹری کرتے ہیں ان سے آپ کی کہانی انٹری ہونے سے رہ گئی۔ اور آپ کے خط کے تحت شاعران کی بھی ضمانت چیک ہوئی اور تلاش

کرنے پر آپ کی کہانی موجودگی۔ یقیناً آپ کو دلی دکھ پہنچا ہو گا اس کے لئے ہم ایک مرتبہ پھر حضرت کے لئے ہیں۔ آپ کی کہانی اس شہرے میں جلوہ گر ہے اور امید واثق ہے کہ آپ پلیز آ آ سندھ بھی اپنے قلمی لگاؤ سے ہمیں ہونے کا شوق ارسال کرتی رہیں گی۔ امید ہے حضرت قبول کرتے ہوئے شکر ہے کہ موصوفی ضرور دریں کی۔ آپ کے انکل کے لئے ہماری کارکنین کی طرف سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی معذرت فرما کر جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لواحقین کو ہمہ تن میل عطا کرے۔ (آمین)

مریم ماہ منیر لاہور سے، السلام علیکم، ڈورڈا بجٹ کے اسٹاف اور قارئین کی خدمت کی امید ہے ایک مرتبہ پھر سے ڈورڈا بجٹ کی محفل میں حاضر ہوں، پھر وہ شب کی مصروفیت کی وجہ سے کچھ عرصہ ڈورڈا بجٹ نہ پڑ سکے۔ فردری سے دوبارہ سلسلہ جڑا تو رسالہ ٹائل سمیت ہر اعتبار سے مفرد ہے۔ ابھی کہانوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں مل سکی لیکن مستقل سلسلے ہاتھوں میں آتے ہی پڑھ ڈالے۔ میری شاعری کی اشاعت پر شکر ہے۔ قوس قزح میں فائزہ، نقب شیر، احسان عمر، مونا جاوید کے اشعار قابل تحسین تھے صر غزل میں انقش رباب، احسان عمر، نقدیر، اکاکام قابل تحسین اور مٹا کرنگ لگا۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ ماہ کے لئے اجازت دیجئے۔

☆ ☆ مریم صاحبہ: مریم صاحبہ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریں، چلے دوبارہ پڑھنے کا سلسلہ جڑا ہے تو اب قوی امید ہے کہ ہر ماہ اپنی مصروفیات سے نمودار وقت نکال کر خط ضرور لکھیں گی۔

سکانتات بلوچ کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں ڈورڈا اسٹاف خیر عافیت سے ہوگا۔ 27 فردری کو ذر موصول ہوا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، پائل پیج بہت ہی زبردست تھا۔ پچھلے مہینے غیر حاضر رہی کیونکہ کچھ پرائمل پل رہی تھیں خیر کہانیاں میں نے پڑھیں، بہت ہی زبردست تھیں۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں تو ایمان تازہ ہو گیا۔ خطوط کی محفل میں سب کے خطوط پڑھے تو اپنی کئی محسوس ہو رہی تھی۔ کہانوں کے بارے میں کہنا چاہوں گی تو سب کہانیاں زبردست تھیں۔ فرسٹ نمبر پر پائل پیج تھی۔ جس نے سب کہانوں کا رنگ بڑھادیا۔ دوسری کہانوں میں "نیدو" کا نسخہ، اڈاس، خون جگر فرار اور نیکی کوئی زبردست لکھیں۔ قسط دار کہانوں میں ردو کا بیٹ، بلیک ٹائیگر، موداد، سنہری تاجوٹ اچھی تھیں۔ آخر میں ڈر کے لئے ڈیروں دعا تھیں کہ ڈیر نیکی ترقی کرتا رہے۔ آمین۔

☆ ☆ کائنات صاحبہ: خلوص نامہ ارسال کرنے کے لئے بہت شکر ہے۔ امید ہے کہ آپ حسب وعدہ خطوط کی محفل سے غیر حاضر نہیں ہوں گی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنی پسندیدہ گی کا اظہار ضرور کریں گی۔ Thanks۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم، ڈورڈا بجٹ 23 مارچ کو مل گیا، ٹائل جاذب نظر تھا جو کہ دل کو لگا۔ اس بار ڈورڈا بجٹ کا بڑی شدت سے انتظار کیا تھا۔ ہمیں اکیس لکھیں تھا کہ ڈر ہماری سالگرہ کا تحفہ دے گا اور اس میں ہماری کہانی ضرور شامل اشاعت ہوگی، ہم نے اپنی کالج فرینڈز کو بھی بتایا تھا ڈر اس بار ہمارے لئے یادگار ہوگا۔ مگر جی کیا کہیے۔ بس ذل نوٹ گیا، جب اپنا خط پڑھا تو ڈی آس و امید بن گئی۔ ایک بار پھر وعدہ سامنے آیا کہ آئندہ ماہ اب پھر ایک جان لیوا انتظار، خیر اس ماہ زبردست خطا شک، آمیزش، پیارا اور راج دلاری جو کہ خوب صورت لگی۔ ڈر میں پیاری کہانی ڈائری رہی۔ باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ سب دوستوں کو سلام۔ اللہ سائل دعا کے انکل کو جنت میں جگہ دیں اور حاضر ملک کی مافی کو بھی، باقی ہمارے انگریز حاضر شروع ہونے والے ہیں۔ شاید اگلے ماہ شامل نہ ہو سکیں امید ہے کہانی ضرور شامل اشاعت کریں گے۔

☆ ☆ بلقیس صاحبہ: آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی۔ اس شمارے میں عثمان غنی کی کہانی شامل اشاعت ہے اور اب اگلے ماہ آپ کی دلی ضرور جلوہ گر ہوگی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحانات میں، حسب خواہش نبروں سے کامیاب کرے، آئندہ ماہ بھی آپ کے نوآباد نامہ کائنات سے انتظار رہے گا۔ دیے بھی ایک خط لکھنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟

پونسز ایم اے بنوں سے، السلام علیکم، اس وقت ڈر میرے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائل خوب صورت ہے۔ دیے کو میری ڈر سے جان پہچان 2010ء سے ہوئی۔ کیونکہ ڈورڈا بجٹ مجھے میرے گھر سے ہی ملا، بہت پرانا تھا۔ شاید 2004ء کا تھا۔ ابھی انہیں کس ماہ کا تھا اور ڈر اونی کہانوں سے تو مجھے عشق ہے۔ اس لئے پڑھنے چاہیے۔ ایک بار پڑھا تو دیوانی ہو گئی۔ ڈر کی صرف ایک تھیں دھوڑنے سے مجھے 2002ء سے لے کر 2008ء تک کے ٹکڑے مل گئے۔ اور پھر ایک بھی چھوڑ آئیں، میں نے تمام شمارے پڑھ ڈالے، ہاں قسط دار کہانی نہیں پڑھ سکی۔ کیونکہ کچھ شمارے غائب تھے میں نہیں جانتی کہ یہ سب کس نے خریدے تھے اور اسے کون پڑھتا تھا۔ لیکن مجھے صرف اپنے Read کرنے سے غرض تھا کیونکہ مجھے ہرے مطلب کی چیز مل گئی تھی اور جی بات تو یہ ہے کہ میں ڈر کی فیمن بن گئی ہوں۔ مئی 2012ء کا ڈر میں

نے خود لیا۔ آج تک کسی یوتیوب لکھا، ساج پکلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں، پلیز شامل کریں ورنہ جی میں ناراض ہو جاؤں گی۔

☆ ☆ فرسز صاحبہ: ڈورڈا بجٹ میں موسم و ملگم، دلی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے دیری دیری شکریں، آپ کے قلمی لگاؤ کا آئندہ ماہ بھی انتظار رہے گا۔

فائزہ رحمن سالارنگ سے، ڈورڈا تمام اسٹاف اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔ سنہری تاجوٹ اور ردو کا اچھی جاری ہیں۔ باقی کہانیوں میں قوم جنت، کشمیر جزیرہ اور پائل پیج اچھی لکھیں۔ آپ کو پہلے ایک کہانی سنہری تاجوٹ بھیج کر شاید آپ کی ردی کی نوکری میں زیادہ دلچسپی ہے۔ اب ایک اور تجربہ بھیج رہی ہوں ممکن ہے جگہ بنانے کی۔ اسے پڑھنے کا ضرور مجھے یقین ہے آپ کی امیدوں پر پورا اترے گی، اگر ان دونوں میں سے کوئی شائع ہوگی تو آگے کا سوچوں گی۔ باقی تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام اور ہماری دعا میں ڈر کے ساتھ ہیں۔ اللہ ڈر کو دن چوکی اور رات آٹھ بجے کی ترقی عطا کرے۔ رائٹرز جیاد کواد بلقیس کو خصوصی سلام اللہ حافظ، اس کے علاوہ شرف الدین جیلانی کو Best of luck کہوں گی۔ میٹرک سٹل سے اتنی اچھی تحریریں Very Good۔

☆ ☆ فائزہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکر ہے، اچھی امید رکھیں آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی اور ضرور ہوگی آپ کو یہ بھی بتانا چلوں کہ ہم نے ردی کی نوکری باہر پیچک دی ہے، کافی عرصہ پہلے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کائنات سے انتظار رہے گا۔

صبا محمد اسلم گیزر اتوالہ سے، خیریت کے بعد عافیت کی طالب، امید ہے کہ تمام قارئین اور رائے پھر خیریت سے ہوں گے۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے (آمین) کافی عرصہ غیر حاضری کے لئے معذرت چاہتی ہوں لیکن اس عرصے میں، میں نے بے نوٹ کیا ہے کہ مجھے کسی نے بھی کس نہیں کیا۔ ڈورڈا بجٹ تو میں نے باقاعدگی سے پڑھا ہے۔ میں غیر موجودگی کی وجہ چاک میرے چھوٹے بھائی سیف الرحمن کی ناک کا آپریشن ہوا تھا۔ اچانک لاہور میں 15 دن ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہنا پڑا پھر کچھ گھریلے مصروفیات اور پھر میری کزن کی شادی تھی جس کی تیاری میں اور پھر شادی میں اتنی لٹ ہو گئی۔ اب ایک غزل اور شعر بھیج رہی ہوں امید ہے پھر سے میری حوصلہ افزائی کریں گے اور میرے والد صاحب کے لئے خصوصی دعا کیجئے گا ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور میری چچی کے لئے بھی دعا کیجئے ان کی بھی طبیعت بہت خراب ہے۔ سب قارئین کو میری طرف سے سلام قبول ہو۔

☆ ☆ صاحبہ: ڈورڈا بجٹ میں خوش آمدید، ہماری اور تمام قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد اور چچی صاحبہ کو کلی صحت عطا کرتے اور آپ کے تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم کرے (آمین) امید ہے اب آئندہ ماہ بھی مصروفیات سے چند منٹ ہم لوگوں کے لئے نکال کر خط ضرور ارسال کر دیا کریں گی۔

ایمن امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم، امید ہے حراج گراہی خیر ہوگا، ماہ رواں کا شمار اپنی تمام تر حشر سامانوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے، دفتر بے ٹائل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے، اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ آرٹیکلز آپ کے پاس ہیں، پلیز دیکھئے گا۔ حریہ Ad میٹرز میں۔ خون کی پیاس، مراسلہ غزل ارسال خدمت ہے۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈورڈا بجٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دیو دیو زکو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆ ☆ امتیاز صاحبہ: اور سائیں حراج خیر اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام قارئین کرام کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، اور جائز خوشیوں سے تواڑے۔ (آمین) پھر میں گئے۔ اللہ حافظ۔

شریف الدین جبیلانی غنڈ والیہ سے، کائنات کی قدرتی روٹنی میں رسالہ دیکش سروٹ کے ساتھ ہم سب ساتھیوں کے ہاتھوں میں ہوگا، مستقل کہانوں میں مست ہوں گے۔ جی ہاں ہم احسان عمر کے ہم خیال ہیں، ڈر میں کچھ بنا لکھیں جو آج تک بہت کم لکھا گیا ہو جس میں حقیقت کی جھلک ہو، جس میں ڈر خوف، جاسوسی سپینس ہی سپینس ہو مگر ڈر میں محبت کے موضوع پر لکھنا اصل مفہوم ختم کرنے کے برابر ہوگا۔ جی ہاں ہم سب ساتھی بلقیس خان صاحبہ کی سالگرہ کی خوشی میں شریک ہیں۔ مئی میں پشاور سے نکلے ہوئے بھی تاحیات دعائیں ارسال کرتے جائیں گے۔ "عالم ملک کی مافی صاحبہ کا انوس" ہے کہ اللہ کی رضا قیامت تک یہ سلسلہ چلا رہے گا۔ جنت میں اعلیٰ مقام کے لئے دعائیں۔۔۔ رائٹرز صاحبان سے گزارش ہے کہ ڈر میں نیا سے نیا پین لکھنے کی کوشش کریں۔ ڈر میں شرکت کرنے والے ساتھیوں کو دعا میں اور سلام۔ ہمیں بھی دعا میں یاد رکھیں۔ بشکریہ والسلام۔۔۔

☆ شرف الدین صاحب: آپ کا قلمی خلوص نامہ پڑھ کر دل خوش ہوئی ہے اور آپ کی جاہت ڈروڈائجسٹ سے قابل دید ہے۔ ہماری اردو قارئین کی دعا میں آپ کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

☆ اسحاق انجم: کلنگ پور سے، السلام علیکم، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے! ہمارا ڈروڈائجسٹ شمارہ اپریل 2013ء ملا، خوب صورت ٹائٹل اور وہ بھی رولو کا والی حسینہ کا لکھا دیا۔ قسط وار تحریریں بہت اچھی جاری ہیں اور دیگر تحریریں بھی خوبصورتی کے ساتھ تحریر کی گئی ہیں جو کہ بہت خوب ہیں! شہباز غزل میں غلام نبی فوری اور فارغیہ تبسم صاحبہ نے ایک میری غزل اور ایک مسکن فاطمہ کی غزل، غزلوں کو تھوڑی سی ترمیم کر کے آپ کو بھیج دیں جو کہ آپ نے اپریل 13 کے شمارے میں شامل اشاعت بھی کر دی ہے! جبکہ یہ دونوں تحریریں ڈروڈائجسٹ کے چارے شماروں میں شامل اشاعت ہیں! یہ دونوں افراد میرے ہی علاقے کے ہیں۔۔۔ اب کیا شکوہ ان سے "انتخاب لکھ دیجئے۔" "چلو کوئی گل نہیں۔"

☆ اسحاق صاحب: آپ کی بات بالکل درست ہے غزل یا اشعار ارسال کرتے وقت اکثر قارئین نہ جانے کیوں انتخاب لکھتے بھول جاتے ہیں، خیر آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ آئندہ ہر قلمی خلوص نامہ ارسال کرنا بھولیں گے نہیں۔

☆ غلام نبی فوری: کٹھیاں خاص سے، ڈر کے تمام قارئین، راکشز حضرات اور دیگر اشاعت کو دل کی اتھام گہرائیوں سے سلام و محبت پیش کرتا ہوں، ڈر کا شمارہ اپریل 2013ء بہت لیٹ موصول ہوا، دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، غلطی کی محفل میں آئے تو ناخظانہ دیکھ کر خوش ہوئی، شکریہ۔ دیری گزشتہ کہانیوں میں سب سے پہلے رولو کا پڑھی، سپر ہٹ تھی، اس کے بعد بلیک ہائیڈرکس، سنہری تالوت، معاشیہ وارحی، باوق الفطرت خوب صورت تھی، جنائی و نیاؤز کے اچھے لیڈ تھے۔ مہمان بہت ہار تھی۔ ناگ منی، مسکن، خاموش موت، خونی اسپتال، خون گل اور لولکھا شیک نہیں تھیں۔ قوس قزح میں تمام شاعروں نے اچھا لکھا۔ آخر میں مجھے اجازت دیں۔ لیکن یہ بتا دیں کہ میری کہانی یا نام خوفناک دینا تک سب شائع ہوگی۔

☆ غلام نبی صاحب: خوش ہو جائیے آپ کی خوفناک دنیا، نیا نام موت کی تختی جلوہ گر ہوگئی ہے، آئندہ ماہ بھی انتظار رہے گا۔

☆ محمد علی چغتائی: خیر پڑتا سیالی سے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! پیچھے دو ڈبوں سے ڈر کی محفل سے دور رہا اور مجبور بہادہ اس لئے کہ ایک تو ٹیٹ تھے دوسرا یہ قلمی میں جا پانچ شادیاں اکٹھی ہر پانچو گئی تھیں، جن کی وجہ سے ڈر کی محفل میں شرکت نہ کر سکا۔ بہر حال اب فری ہوا ہوں اور فوری، مارچ، اپریل، تینوں شمارے اکٹھے خرید لیا ہوں اور پڑھ رہا ہوں، کیونکہ ڈر پڑھنے کے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔ حسب دستور معمول سب سے پہلے رولو کا اور سنہری تالوت پڑھی جو کہ توقع کے تین طاقتور سپر ہٹ تھی اور بلیک ہائیڈر بالکل ہی اچھی ہوگئی ہے اور ہاں آپ سے ایک شکوہ ہے وہ یہ کہ ایک Funy Poetry ارسال کی تھی اور ارسال کرنے کی Hope جس طرح کبھی ہے اسی طرح شائع ہوگئی۔ ایک ریکویسٹ کرنی تھی اور وہ یہ کہ آپ رولو کا کے صفحات پر بھادیں جب کہانی کا خلف آئے لکھا ہے تو کہانی ختم اور اس کے بعد انتظار؟؟؟ اگلی قسط کا جو کم از کم مجھ سے تو ہفتیں پانچ پانچ روزہ میری یہ ریکویسٹ ضرور مان لیں اور ہاں سپر قریب ہیں پلیز دعا کریں۔

☆ محمد علی صاحب: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مجبوریاں دور کرے اور خوشیوں سے نوازے۔ چلیے آپ کی خواہش پر آئندہ رولو کا کے صفحات اور بھادیں گے۔ غزل شامل اشاعت ہے، آپ سے بھی ریکویسٹ ہے کہ آئندہ بھی خلوص نامہ ارسال کر دیا کریں۔ اور آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیاب و کامران کرے۔

☆ عثمان غنی: پشاور سے، السلام علیکم! ہمارا ڈروڈائجسٹ ماہ اپریل کا شمارہ 22 مارچ کو مل گیا۔ بالکل ماہ اپریل 2013ء کا جاؤب نظر تھا۔ خوب صورت حسینہ ماہ جن پر فخر حسن کے ساتھ ڈر کے سردار قیام پر جلوہ افروز تھی۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے، جو کہ بہت اچھے لگے، سائل دعا بخاری کا خط پڑھا کہ کیا کہیے ان کے الفاظ ہمارے لئے ہی ہوں۔ ہم بھی ہر مینے بڑی آس و امید کے ساتھ ادارے کو اپنے آرٹیکلز، اسٹوری، اینڈ Poetry سیکر کرتے ہیں۔ مگر ہر بار آس بے باس کر دیتی ہے۔ واقعی ہم بھی اب رنر وقت، اس ہی وجہ سے اور انگل کی بکت کی وجہ سے اپنی شاعرانہ تحریر بھیج رہے ہیں۔ بہر حال سائل دعا بخین اللہ آپ کے انگل کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ کہانیوں میں ڈائری، شعبہ شیرازی کی لا جواب تحریر تھی۔ خاموش موت، اچھی لگی، جنائی و نیاؤز، رولو کا کی طرح تھی۔ رولو کا نے مزہ دیا لایا۔ خوب صورت نے سنے انداز میں خود کو سنایا۔ انوکھا کس واقعی خوب صورت تحریر رہی، خونی عمل نے متاثر کیا جبکہ اس ماہ

کی خبریں تحریر راجہ دلاری رہی، میرہ فاطمہ کی مہمان نے بھی ستار کیا۔ سنہری تالوت اچھی رہی۔ بلیک ہائیڈر گزارہ چالی گئی۔ باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ قوس قزح، نا تب، بشیر کی غزل اچھی لگی جبکہ غزلوں میں فارغیہ تبسم نے اچھی کوشش کی۔ نکلوس میں بلیس خان اور مریم ہاشم نے زبردست انداز میں دل سوا لئے، باقی ڈر کو خداوند نگہی رات چوگئی تری دے۔ آئین۔

☆ عثمان صاحب: خوش ہو جائیے۔ آپ کی کہانی "موت کی مسکراہٹ" شامل اشاعت ہے اور بخور اس کہانی کا جائزہ لیجئے گا کہ کہانی میں کتنا اثر چڑھاؤ آیا ہے۔ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ عمل کا بخور جائزہ لیا جائے ایک گلاس میں کبھی بکھار یا پھر بورڈ کے امتحان میں کی ہزار طالب امتحان دیتے ہیں مگر فرسٹ ایک ہی طالب علم آتا ہے۔ امید ہے آئندہ ماہ کا بھی خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دینا بھولیں گے نہیں۔

☆ قندیلہ وانا راولپنڈی سے، آداب۔ آپ کی خیریت کا طالب ہوں، اپریل کا ڈروڈائجسٹ پڑھ کر دل خوشی ہوئی، دو غزلیں ارسال ہیں۔ معیار ہونے کی صورت میں کسی بھی اشاعت میں جگہ دے کر منکھور فرمائیں۔

☆ تقدیر صاحب: آپ کی معیاری غزلیں شامل اشاعت ہیں، ہر ماہ نیک تنادوں کے ساتھ ڈر میں شمولیت کے لئے دیری دیری تھینکس۔

☆ جاوید اسلم فیصل آباد سے، السلام علیکم سب کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، ضروری کام کے سلسلے میں شہر چھوڑا، واپسی پر بیکٹال پر آقا تو ڈروڈائجسٹ ماہ اپریل 2013ء کے تازہ پرچہ سے ملاقات ہوئی سردی بہت اچھا لگا اس بار پرچہ کچھ لیٹ ہو گیا اور ہر ماہ کی مقررہ تاریخ کو ہی مل جاتا تھا۔ یہ ایک معیاری جزیہ ہے۔ ایسا خوبصورت پرچہ اس مہنگائی کے دور میں نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ خطوط میں یاد آوری اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بڑے خوب صورت ہیں مثلاً خطوط، قرآن کی باتیں، قوس قزح، غزلیں وغیرہ اس بار ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی دے ڈروڈائجسٹ کامیاب تحریروں کا حسین اور دلکش پھولوں سے مہکنا ہوا لکھتہ ہے آپ کا خلوص اور دعا میں ہی ہمارے لئے کافی ہیں۔ اس بار شہر کے چکر پرچے کے بارے میں لگا لگا کے میں تھک گیا تھا۔ تمام لکھاروں کو ان کی کہانیوں پر میری طرف سے مبارکباد دیتا۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں، کسی قرعہ شاعرے میں جگہ دے دیں، بشرط آپ کا تعاون رہے، موسم آہستہ آہستہ بدل ہی گیا مگر ملک کے معاشی حالات نہیں بدلے ہر طرف کوڈشید تک ہے اور ہر چہرہ پریشان دکھائی دیتا ہے۔

☆ جاوید صاحب: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی خواہش اور سکھ شائق کے پیش حالات اور موسم میں تغیر لاتا ہے مگر ہمارے ملک کے کرتا دھرتا لوگ اپنے حال میں مست ہیں۔ بڑے بڑے گوانی پڑی ہے، بڑوں کو اپنی ضرورتوں اور مستقبل کی فکر ہے، بدل عوام کی کوئی فکر نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ انجام گلستان کیا ہوگا۔ بس ہم اور آپ اللہ سے صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔

☆ محسن علی: جنت ساہوال سے، جناب میری کہانی بے قیاد لوگ کی اشاعت کا انتظار رہے گا۔ جبکہ میری دوسری کہانی جس کا نام دیہاڑ کی بخت اور دنیا میں کیا رائے ہے آپ کی! کہانی کے متعلق جواب کا انتظار رہے گا۔ ڈر اپریل 2013ء کا شمارہ جب مجھے ملا تب بارش ہو رہی تھی، وقت قحطی سے پاس پورا ہی ایک مرتبہ پڑھ لیا۔ بہت اچھی تھی مگر کچھ آئی کچھ نہیں، مجھے اس کا End اچھا لگا۔ خاموش موت اچھی تھی۔ رولو کا دیری گزشتہ خوب صورت بھی اچھی لگی، خونی عمل قابل تعریف ہے، خونی اسپتال نا تب، شیر تو برادر اس دنیا میں میسا کر دے دیا مگر مجھے، سنہری تالوت تو میری۔ مہمان اچھی کہانی تھی۔ بلیک ہائیڈر سوکھی قوس قزح میں گیتوں کا کلام اچھا لگا۔ تمام شعرا نے اچھا لکھا۔

☆ محسن صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس، اپنے وقت مقررہ پر آپ کی کہانی بھی ضرور شائع ہوگی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔ Thanks۔

☆ نوٹ: اکثر غزل اور اشعار کے شوقین حضرات کے متعلق شکایت آتی ہے کہ کسی اور کی غزل پر اپنا نام لکھ بھیجتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے، اگر انتخاب لکھ دیا جائے تو کوئی عزت خراب ہو جائے گی۔ اپریل کے شمارے میں "عصمت" اقبال، سنگاؤدیم کی ایک غزل پر ایک صاحب نے اپنا تخلص لکھ کر چھپواپی ہے، جو کہ سراسر غلط ہے۔ امید ہے آئندہ ان باتوں کا شوقین حضرات خیال رکھیں گے اور انتخاب کی جگہ انتخاب ضرور لکھا کریں گے۔ شکریہ۔

ساحل و ماہیخاری - دیہ پاپور - سیالکوٹ

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا قبر میں مردے کا کفن کھلتے ہی جھٹ
مردے کا وجود ہوا میں معلق ہوا اور وہ قبر کے باہر موجود
تھا اس کی قہر برساتی چنگاریوں سے بھری ہوئی آنکھیں اپنے
سامنے وجود پر مرکوز ہو گئیں اور پھر.....

سب رفتاری سے دل و دماغ کو درد کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی ایک شاہکار کہانی

چھوٹے زبرد کے لب کی روشنی میں وہ خواب خرگوش میں
گم تھیں میں مطمئن ہو کر سامان اٹھاتا ہر نکل گیا۔

میرے قدم کھیتوں کے بیچ بنی پگڈنڈیوں
کو تیزی سے روند رہے تھے قریب دس منٹ بعد میں
قبرستان میں پہنچ گیا۔ قبرستان کا شگت دروازہ ہلکا دھکیلنے
پر زبردست چڑچاہٹ سے کھلا چلا گیا خوف کسی گھات
لگائے بیٹھے روندے کی طرح مجھ پر ایک دم جھٹ
کر حملہ آور ہوا۔ میں نے سر جھٹک کر قدم آگے
بڑھادیے تاریکی میں قبروں کے کتبے عجیب و غریب
بلاؤں سے مشابہ معلوم ہو رہے تھے میں قبروں کے
بیچوں بیچ چلا جا بجا اکی تھانوں سے دامن پھاننا
مطلوبہ قبر تک پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر میری وہی حالت ہوئی جو ہمیشہ
ہوتی تھی۔ ایک گہری اداس اور پرانیت میرے دل
میں ہی نہیں روم روم میں گزرتی۔ سارے کا نازک سراپا
میری آنکھوں میں ٹھیکیں پانی بھر گیا، ہوا کے ایک زوردار
جھکڑے ماضی کے کواڑ اٹھ گئے اور میرا ذہن ماضی کی
بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔

☆.....☆.....☆

میں اماں کے پاس رہتا تھا۔ بابا نے انہیں

رات کی سیاہ چادر شام کے لگنے اندھیرے
کو پوری طرح ڈھانپ چکی تھی، دوسویں کے چاند کو سیاہ
ماں سر مٹی بادل اپنے شکنجے میں بکڑے ہوئے تھے۔
اکا دکا ستارے سیاہ بادلوں کے عقب سے جھانکتے
تو ایسا لگتا گویا جلتے جھلکارے ہیں۔ پورا گاؤں تیندکی
مسور کن وادیوں میں گم تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے
ایسے دور تھی جیسے اُفق پر چاند، زمین سے دور تھا۔ بے
چینی میری رگ رگ میں چنگیاں بھر رہی تھی، نیرس
پر ادھر سے ادھر پھر لگاتے میری ٹانگیں شل ہونے لگی
تھیں۔ تاہم میں چاہ کر بھی ایک جگہ تک کرنہ بیٹھ سکتا
تھا۔ کراہٹ میری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ
گردش کر رہا تھا، میں اضطرابی انداز میں ہاتھ میں
موجود سیل فون پر گاہے بگاہے ٹائم دیکھ رہا تھا اور وقت
کے پر جیسے کسی ادراکی قوت نے پل ڈالے تھے۔

ایک ایک لمحہ کچھو سے کی سی رفتاری سے رینگ
رینگ کر گزر رہا تھا، جونہی دس بجے، میں برقی روکی
مانڈیڑھیاں پھلا لگتا نیچے آرا۔ برآمدے کا بلب روشن
کیا اور اسٹور روم سے اپنا مطلوبہ سامان اٹھا کر بے آہستگی
ستون کے سہارے لٹکایا اور کھٹ بلب بجھا دیا، دے
پاؤں آگے بڑھ کرائی کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔

چھوڑ دیا تھا۔ حادثہ بھائی اور ڈاکٹر باپا کے پاس رہتے تھے۔ میں ان دونوں سے چھوٹا تھا۔ بابا ہر ماہ اچھی خاصی رقم اخراجات کے لئے بھیجتے تھے۔ دای اور بابا نے ہم پر کوئی پابندی نہ لگائی تھی، میں کئی دن باپا کے پاس رہتا ہوں۔ حادثہ بھائی اور ڈاکٹر بھی ہمارے پاس رہتے تھے۔

ستارہ صابر چاچا کی بیٹی تھی، چایا انگلینڈ میں رہتے تھے جبکہ ان کی پوری فیملی یہیں رہتی تھی۔

میں اور ستارہ اچھے دوست تھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے جھگڑتے رہتے مٹاتے یہ دوستی کب محبت میں تبدیل ہوئی، ہم دونوں ہی نہ جان پاتے تھے۔ ہم بس یہ جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسکول سے واپسی پر ہم اکثر جمیل کنارے گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے اور دقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ویسے یہ اچھا وقت ہمیشہ پر لگا کر ڈاکٹر کیوں چلا جاتا ہے؟ لاکھ ٹھکی میں بند کرنے کی کوشش کرو، عقیدہ ہی نہیں ہوتا۔ ایک دن میں نے پوچھا۔

”سای! ایک بات بتاؤ۔“ میں نے جمیل کے شفاف پانی میں کنکر پھینکا، پانی اس قدر شفاف تھا گویا شیشہ بہہ رہا ہو۔ تہہ میں نیلگوں نائل سبز ریشمی گھاس اور چھوٹے بڑے پتھر واضح دکھائی دیتے تھے۔

”پوچھو۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی سبز آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”اگر میں مر گیا تو؟“ میرا لہجہ عجیب تھا۔
”اللہ نہ کرے۔“ وہ لرز اٹھی۔ ”اگر بندے کی شکل اچھی نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لیتی چاہئے۔“ اس کی آنکھیں بالبال پانیوں سے بھر گئیں۔

میں بری طرح ہنسا دیا۔ ”سوری۔“
”جان نکال کے سوری؟“ اس کی سبز آنکھوں میں خفگی کا تاثر تھا۔ ہلکوں سے ٹوٹنے ستارے اب اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔

”پلیز! دیری دیری سوری۔“ میں نے اپنی آنکھوں کی پوروں پر ستارے پڑے۔

”اوکے۔ لیکن آئندہ ایسی کبواس نہیں کرو گے۔“

”اوکے۔“ میں نے جھٹ وعدہ کر لیا، اس کی خفگی برداشت کہاں ہوتی تھی مجھ سے۔ ہم لوگ ابھی دیں تھے کہ اک عجیب واقعہ ہوا، ایک پرندہ ہمارے سامنے تھوڑی دور موجود بڑے سے پتھر پر آ کے بیٹھ گیا۔

اس کے پر ہموارے نائل اور آنکھوں کا رنگ عجیب سا تھا۔ وہ کچھ ٹاپے دیں گھومتا رہا پھر اس نے پر پھڑ پھڑائے اور اڑان بھر کر ہمارے گرد پھرانے لگا۔ وہ برابر دائرے میں پھرا رہا تھا اور اس دائرے کے بیچوں بیچ ایک وحشی سی چلتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی لمبی زرد چونچ اٹھا کر عجیب سی آواز نکالی اور فضا کی وسعتوں میں پرواز کر گیا۔

”یہ کیا تھا راتیل؟“ سای کا سستہ ٹوٹ گیا تھا اس کے پوچھنے پر میں بے اختیار چوٹا۔

”کچھ نہیں پرندہ تھا اور کیا؟“ میں نے اس سے زیادہ خود کو تلی دی تھی ایک عجیب سا احساس مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا دائرے میں وہ وحشی ابھی بھی بدستور چلتی ہوئی تھی۔

☆-----☆-----☆

اگست کا وہ دن اداسی میں پڑھا تھا۔ فضاؤں میں ایک عجیب سی سوغواری کھلی تھی میرا دل اضطراب کے خلیجے میں جکڑا تھا۔ میں ای کویتا کر سای سے ملنے چلا گیا۔ نزہت چچی کو سلام کر کے میں نے سای کے بارے میں پوچھا۔ پچھلے چند دن سے ہماری ملاقات نہ ہوئی تھی ”وہ چھپت پر ہے۔“ راتیل بیٹا! یہ نہیں کیا ہو گیا ہے اسے ہر وقت کھوٹی کھوٹی سی رہتی ہے یکدم ڈرجانی ہے تم پر یہ کرد۔ مجھے تو کچھ بتائی نہیں۔“

میں اثبات میں سر ہلاتا نہ دیتے چڑھ گیا۔ وہ ستون سے ٹیک لگائے تم سم کھڑی تھی یہاں تک کہ اسے میری آمد کی بھی خبر نہ ہوئی۔ ”سای کہاں کھوٹی ہوئی؟“ میں اس کے سامنے جا کر ہاتھ لہرایا۔ وہ چونکی اور ایک لمبی سی چیخ اس کے یا قوتی لبوں سے

برآمد ہوئی۔

”تنت۔۔۔۔۔؟“ وہ ہراساں تھی۔ ”کیا ہوا؟ تم اتنا ڈر کیوں گئیں؟“ تشویش بھرے لہجے میں میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلائی۔ اس کے چہرے پر دریائوں کے سائے تھے گلابی کھلی رنگت مر جھائی لگی تھی جمیل جیسی آنکھوں میں ایک عجیب وحشت ڈیرا ڈال چکی تھی۔

”کیا۔۔۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں سای؟“ میں نے اسے بے قراری سے پوچھ ڈالا۔

وہ بری طرح بکھر گئی اور میرے سینے سے لگ کر بری طرح رونے لگی۔ ”راتیل۔“ میں نے اسے متاع حیات کی طرح پانیوں میں سمیٹ لیا پتھریوں سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ ”سای پلیز! بتاؤ نا کیا ہوا ہے؟“ وہ اپنی مٹھیوں میں میری شرٹ جکڑے بری طرح رو رہی تھی۔ ”سای کی بچی! اب بس بھی کرو کیا جان لوگی میری؟“ اس کے آنسو میری برداشت سے باہر تھے۔

”کچھ نہیں ہوا ہے۔“ ورثی سے بولتی وہ ایک جھپٹکے سے مجھ سے الگ ہوئی ”تم چلے جاؤ یہاں سے۔“ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی مجھے نفرت ہے تم سے۔ سنا تم نے؟“ وہ چلائی تو میں سشدردہ رہ گیا۔

یہ کیا کر رہی تھی وہ؟ مجھ سے نفرت اور سای؟ میں بے نیکی کے دھار میں تھا۔

”ہاں ہاں تم سے نفرت ہے مجھے۔“ وہ ہزبانی انداز میں حلق پھاڑ کر چلا اٹھی۔

میں بے ساختہ نہ کھڑا ہوا۔ قدموں نے میرا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔ ”لیکن۔۔۔۔۔ کیوں؟“ مجھے سانس لینے میں بے حد دشواری ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ سانس طلق سے ٹکرا کر پچھلے پھروں میں بھرتی جا رہی ہے۔ دل ہاتھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا، ہمدردوں میں عجیب سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

”وقت پر تمہیں ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔“ وہ رخ پھیرے کھڑی تھی۔
”ابھی بتاؤ سای!“ مجھے اپنی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”راتیل! میں نے کہا نا تم کو معلوم ہو جائے گا ابھی تم جاؤ۔ تمہیں میری قسم پلیز!“ اس کا نام لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا اور میں کسی ہارے ہوئے جواہر کی مانند پلٹ آیا۔

☆-----☆-----☆

میں جمیل کنارے بیٹھا پانی میں کنکریاں پھینک رہا تھا۔ دل بھجا بھجا سا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا جب وہ اپنی مخصوص جگہ آ کر بیٹھی تھی میں گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا اس کی زرد آنکھوں کی چمک ماند پڑی ہوئی تھی اور گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔

”میں ریزہ سے شادی کر رہی ہوں۔“ وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔

میں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ وہ جمیل کی تہہ میں نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ میرا دایاں ہاتھ پوری قوت سے اس کے گال پر پڑا۔

”کچھ کھو کس سے شادی کر رہی ہو؟“ میرے دھیسے لہجے میں اڑدھیس کی پھنکارتھی۔

ریزہ سے۔ ”اس کی آواز میں کیکپاہٹ تھی۔“

”ریزہ سے؟“ میں سناٹوں کی زد میں تھا۔ سر پہ

آسمان رہا تھا۔ قدموں تلے زمین۔

”مجھے سے وجہ پوچھا۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تمہاری کوئی بھی وضاحت میرے وجود کے ریزے نہیں سمیٹ سکتی کبھی نہیں۔“ مجھے اپنی آواز بے حد اجنبی لگ رہی تھی۔ مجھے پوری دنیا تھی کہ اپنا وجود تک اجنبی لگ رہا تھا۔ ”سای تم۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ

جو مرضی کرلو، میری جان لے لو۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ خدا کے لئے ایسا مت کرو۔“ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا میرا دل پھٹ رہا تھا۔

”تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں؟“ اس نے عجب سے انداز میں پوچھا۔
”تمہیں ابھی تک یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا نہیں؟“ میں نے جی سے ہنسا۔
”مجھے خوش دیکھنا چاہیے ہو؟“
میرا سر اثبات میں ہل گیا۔

”تو پھر میری خوشی اسی میں ہے۔“ وہ سہاٹ انداز میں کہہ کر چلی گئی۔ ہاں وہ چلی گئی۔
شام میں کھلی گاڑی رات کی تاریکیاں میری آنکھوں میں آئیں۔ دل کو کوئی پیروں سے روئے رہا تھا۔
شہر گہرے پتہ پاؤں تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کی شادی 9 ستمبر کو طے پائی تھی۔
ادراگست کے دن تھے وہ، اضطراب میری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا تھا۔ بے چیداں روم روم میں ساتی تھیں اور دل ہر وقت تڑپ کے نتیجے میں جھڑا پڑا تھا۔ جوں جوں اس کی شادی کے دن قریب آرہے تھے میرے اضطراب میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔ ”وہ کسی اور کی ہو جائے گی، اس کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام چڑ جائے گا۔ وہ سر سے پاؤں تک کسی اور کی ملکیت ہوگی وہ اسے دیکھے گا۔ چھوئے گا۔ چار کرے گا۔“ میری جان پل پل ٹھنک رہی تھی میں لمحہ لمحہ مر رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں محبوب کی خوشی ہی ہماری خوشی ہے وہ کسی اور کا ہوا تو کیا ہوا۔ مگر میرے لئے یہ آسان نہ تھا۔ بہت کھن، بے حد جان لیا تھا۔ بھلے اس میں اس کی خوشی تھی مگر میرے لئے بے حد جان لیا تھا، اسے کسی کے ساتھ چوٹا بھی میں پل پل کی اذیت کی سوئی پہ لنگ رہا تھا۔

بالا خر سات ستمبر کا دن آن پہنچا۔ اس دن اس کی اپوں کی رسم تھی۔ میں نے سر شام ہی گولیاں پھانک لیں۔ مگر نیند نہ تو ہمیشہ کے لئے محبت کے حوض گردی رکھی جا چکی تھی چند منٹ کے لئے نیند کا جھونکا آتا تو محبت آنکھ کھل جاتی اس کی باتیں اس

کے وعدے، میرے بغیر نہ رہنے کے دعوے یاد آتے اور دل اذیت سے تڑپ تڑپ جاتا۔ لوگ محبت کے نام پر کسی کے جذبات سے کیوں پھیلے ہیں؟ محض اپنا وقت رنگین بنانے کے لئے، کسی کو سزا کے لئے کرب و اذیت کی بھیٹی میں جھونک دینا کہاں کا انصاف ہے؟ صرف نام پاس کرنے کے لئے کسی کے دل کو ہمیشہ کے لئے بھری آگ میں سلگا کر کہاں کا قانون ہے؟ کتنا آسان ہوتا ہے لوگوں کے لئے کسی کے غلطیوں بھرے جذبات سے ٹھیک پھر پل بھر میں بھول جاتے ہیں وہ۔۔۔۔۔ اور ہم جیسے لوگ سدا کے لئے خود کو روک لگا لیتے ہیں۔ روگ، جو ہمیشہ دل کو پھڑپھڑاتا ہے، روگ میں سوگ کے سوا کچھ نہیں ملتا بھی میں کچھ نہیں ملتا انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے اس سے فرار ممکن نہیں کیونکہ یہ دل کو ہی نہیں، روح کو بھی کسی آنکھوں کی مانند جکڑے رکھتا ہے اور اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔

وہ سارا دن جس کرب کے عالم میں گزارا، ناقابل بیان ہے۔ بعض دفعہ دکھ ایسا شدید ہوتا ہے کہ احاطہ الفاظ میں لانا ناممکن نہیں ہوتا۔ شام ہوتے ہی میری جان ٹٹکنے لگتی تھی اب اس کے ہاتھ پہ اس کے نام کی مہندی لگ رہی ہوگی۔ اب لڑکیاں اسے آجکل کی چھاؤں تلے اسٹینج لاری ہوں گی۔ غرض لمحہ جان لیا تھا۔ اس اذیت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس سے گزرا ہو۔ وہی جان سکتا ہے جس نے یہ کرب جمیلا ہوا میں تڑپ تڑپ کر اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ ”یا تو میرا دل بے حس کر دے، پھر کر دے یا پھر مجھے موت دے دے۔“ لیکن دعا بھی کب قبول ہوتی ہے؟ میں تو۔۔۔۔۔ میں تو پہلے ہی اللہ کی قدرت، اس کے ہر شے پر قادر ہونے، اس کی وحدانیت اس کے قوی ترین ہونے پر قوی یقین رکھتا تھا۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر وہ مجھے کیوں آزار رہا تھا؟ میں تڑپ تڑپ کر سکتے گا۔

اب جو دور ہوا ہے، تو احساس ہوا ہے مجھ کو کہ وہ شخص میرے دل کے قریب کتنا تھا

جو وہ کہتا تھا وہی نکس ابھرتا تھا اس میں میرے دل کا آئینہ بھی عجیب کتنا تھا اس کی آنکھوں میں دھنک رنگ خواب تھے جس کے وہ شخص بھی لوگو! خوش نصیب کتنا تھا شب بھر کئی اپنی تو تارے گنتے اس کے پہلو میں خوش، رقیب کتنا تھا! جب وہ غیر کی ملکیت ہوا، دل پہ اترا تھا سکوت مرگ روح میں جو پھیلا تھا، ساٹا مہیب کتنا تھا ہر دعا ملک سے بے نکل و مرام لوٹ آتی تھی دعا نصیب بھی اپنا اس شب بد نصیب کتنا تھا؟

9 ستمبر کا وہ قاتل دن آن پہنچا۔۔۔۔۔ حالانکہ میں نے کئی دعائیں مانگی تھیں اس دن کے گل جانے کی، نہ آنے کی مگر۔۔۔۔۔ مگر پھر بھی وہ قاتل دن اپنی تمام تر سفاکیوں سمیت آن پہنچا۔ میں نے سلیپنگ پلو کی پوری شیشی پھیل پر الٹنی، گولیاں نگل کر میں نے کاس سامنے دیوار پہ دے مارا۔ ایک جھٹکا ہوا اور کرچیاں اپنے ریزہ ریزہ وجود پر ماتم کناں فرش پر پھرن گئیں، مجھے ان میں آپ نظر آیا۔ میں بھی یونہی ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ ”اے اللہ! تو آج کل میری ہر دعا رد کر رہا ہے کم از کم مجھے آج موت ہی دے دے۔ اس کے بعد کا عذاب قابل قبول ہے۔ بے شک مجھے جہنم کا ایندھن بناؤ۔“ یہ میری بے بسی دے کسی کی انتہائی۔ اشعور میں اب بھی نئی ستوری سا ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔۔۔۔۔

چھوڑ گیا ہے کل شام وہ شخص مجھے میرے دل کو اذیتوں کے حوالے کر کے ہم تو اس سے کوئی شکوہ بھی نہیں کر سکتے دعا تازیت تاریکیاں سوئپ ویں جس نے، چند لمحے اچالے کر کے بے ہوشی اور خود فراموشی کا وہ عالم بچانے کب تک طاری رہا۔ پہلا احساس درد تھا سر پہ گویا کسی نے پہاڑ رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے اپنے پوٹھل پوٹھل ہاتھوں کے اور خالی خالی نظروں سے چھت کو دیکھنے لگا

بعد میں پتہ چلا کہ وہ اسپتال کی چھت تھی۔ موت نے بھی مجھے ٹھکرایا تھا خدا نے مجھے موت بھی نہیں دی تھی تقدیر لوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ سچائے مجھے ہر اک میری بے بسی پر مسکراہٹ تھی۔ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ میرا دل بے اختیار چاہا کہ اس کے لیوں پر کھینچی مسکراہٹ نوج لوں، ٹھیک اسی طرح جس طرح اس نے میرے لیوں کی مسکراہٹ چھینی تھی۔ مگر میں ”بے بس“ تھا اور یہ ”بے بسی“ کس قدر بے بس، بے اختیار اور لاچار لفظ ہے، کاش! میں لفظوں میں بیان کر سکتا۔۔۔۔۔

اس دن میں نے خود سے ایک عہد کیا۔ ”خدا سے کبھی کچھ نہ مانگنے کا عہد۔۔۔۔۔ قسمت کو پرانے کا عہد۔۔۔۔۔“ خدا نے میری کوئی دعا قبول نہیں کی تھی۔ مجھے بے سہارا چھوڑ دیا تھا اور مجھے بھی اب اس سے کچھ نہیں مانگنا تھا اور قسمت جس نے میری سب سے بڑی خوشی، میری محبت چھین لی تھی تو اب مجھے قسمت کو ہرا کر اپنی محبت حاصل کرنی تھی۔ کبھی ہا نہیں مانی تھی ہاں اگر موت آجائے تو الگ بات ہے۔

مگر میں بھول گیا تھا کہ میں تو کیا، کوئی بھی خدا کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ خاک کا اک ذرہ بھی نہیں۔۔۔۔۔ اور تقدیر سے لڑنا ممکن ہی نہیں کیونکہ تقدیر کوئی انسان یا کوئی مخلوق نہیں ہے کہ بندہ اس کا گریبان تمام کر لڑنا شروع کر دے یہ تو ایک ناپیدہ چیز ہے مگر اس کے ہونے کا احساس قوی تر ہے۔ بہر حال میں نے خود سے عہد کیا اور پھر۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

میں اس دن ای کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک گیا کیونکہ انہیں السر کی شکایت تھی وہ چیک اپ کے لئے گئیں تو میں نے وقت گزاری کے لئے اخبار اٹھایا ایک اشتہار پر میری پہلی نظر جم کر رہ گئی ”محبوب آپ کے قدموں میں“ کسی عامل کا اشتہار تھا۔ ساتھ ہی اس کی تعریف میں قلابے ملائے گئے تھے۔ ”مام پال دریا“ میں نے زیر لب نام دہراتے ہوئے پتہ لوٹ کر لیا۔

اگلے ہی روز میں وہاں تھا۔ اگرچہ قلیق تو عام سا ہی تھا مگر ماحول کو عجیب سی دشت نے لپیٹ میں لے رکھا تھا اس کے کمرے میں الو، بد بدم اور جنگلی کبوتروں کے بنجرے لٹکے تھے۔ سائیکل پر ایک بڑی سی موٹی موجود تھی ایک لٹکے کو تو میرے میسر نے مجھے ملامت کی۔ مگر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں کون سا ان پر ایمان لے آیا ہوں۔ میں تو صرف اپنے کام سے آیا ہوں۔ اس کے ہاتھ پر تک لگا تھا۔ اس نے میرا مسئلہ بخورنا اور اگلے روز آنے کو کہا۔

اگلے روز جب گیا تو اس نے بتایا کہ ”ریمز نے اسے شادی کے لئے مجبور کیا تھا۔ اس نے اسے دھکی دی تھی کہ اگر اس نے انکار کیا تو وہ نہ صرف اسے اس کے والدین بلکہ تمہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا۔“

رام گوپال کی بات نے مجھے حیران نہیں کیا، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ کس طرح اسے مجبور کیا گیا ہوگا۔

”مجھے ہر حال میں اسے پانا ہے۔“ میرا لہجہ اٹل تھا۔ ”ٹھیک ہے، میں ایک چلہ کروں گا۔ مگر تمہیں بھی سارہ کو چاکر سمجھانا ہوگا۔“ وہ مجھے تفصیلات بتانے لگا۔

میں بخور منتارہا۔

تین روز بعد میں سارہ کے گھر گیا۔ ڈائلڈ اور حارث بھائی بابا کے ساتھ یورپ ٹرپ پر گئے ہوئے تھے۔ ریمز میرا دور پارکا کزن تھا۔ میں اس کے گھر گیا تو ملازمہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر چلی گئی قریباً بیس منٹ بعد مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میرا دل یکدم سکڑ کر رہ گیا۔ چیخ بلاشبہ سائی کی تھی۔ اس کی آواز تو میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ میں تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر لپکا، بیڈ روم کی دینر پر ایک ٹائیچے کو میرے قدم زمین میں گڑ گئے۔

سارہ سامنے کارپٹ پر گری تھی، اس کا زخمہ کناڑا تھا، اس کا گرین فراک خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

”سائی.....“ میں یکجہت بے قراری سے آگے بڑھا۔

”سائی..... سائی میری جان۔“

اس کا سر آغوش میں لے کر میں اس کے گال

تھپتھپانے لگا۔ اس کی گلابی کملی رنگت ہلدی ہو چکی تھی۔ اس نے ریشمی پکوں کی جھار اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی دیران آنکھوں میں لکڑ بھر کے لئے چمک ابھری۔ جیسے دیا بجھنے سے قبل آخر باری بجز کتا ہے۔..... م۔..... مجھے معاف کر دینا راجیل۔“ اس نے انک انک کر کہا۔

”نن..... نہیں سائی اتم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔“ میں عالم دیوانگی میں تھا۔ اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

”سائی.....!“ میں حلق کے بل چلا یا۔ ”نہیں سائی۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔ آنکھیں کھولو سائی، خدا کے لئے آنکھیں کھولو۔“ ہذیانی انداز میں چلاتا میں اسے جھجھونے لگا کبھی کانٹوں بھری چھری بار بار میرے جسم میں بیوست کر کے کھینچ رہا تھا۔ میں نے تڑپ کر اس کی کلائی تھامی اور بغض ٹٹولنے لگا۔ مگر بغض..... بغض تو انگلیوں تلے آئی نہ رہی تھی یا شاید میری انگلیوں کی رسائی وہاں تک ہونہ پاری تھی۔ میں دیوانوں کی طرح اس کی کلائی ٹٹولنے لگا مگر بغض ہوتی تو ملتی..... اس کی بغض تو کہیں پاتال کی گہرائیوں اور تاریکیوں میں ڈوب چکی تھی۔ سرد لہجوں کی گرفت میں آ کر مجھد ہو چکی تھی اس کی، دھڑکن، سانس، زندگی کی ہر علامت دم توڑ چکی تھی۔

مجھے یوں لگا ملک الموت نے اس کی نہیں، میری روح قبض کر لی ہو۔ اس کی سرد اور زندگی سے عاری کلائی تھامے میں سناٹے میں تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں صلب ہو کر رہ گئی تھیں، میں نے بے جان ہاتھوں سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ مجھے قسمت ایک بار پھر ہر ابھی تھی اور یہ بار..... یہ شکست برداشت کرنے والی نہیں تھی..... ہرگز نہیں تھی۔

زندگی خواب کے سوا کیا تھی؟
زندگی عذاب کے سوا کیا ہے؟
تمام عمر یہ فحشکی حاوی رہی دعا
سندر بھی ”شراب“ کے سوا کیا ہے؟

رات اپنی تمام تر تاریکیوں سمیت چار سو میل چکی تھی، آسمان کے تاریک سینے پر اکا دکا ستاروں کی جھللاہٹ تھی چار اطراف سناٹا کسی فرض شناس چوکیدار کی مانند چوکس کھڑا تھا۔ خاموش آنکھیں پھاڑے دشت ادھر ادھر پکراتی پھرتی تھی..... قبرستان میں موت کا ازلی سکوت چھایا تھا۔ اکا دکا پیری اور برگلد کے درخت کسی عفریت کی مانند بازو پھیلائے کھڑے تھے۔ موت قبروں کی صورت میں جا بجا بکھری پڑی تھی۔ موت، جو ہر ایک کو نگل لیتی ہے۔ موت، جو ہمہ وقت کسی عقاب کی مانند مسلط اپنے خونخوار پنجوں میں جکڑنے کو بے تاب ہے۔ موت جس سے کسی کو انکار نہیں لیکن موت کی کوئی ایک شکل نہیں ہوتی..... کبھی بے پل پل اذیت دے دے کر مارتی رہتی ہے اور کبھی ایک ہی بار سانس چھین لیتی ہے، ہر بار یہ مختلف روپ میں سامنے آتی ہے اور اس کا ہر روپ پہلے سے زیادہ کرناک، اذیت ناک اور دشت ناک ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح زندگی بے بھر میں روپ بدل لیتی ہے۔ زندگی جو موت سے بھی سخت ترین شے ہے، زندگی، جو پل پل مارتی رہتی ہے لمحہ لمحہ جان نکالتی رہتی ہے۔

معا ایک کھٹکا سا ہوا۔ ماحول پہ طاری سکوت اس منکریز سے ٹوٹ گیا، میں جو سائی کے قبر کے پاس گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھا تھا، گردن ترچھی کر کے دیکھنے لگا، سارہ کو ریمز نے مارا تھا اور خود نہیں رو پڑا تھا۔ وہ کوئی بیہوش تھا اس کا سیاہ لبادہ گھٹنوں کو چھوتا تھا، وہ قبروں کی صورت بکھری پڑی موت سے بچ بچ کر گزر رہا تھا۔ اس کے پیروں تلے آتے خشک پتوں کی جھڑپاہٹ خاموشی کے سنگریزوں کو توڑ رہی تھی، وہ عین میرے پاس آ کر رک گیا، میں اسے بے تاثر نظروں سے دیکھتا رہا میرے پاس اب کوئی تاثر نہیں رہا تھا سوائے ایک تاثر کے..... میری زندگی کے ہر تاثر، ہر جذبے کو موت نے نگل لیا تھا اب میرے پاس صرف ایک ہی تاثر تھا۔ ”موت کا

تاثر..... تا حد نگاہ موت کا تاثر.....“

”راجیل!“ رام گوپال کی پاٹ دار آواز اس وقت دھیمی تھی۔ میں نے اسے دیکھنے پہ انکھایا۔ ”یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“

وہ میرے پاس بیٹھ گیا میں نے چپ چاپ سر جھکا لیا۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ بلکہ میرے پاس ”کچھ بھی“ نہیں تھا۔ صرف بے بسی تھی جو ہر وقت میرے چار جانب رقصاں تھی۔

”اگر تم چاہو تو سارہ اب بھی تمہیں مل سکتی ہے۔“ اس کی بات پر میں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”اب؟“ میرا لہجہ سیاٹ تھا۔ اس نے سر اٹھاتے میں ہلایا۔ ”مرے ہوئے لوگ واپس نہیں آتے۔“

میں نے سر جھکا۔

”تو گویا ہم لوگ جو چلے اور چپ کرتے ہیں وہ یونہی ہے؟“ وہ قدرے توقف سے بولا۔ ”سارہ زندہ نہیں ہو سکتی مگر..... کسی اور کی روح.....“ وہ مجھے تفصیلات بتانے لگا۔ اسے ایک چلہ کرنا تھا۔ اور مجھے بس سارہ کی لاش اس کے حوالے کرنی تھی۔ باقی وہ بعد میں بتاتا۔ میں اس وقت بے حسی کی انتہاؤں پر تھا، میں نے فوراً ہی بھری وہ مجھ سے بے تکلیف ہو گیا، میں خوش تھا کہ تقدیر کو شکست فاش سے دو چار کر دوں گا۔

میں سائی کی قبر کے پاس موجود تھا میں نے آنکھوں میں درآئی نمی، تھیلی کی پشت سے صاف کی اور بیلے وغیرہ سنجال لیا۔ میری چھٹی حس، میرا وجدان مسلسل کوئی سنگل دے رہا تھا میرے اندر کوئی مجھے چیخ کر منہ کر رہا تھا، یہ سب کرنے سے روک رہا تھا۔

قبرستان میں خاموشی نے تسلط بھرا رکھا تھا، بادل بدستور چاند کو ڈوبے ہوئے تھے اندھیرا کسی تابعدا عقاب کی مانند میرے ارد گرد چکرارہا تھا۔ دفعتاً آسمان کے مغربی کونے پر بجلی کی دیوی نے جھلک دکھائی..... لکڑ بھر کے لئے قرب و جوار روز روشن کی مانند عیاں ہوئے..... پیری اور برگلد کے بچے چمکے..... ہوئے ہوئے سرسرائی ہوا تیزی سے پکرا گئی۔

جاتے تھے، میرا وجود سناٹوں کی زد میں تھا میرے قریب پہنچنے تک اس کا چنداچھ حصہ ہی بچا تھا اور پھر..... میری بھارتوں نے ایک اور حیرت ناک منظر دکھا۔

ریت پہ، ریت کے ذروں کی مانند بھرے وہ ریزے تیزی سے سرکتے ایک جگہ تیزی سے جمع ہوئے اور پھر سے اسی لوتھر کے کی شکل اختیار کر لی۔

”اے اللہ! اب تو میری سزا ختم کر دے۔ اب میں تیرے سوا کسی سے مدد نہیں مانگوں گا۔ کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ تیرے سوا کوئی بھی قادر نہیں ہے۔ تو مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دے، میں کبھی تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔“ لوتھر نے سے ابھرتی انسانی آواز سن کر مجھے چار سو چالیس دالٹ کا کرنٹ لگا۔

”کیا کوئی انسان ہے؟“ یہ قیامت خیز خیال میرے جسم کا سارا خون خشک کر گیا۔ خوف دہشت کا سیاہ عفریت دل و دماغ پہ بچے گاڑے خاموش..... اعصاب پہ مسلط تھا۔

”تاہم کتنی ذلیل دی تھی کہ شاید..... شاید تو سمجھ جائے مگر تجھے تو اللہ کا عذاب جھوٹ لگتا تھا..... اب دقت گزر گیا..... اور اللہ اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دے گا۔“ اس آواز میں بادلوں کی سی گڑ گڑاہٹ تھی۔

وہ کئی تھے..... انتہائی طویل قامت اور حد درجہ دہشت ناک..... ان سب کی رنگت سیاہ ترین تھی، چلنے اور چہرے ہیبت ناک..... ان سب کے ہاتھوں میں گرز نما چیزیں تھیں اور وہ اس لوتھر سے کو..... نہیں وہ ایک نہیں تھا ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی اور وہ سب ریت پر کھلا رہے تھے اور وہ لوگ ان پر گرز برسا رہے تھے۔ لوتھر دلوں سے طویل کر بنا کر دلخراش چیزیں ابھر رہی تھیں، گرز کے شدید ترین ضرب سے لوتھر سے ہزاروں ٹکڑوں میں تبدیل ہو جاتے اور دھرتی لرز اٹھتی لوتھر دلوں سے ابھرتی دیوانگی آمیز اذیت ناک چیزوں سے فضا دھل دھل جاتی۔ ان کے بھرے ریزے آن واحد میں پھر کچکا ہو جاتے اور اگلے ہی لمحے گرز کی

شدید ترین کرب ناک ضرب پھر سے انہیں ریزہ ریزہ کر دیتی، ایک ناقابل بیان دہشت نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

میرے جسم کے زندان میں عقید میری اپنی روح پھڑ پھڑانے لگی اور اس پھڑ پھڑاہٹ نے میرے ذہن سے ہر نقش کو کھرچ ڈالا، وہ منظر اس قدر دہشت ناک تھا کہ الفاظ کی گرفت میں ہی نہیں آ سکتا۔

”اور اللہ! اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دیتا ہے۔“ گرز گڑاٹ نما گرجتی آواز فضا میں پکرنے لگی، ہوا کو یکا یک دورہ پڑ گیا اور وہ بیسیاں بجائی عالم دہشت میں ادھر ادھر سر جھٹکنے لگی۔

ریت اڑاڑ کر مجھ پہ برسے لگی، بھجری ہوا دھشاناہ انداز میں ریت کی جھولیاں پھر پھر کر ادھر ادھر اٹھنے لگی تھی۔ اس کی سیٹی نما ”شائیں شائیں“ ساعتوں پہ ہتھوڑے کی مانند برس رہی تھی۔ طوفان نے آنکھوں کے سامنے ریت کی چادر سی تان دی تھی۔ ریت میرے بالوں میں، آنکھوں میں، منہ میں چھپنے لگی، تاہم ریت کی مہیب دھند کے پار کا منظر صریحاً واضح تھا دہشت ناک، ہیبت انگیز لوگوں کی دیوانہ دار ضربیں۔ لوتھر دلوں کی چیزیں..... ان کا بیل بھر میں ریزہ ریزہ ہونا پھر آن واحد میں کچکا ہونا..... از سر نو دہی کر بنا کر ضربیں..... دہی دیوانگی بھری اذیت ناک ہڈیانی چیزیں..... ان کا ریت کی مانند ٹکھڑا..... کچکا ہونا..... شدید ترین ضرب..... دیوانگی آمیز چیزوں کا تسلسل.....

اور اللہ! اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دے گا۔“ گرجتی آوازیں..... میں بری طرح کرنٹ کھاکر اٹھ بیٹھا..... میں بری طرح ہانپ رہا تھا، دل حلق میں آن پھنسا تھا اور شرک پھڑک رہی تھی، ذہن میں جھلجھل رہے تھے اور رگوں میں دوڑتا خون جھکے لے لے کر گردش کر رہا تھا۔

”تو یہ..... خواب تھا؟“

ان گرز برداروں کی ہیبت ناک صورتیں میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کی دہشت ناک ضربیں..... زمین کی لرزش، لوتھر دلوں کی چیزیں اور ”اف اللہ“ میں تھراٹھا۔ میرا پورا وجود پسینے میں تر تھا۔ میں نے اپنے نم بالوں میں ہاتھ پھیرا..... میری حیرت سے بھٹی آنکھیں اپنے ہاتھ پہ جچی ریت پہ بھی تھیں میں نے کاٹرانہ نگاہ کرے میں دورائی دروازہ لاک تھا کڑکی بھی بندھی پھر یہ ریت..... زیرو پارہ لب کی مدھم روشنی میں ریت کے ذریعے چمک رہے تھے میرا ہاتھ میکا کی انداز میں چہرے اور گردن پر پھسلنے لگا میرے ذہن میں آمدہاں چل رہی تھیں میرا پورا وجود ریت سے اٹا تھا..... دھشاناہ ہوا مجھے بیسیاں بجائی کمرے کے در دو پار سے سرگرمائی محسوس ہو رہی تھی۔ گرز دلوں دھمک سے در دو پار لرزتے محسوس ہو رہی تھی، میری ساعتوں پہ بار بار یہ جملہ دھمک دے رہا تھا ”اور اللہ! اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دیتا ہے۔“

”میری آنکھیں تو اس ایک منظر کو دیکھ رہی تھیں گوشت کا بلی سا خون میں تر لوتھر اور دیوانہ دار شدید ترین ضرب..... لوتھر نے کے اڑتے ریزے، ہڈیانی چیزیں..... ریزوں کا کچکا ہونا..... اڑتی ریت..... گرز دلوں ضرب..... اڑتے ریزے.....“ میرے اللہ!

میرے شعور اور لاشعور میں یہی پکارتی میں رو رہا تھا..... میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، دل بیٹے میں بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا، روح کسمساری تھی..... بری طرح.....

”اللہ! اپنے بندوں سے بے حد محبت کرتا ہے، بے حد مہربان ہے وہ..... اور انسان بے حد کم ظرف..... اللہ نے ہمیں بے بہا نعمتوں سے نوازا رکھا ہے۔ اگر ہم اس کی عطا کردہ ایک ہی نعمت کا شکر دن رات حمد و ثناء کرتے رہیں تب بھی نہ کر پائیں گے اور جس قدر گناہ گار ہم ہیں، اس حساب سے تو ہم ایک نوالہ کا بھی حقدار نہیں۔ ایک گھونٹ پانی

بھی نہیں لاسکتے۔ ایک سانس تک لینے کے قابل نہیں..... مگر اس نے پھر بھی..... پھر بھی ہمیں کس قدر نعمتوں سے نوازا رکھا ہے..... ہمیں زندگی دے رکھی ہے کہ ہم صحیح طریقے سے گزاریں تاکہ وہ ہمیں دائمی حیات میں جنت عطا فرمائے..... مگر ہم لوگ قدر نہیں کرتے اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہمیں یاد نہیں رہتا اور ایک ذرا سی تکلیف پہ ہم اس سے شکوے کرنے لگتے ہیں، کس قدر ناشکرے ہیں ہم.....

جب ہماری کوئی دعا، کوئی خواہش پوری نہ ہو تو ہم اس سے ناراض ہو جاتے ہیں وہ ”خالق“ ہے ہمارا..... وہ بہتر جانتا ہے، اسے ہم سے زیادہ معلوم ہے کہ ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا بدتر..... اللہ ہماری ہر دعا قبول کرتا ہے کبھی فوراً کبھی دیر سے..... کبھی وہ دعا آخرت کیلئے ذخیرہ کر لی جاتی ہے..... آخرت..... یعنی روزِ محشر..... روزِ محشر..... ”یعنی یومِ حساب“ وہ ”آخرت“ جسے ہم ”دنیا“ کے حصول میں بھولے ہوئے ہیں وہ روزِ محشر، جسے ہم دینی لذتوں میں فراموش کئے ہوئے ہیں..... دینی یومِ حساب..... جو ہمارے قلب و ذہن سے غور ہو چکا ہے.....

آخر ہم صرف قبر کی تاریکیوں کو ہی یاد رکھ لیں..... اس تنہائی کی دہشت کو..... ان بھوکے کپڑے کو کھڑوں کو..... تو ہم کبھی گناہ کے قریب بھی نہ پہنچیں.....

اللہ سب سے بہترین ”منصف“ ہے اور ہمیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ بے شک! سب جہانوں کا وہی مالک ہے..... وہی خالق اور وہی رازق ہے..... وہی اور صرف وہی ہر چیز پر ”قادر“ ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو ہم سانس بھی نہیں لے سکتے.....

میں راحیل خان..... بہت برا انسان ہوں میں..... سارہ اگر مجھے نل سکی تو اس میں اللہ کی کوئی مصلحت تھی..... یقیناً تھی..... مگر میں نہیں سمجھا تھا بجائے اس کے، کہ اللہ سے مبرا و مدد مانگا، میں رام گوپال سے مدد مانگ بیٹھا..... حالانکہ جو شے ”اللہ“ نے نہیں دی وہ

کوئی اور کیسے دے سکتا ہے؟ یہ تو۔۔۔ یہ تو ”شکر“ ہے
 ”یعنی مجھے اللہ نے ساری نعمتیں دی تو میں نے رام کو پال
 سے۔۔۔ ہاں! کسی سے اپنے لئے دعا کروانا الگ بات
 ہے۔۔۔ کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کے غلوں کے سبب
 ہماری آزمائش ختم کر دے۔۔۔ اللہ کا فرمان ہے۔۔۔ ”تم
 اپنے بھائی کے لئے عاتیانہ دعا کرو تو وہ ضرور قبول
 ہوگی۔“ الفاظ اور ہوں گے مفہوم یکساں ہے۔۔۔ اور خود
 ہماری دعا بھی تواریکساں نہیں جاتی۔۔۔ اور جو میں نے کیا
 وہ تو سراسر شرک۔۔۔ شکر ہی تھا۔ میں نے کہا تھا کہ
 میں ”اللہ“ سے کچھ نہیں مانگو گا۔ اس کے برعکس میں نے
 رام کو پال سے مدد مانگی۔۔۔ تو۔۔۔ تو کیا اللہ مجھے توبہ
 کے بعد بھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔؟“

سورج مغرب کی جانب جھک چلا تھا۔ جاتی سر
 پہر نے منہ پر چپ کی انگلی رکھی تھی جس کی ہیبت اتنی تھی
 کہ چوں تک نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ چاروں اور
 پر ہول سناٹا طاری تھا۔ تاحہ نظر چٹیل میدان تھا تبر زمین
 کے سینے پر پڑی دراڑیں اس کی تنگی کی گواہ تھیں اکا دکا
 درخت سو گوارے سے سر جھکائے کھڑے تھے سورج عین
 سر پہ انگارے برسا رہا تھا۔ کل رام کو پال دریا ایک
 چلے میں مارا گیا تھا اس کے ایک ملازم نے بتایا کہ چلہ
 کرتے وقت کنڑل ٹوٹ گیا اور۔۔۔ اور بھلا موت کو کوئی
 کنڈل روک سکا ہے کسی؟

سامہ کی لاش میں نے رات کی گھٹا ٹوپ
 تاریکی میں اس کی آخری آرام گاہ میں پہنچا دیا تھا
 جو گناہ میں کر چکا ہوں ان کا کفارہ تو شاید کسی صورت
 ممکن نہیں۔۔۔ میں چلا تھا قسمت سے لڑنے۔۔۔
 ہاں! بھلا آج تک کوئی لڑ سکا ہے قسمت سے؟
 انسان قسمت کے حصار میں قید ایک بے بس پتھی ہے
 اس حصار میں پھڑ پھڑا تو سکتا ہے مگر آزاد نہیں
 ہو سکتا۔۔۔ سرخ پنج کر لہو لہان تو ہو سکتا ہے مگر اس
 حصار کو توڑ نہیں سکتا۔۔۔ انسان جو خود پہ فانی چیزوں
 پر غرور کرتا ہے کیا خبر کہ یہ چیزیں کب تک پاس ہیں؟
 کب تقدیر کر دے اور سب کچھ بدل جائے دم

جس کی غربت و افلاس کا مذاق اڑا رہے ہیں کیا خبر کہ
 کل وہ بادشاہ ہو اور ہم اس سے بھی بدتر حال
 میں۔۔۔ مقدر میں بس ایک ہی خرابی ہے کہ یہ ہمارا
 ہو کر ہی ”ہمارا“ نہیں ہوتا۔ ہم لاکھ کوشش
 کر لیں اسے مٹھی میں بند نہیں کر سکتے۔ اسے
 بیوقوفی سے روک نہیں سکتے۔

اور میں چلا تھا اسے موڑنے۔۔۔
 ہاں دعائیں بلاشبہ اتنی طاقت ہوتی ہے کہ یہ
 طوفان کا رخ موڑ سکتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ادعونی
 استجب لکم“ یعنی تم دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول
 کر دوں گا۔“

کیا اللہ کا وعدہ جھوٹا ہو سکتا ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں
 اور میں شیطان کے بہکادے میں آکر غلط راہ پر چل
 نکلا۔ اللہ کس قدر مہربان ہے۔ اس نے مجھے بر نعمت سے
 نوازا۔۔۔ اور سارے کے ذریعے غالباً میرا امتحان لینا چاہا۔
 اللہ بے شک اپنے خاص بندوں کو ہی آزمائش
 میں ڈالتا ہے۔ اور میں اس امتحان میں بری طرح۔۔۔
 بری طرح ٹپل ہو گیا۔ اللہ نے مصیبت کے
 وقت ”صبر“ کی تلقین دی ہے، صبر وہی ہے جو شروع
 مصیبت میں کیا جائے۔ روزہ روپیہ کر دینا چلا کر
 تو ہر کوئی چپ ہو جاتا ہے۔ صبر ”کرنے“ اور صبر
 ”آجانے“ میں فرق ہوتا ہے ”صبر کرنا“ کوئی کوئی
 ہے۔ ”صبر آ“ سب کو جاتا ہے۔ میں نے بھی صبر نہیں
 کیا بلکہ اللہ کی ناشکری کی۔۔۔ اللہ سے گلے شکوے
 کئے۔۔۔ اللہ کی نافرمانی کی۔۔۔ اور پھر۔

اللہ نے مجھے بچایا مجھے زندگی دی۔ میں نے
 ”جنہم“ مانگا۔۔۔ وہ جنہم جس سے ہر کوئی پناہ مانگتا ہے
 مگر اس نے پھر بھی مجھے بچالیا۔ میں پھر بھی اس کی خاص
 اور بے لوث محبت کو نہیں سمجھا۔ گناہوں کی دلدل میں
 وحشت چلا گیا۔ مرے ہوئے لوگوں کو بے آرام کیا۔۔۔
 ان کی بے حرمتی کی۔۔۔ اس نے پھر بھی مجھے ڈھیل دی۔
 اگر میں صبر کرتا تو ممکن ہے ”وہ“ سامہ کی شکل میں کوئی
 اور دے دیتا۔

حدیث قدسی ہے۔۔۔ ”اے ایمان آدم۔۔۔!
 ایک میری چاہت ہے اور ایک تیری چاہت ہے
 ہوگا تو وہی جو میری چاہت ہے۔
 پس۔۔۔ اگر تو نے سپرد کر دیا اپنے آپ کو اس
 کے، جو میری چاہت ہے۔

تو وہ بھی میں تجھے دوں گا جو تیری چاہت ہے
 اگر تو نے مخالفت کی اس کی جو میری چاہت
 ہے۔

تو میں تمہا دوں گا تجھ کو اس میں جو تیری
 چاہت ہے۔
 پھر۔۔۔ ہوگا وہی، جو میری چاہت ہے۔

اور اللہ کی چاہت کیا ہے؟ خود ہماری ہی بھلائی
 اس کی چاہت ہے، اس کی اطاعت و بندگی میں اس کا
 نہیں وجود ہمارا فائدہ ہے۔ ورنہ کیا اس کی عبادت کرنے
 والوں کی کمی ہے؟ ایک ہمارے مجدد نہ کرنے سے اسے
 کیا فرق پڑتا ہے۔

اللہ ہمارا بھلا چاہتا ہے اس کی چاہت ہے کہ
 ہم اس کے اور اس کے محبوب حضرت محمد ﷺ کے
 بتائے گئے سیدھے راستے پر چلیں۔ حضرت محمد ﷺ
 جو رحمت اللعالمین ہیں۔۔۔ صرف دنیا میں ہی نہیں۔
 آخرت میں بھی رحمت ہیں۔ اپنی گناہگار امت کے
 لئے شفاعت ہیں۔

”پانچویں جس پہ عشر میں، بخشا گیا
 دیکھا جس سمت، ابر کرم چھا گیا
 رخ جدھر ہو گیا۔۔۔ زندگی پا گیا
 جس طرف اٹھ گئی، دم میں دم آ گیا
 اس نگاہ عنایت پہ لاکھوں سلام
 مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام“
 عقب میں ابھرنے والی غراہٹ نے مجھے
 چونکا دیا چاک مجھے اپنی رگوں میں لہو رکھا ہوا محسوس
 ہوا۔ وہ ایک چپا تھا اس کی قاتل آنکھیں انگاروں کی
 مانند دھبہ رہی تھیں اس کی دم تیزی سے دائیں بائیں
 حرکت کر رہی تھی۔ اس کا وزن اس کے پھیلے پاؤں

پر تھا اور اس کی یہ کیفیت اشارہ دے رہی تھی کہ وہ مجھ پر
 چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے قریباً نصف منٹ تک
 میں اور درندہ آنے سے سانسے رہے۔ اس کی قاتل
 آنکھیں سفاکی سے مجھ پر جھمی تھیں۔ اس کا چیز اوزر
 آدھا اور قاتل دانتوں کی جھلک دکھائی پڑتی تھی۔ اس
 کی سانسوں کے ساتھ ساتھ ہلکی سی مدھم سی غراہٹ
 ابھر رہی تھی، زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی
 درندے کو یوں کھلی جگہ اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ناقابل
 بیان احساس تھا وہ جیشیں چالیں سینڈ، بینٹیں
 چالیں گھنٹوں پر محیط تھے۔ لمبے صدیوں پر محیط تھے
 اور صدیاں لحوں میں گزر گئیں۔ اس نے بے اعتنائی
 سے رخ موڑا اور مجھے یکسر نظر انداز کرنا جھانپوں میں
 غائب ہو گیا۔

میں کتنی ہی دیر ساکت رہا۔۔۔ معا کسی کی
 کرناک جھپٹیں ساکن فضاء میں دراڑیں ڈال گئیں۔۔۔
 ساتھ ہی جیتے کی چٹکنا ابھری اور سننا نہت بن کر دور
 دور تک پھیل گئی۔ پھر کسی دہشت زدہ شخص کے چلانے
 کی آواز ابھری۔ یہ آواز زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اٹھا اور
 مختلط قدموں سے آگے بڑھا۔ میری نگاہ گھاس کے بیچ
 پڑی لاشی نما ایک لکڑی پر پڑی۔ میں نے وہ اٹھالی۔
 آگے جا کر میں ٹھک گیا۔ لکڑے کے درخت کے عقب
 میں چپا کسی شخص کو بھنبھوڑ رہا تھا۔

منسنی کی ایک برقی لہر میری ریزھ کی ہڈی سے
 ہوتی ہوئی دماغ تک جا پہنچی۔ وہ ایک لرزا دینے والا
 منظر تھا۔ میں نے فحاش سے بے پرواہ ہو کر لاشی سے
 چپے کی پشت پہ ضرب لگائی۔ تینچا وہی ہوا جو ہونا
 چاہئے تھا۔ مشتعل درندے نے اپنے نامعلوم شکار کو
 چھوڑا اور غضب ناک آواز میں میری جانب متوجہ ہوا۔
 میں بے ساختہ کی قدم چپے بٹا اور لاشی پر میری گرفت
 لاشعوری طور پر مضبوط ہوئی۔ وہ اگلی ٹانگوں سے زمین
 کھرچنے لگا اور پھر جھکی کی کوند گئی۔

مجھے اپنے کندھے میں انگارے دھنسنے معلوم
 ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی سڑے ہوئے گوشت کی

ناگوار یومیروں سے بچتوں میں ٹھکتی چلی گئی۔ میرے بائیں کندھے میں آگ بھری تھی۔ لمحہ بہ لمحہ آگ کی شدت اور میری اذیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ درد تھا۔ بے پناہ درد تھا۔ اذیت تھی۔ بے انتہا اذیت تھی۔ چیتا اپنے نوکیلے جڑے میں میرا کندھا بری طرح چھوڑ رہا تھا۔ دیر سے دیر سے میرا ذہن تاریکیوں میں، پاتال کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

میں نے دوبارہ اس کی دنیا میں قدم دھرا تو پہلا احساس شدید ترین اذیت کا ہی تھا۔ بائیں کندھے کو گویا انگاروں سے داغا جا رہا تھا۔ ضبط کے باوجود کراہیں میرے ہونٹوں کی باڑ پار کر گئیں۔ آسمان سرمئی اور سیاہ مائل سرمئی بادلوں سے ڈھکا تھا۔ سرسالی ہوا گویا سیٹیاں بجائی خود درد آ دم گھاس اور ورختوں سے سرپختی پھر رہی تھی۔ بادل جارحانہ انداز میں دھاڑ رہے تھے۔

”سنو!“ میں نے بدقت گردن ایک ذرا ترجیحی کی۔ وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس کی سوچی چوڑی ہڈیوں کو بمشکل ڈھانچے ہوئے تھے۔ اس کے بادای کرتے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ وہی ہے جو چپیتے کا شکار تھا۔ اس کا دایاں بازو عاتبا زخمی تھا۔ اس کے کرتے پر خون کے نشان تھے۔ ”تم یقیناً ایک نیک انسان ہو۔ ایک انجان شخص کو بچانے کے لئے تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔“

”نیک.....؟“ مجھے خود پہنسی آگئی۔ مجھ جیسے شخص کو، جو انسانوں کا ہی نہیں، خدا کا بھی گناہگار ہو، بھلے قدرے بے خبری میں ہی سہی، شرک تک کا مرتکب ہو چکا ہے، اسے ”نیک“ کہنا..... کتنا بزدلانہ ہے۔ میں تو اس قدر گناہگار ہوں کہ اللہ کا سامنا ہی نہیں کر سکتا۔ میں تو معافی تک مانگنے کے قابل نہیں۔ کیسے معافی مانگوں؟“ میرا لہجہ ٹوٹا چھوٹا تھا۔ آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”تم ایک بات بھول رہے ہو..... تمہارے،

میرے، ہم سب کے گناہ کتنے ہی زیادہ سہی، مگر اللہ کی ”رحمت“ سے زیادہ نہیں۔“

میرے اندر برق لپک گئی۔ دماغ کے تاریک ترین گوشے بھی منور ہو گئے۔ مگر شرک کا خیال آتے ہی یہ روشنی مدھم پڑ گئی۔

”ایک بات یاد رکھو، اللہ کی ذات سے مایوسی کفر ہے۔“ اس نے گویا میری سوچ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ ”اور وہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔“ وہ ایک دم پلٹا اور مستحکم قدموں سے چلتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”اللہ کی ذات سے مایوسی کفر ہے۔“ اس کی آواز کی بازگشت گونگی اور میں پوری جان سے ہل کر رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ”اللہ“ مجھے معاف نہیں کرے گا۔ یہ تو..... یہ تو کفر ہے۔ نیکخت ایک پر درد کراہ میرے لبوں سے برآمد ہوئی۔ کندھے میں بدستور چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ ناقابل بیان اذیت تھی۔

اچانک بارش شروع ہو گئی۔ موسلا دھار بارش..... شخاف قطرے مجھے بے تابی سے چھونے لگے۔ ہوا ادھر ادھر ڈوٹی بوندوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ بارش کی ٹپ ٹپ اور ہوا کی سائیں سائیں کے باوجود ارد گرد ایسی خاموشی چھائی تھی کہ مجھے شدید ترین وحشت نے آن گھیرا..... ایک عجیب سی ویرانی مجھے اپنے روم روم میں بستی، اندر تک اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”تہائی اس قدر وحشت ناک ہوتی ہے۔“ مجھے اس سے قبل اندازہ بھی نہ تھا۔

ایک لخت گڑگڑاہٹ کا دیوتا دھاڑا..... چاروں طرف سے آسانی جلیاں تاریک فضاء کا سینہ فگار کرتی میری جانب لپکیں۔ میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ دل کا ایک اچھل کر طلق میں آن پھنسا اور شہ رگ پھڑک اٹھی۔ وحشا نہ ہوا پاگلوں کی طرح بین کرتی ادھر ادھر سر جھٹکتی گئی۔ بوندیں بندوق سے نکلی گویا کی طرح جھ پڑا اتر رہے تھیں..... اضطراب رگ و پے میں چھریاں چلانے

لگا..... بے چینی خون میں شامل ہو کر سرسرا نے لگی۔ خوف نے اپنے سفاک اور نوکیلے پنجوں میں جکڑ لیا اور تہائی میری روح میں سا نے لگی۔

گہری تاریکی، طوفانی بارش کی مخصوص آواز، پادلوں کی دل دہلا دینے والی آوازیں اور بجلی کی اعصاب چمٹا دینے والی چنگھاڑوں نے ماحول کو دبشت ناک صورت دے دی تھی۔ بعض احساسات اس قدر عجیب ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی نام نہیں دیا جاسکتا..... اور بعض احساسات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ لفظوں میں بیان نہیں کئے جاسکتے..... تہائی کا احساس ناقابل بیان تھا۔ کندھے کی تکلیف بدتر توج بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے جسم میں اب اکڑاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا، ناخنوں کو اکھاڑا، بالوں کو نوچا اور گوشت کو ہڈیوں سے جدا کیا جا رہا ہو..... کوئی بار بار کانٹوں بھری جھاڑی میرے وجود میں گھونپ کر کھینچ رہا تھا۔ ”تو میں مر رہا ہوں، اور.....“

میں کا ایک دہشت میں گھر کر ہڈیانی انداز میں چلانے لگا۔ ”اللہ کی ذات سے مایوسی کفر ہے۔ اور وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔“ مجھے یاد آیا کہ اللہ میری پکار ضرور سنے گا۔ ”یا اللہ..... اللہ.....“ میں اذیت سے پکارنے لگا۔ ”یا اللہ! میری توبہ قبول فرما۔ بے شک! تو ”واحد“ ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں تو رحمن ہے..... تو رحیم ہے.....“ میں بری طرح روتے ہوئے گڑگڑانے لگا۔

ایک ایک مجھے خیال آیا کہ اللہ میری شرگ سے بھی نزدیک ہے۔ قریب تر ہے۔ قربانی منہ چھپا گئی۔ ”یا اللہ! اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدمے مجھے معاف فرما۔ میری توبہ قبول فرما۔“

خوف مجھ سے لرزاں براندام ہو کر بھاگ اٹھا۔ ”یا اللہ! تیرے سوا کوئی سہارا نہیں۔ توبہ بے سہاروں کو سب سے بہتر سہارا دینے والا ہے۔ میں بے سہارا ہوں، سہارا دے۔“

وحشت ریت کی مانند بکھرنے لگی۔ ”اے اللہ! میرے گناہ بے شک ریت کے ذروں، پانی کے قطرہوں

سے بھی زیادہ ہیں، مگر بے شک تیری رحمت ان پہ بھاری ہے۔“

کندھے میں سلگتی چنگاریاں بجھنے لگیں۔ ”یا اللہ! میری زبان، میرا دل و دماغ، میرے جسم کا رواداں رواں، میری روح گواہی دیتی ہے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں..... تو واحد ہے، لاشریک ہے..... اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تیرے برگزیدہ بندے اور آخری رسول ہیں۔“ اذیت مدھم پڑتے پڑتے معدوم ہو گئی۔

”یا اللہ! میرے گناہ معاف فرما۔ میرے مالک! میری توبہ قبول فرما۔“

مجھے گویا کسی برقیے غار میں اتارا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں، حتیٰ کہ پورا جسم برف کی سل میں ڈھلنے لگا۔ میرے گرد گرد برف ہی برف تھی اور میرا وجود..... اب میرا ذہن برقیے سمندر میں تیرتا پھر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے، مجرم ہوں میں اور تو میرا حاکم جیسی تو آج میری آنکھوں میں اشکوں کی بے رحم حجم کوئی زندہ تیرے درد پہ جو آنسو بہا دیتا ہے میرے مولیٰ! در توبہ تو اس پر کھول دیتا ہے تو ضرور سنے گا میرے دل کی صدا..... ”میری توبہ، میری توبہ!“ میرے دل میں کسی نے زہر میں بجھا خمر اتارا تھا گویا۔

تیرے در سے کیوں نہ سوال کروں تو رحیم بھی ہے، تو کریم بھی ہے میں تو پست بھی ہوں میں حقیر بھی ہوں تو بلند بھی ہے، تو عظیم بھی ہے

میری سن لے ”دین و دنیا کے خالق.....“ ٹھنڈک پیش میں بدل گئی۔ آگ تھی میرے سامنے..... فلک یوں آگ..... دہکتی آگ کے لپکے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے، اس آگ میں مجھے اپنے سارے گناہ دکھائی پڑتے تھے۔ عین نماز کے وقت بجائے نماز پڑھنے کے، قلم دیکھنا یا دیگر کام..... ماں سے بدتمیزی، اللہ سے شکوے، خودکشی، رام گوپال سے مدد مانگنا، سہارہ



آغوش

راشد نذیر طاہر - کراچی

وہ ایک بے نام اور بے وجود سایہ تھا جس کے پیچھے نوجوان اپنی طاقت، ہمت اور سوچ سے بڑھ کر بھاگتا رہا، کوشش، کوشش اور انتہک کوشش کے باوجود بھی نوجوان اسے پا نہ سکا لیکن جب وہ سایہ مجسم اس کے سامنے آیا تو.....

انجی کہانوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ایک دلکش ذخیرہ، حیرت انگیز مگر سبق آموز کہانی

جلیل نے ایک طویل سانس لی، کتاب کو سائڈ ٹیبل پر رکھا اور سر کے نیچے دلوں ہاتھ رکھ کر بہتر پر دراز ہو گیا۔ اس کا ذہن کہانی کے تانے بانوں میں کھو یا ہوا تھا۔ اس کی نظر میں مصنف نے پہلی بار اپنی کسی کہانی کا انتقام ادا چھوڑا تھا۔ آغوش نامی مصنف اس کا پسندیدہ ترین لکھنے والا تھا۔ یوں تو اس نے کئی لکھنے والوں کو پڑھا تھا، لیکن اس نے جو بات آغوش کی تحریروں میں محسوس کی تھی وہ کسی اور میں دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جلیل اس کا کوئی افسانہ، کوئی کہانی اور کوئی ناول چھوڑا نہیں تھا۔ چند سال پہلے اس کی آغوش سے خط و کتاب بھی لکھی تھی، لیکن پھر بعد میں نہ جانے کیا ہوا؟

کروں، میں گمراہ تھا، تو ہی ہے میرے خدا جس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ میں اسی رستے پر چلتا ہوں۔ وہ پڑ آیا ہوں..... مجھے معاف کر..... درتوبہ وا کر دے..... درتوبہ وا کر دے.....

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ یکبارگی ایک بجلی سی لگی اور بے اختیار میری زبان پر کلمہ شہادت جاری ہو گیا۔ ”ارے..... یہ کیا؟“

تاریک آسمان کے ایک گوشے سے یہ نور کیسا پھوٹ رہا ہے؟ یہ تو کوئی دروازہ ہے..... اس دروازے سے ایک ٹھنڈی اور باوقار روشنی سیدھی میری جانب لپکی آرہی ہے..... اوہ! یہ کس قدر کیف آور ہے..... میرا پورا وجود اس نور کے ہالے میں بھیگ رہا ہے..... یہ بیان کرنے کی نہیں، صرف محسوس کرنے کی بات ہے..... اور زمین و آسمان کا گوشہ گوشہ اس نور سے روشن ہے..... ایک سحر کن مہک چکرائی پھر رہی ہے..... بے شک! اللہ اپنے بندوں کی پکار ضرور سنتا ہے..... توبہ قبول فرماتا ہے..... چاہے کوئی لب دم توبہ کرے.....

مجھے آسمان کی وسعتوں میں اللہ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کی جھلک دکھائی دے رہی ہے..... میرا دل شدت سے وہاں جانے کو چل اٹھا ہے..... میرے لب، قلب و ذہن اُسے اختیار درویش شریف کا در در کرنے لگے ہیں۔ اب ایک نور کا مہلکا ہالہ مجھے لئے جو پرواز ہے..... اور میں دیر سے دیر سے روضہ اطہر کے قریب ہوتا جا رہا ہوں.....

”بے شک.....! اللہ اپنے بندوں کی پکار ضرور سنتا ہے..... بس ضرورت ہے، تو سچے دل سے پکارنے کی..... وہ بے حد رحیم و کریم ہے..... ہماری سوچ کی حدود سے بھی نکلتا زیادہ..... اور اللہ ہمارے ساتھ بھی کچھ برا نہیں کرتا۔ ہم خود اپنے ساتھ برا کرتے ہیں..... وہ بے شک ہم سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے.....“



اور دیگر مردوں کی بے حسنی..... اور دیگر گناہ..... اس آگ کی تپش اتنی دور سے بھی میرے دل و دماغ کو جھلسائے دے رہی تھی۔ رواں رواں ناقابل برداشت حد تک سلگ رہا تھا۔ میں تپ تپ کر رونے لگا..... مگر گزرنے لگا۔ ”اگر آج اللہ مجھ سے خفا ہو جائے، مجھے دھکا کر دے، تو.....؟“ یہ سوچ کر میرا رواں رواں خوف سے لرز اٹھا۔ اگر ایسا ہو جاتا، تو کون تھا جو مجھے سہارا دیتا؟ کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی تو نہیں.....

”مجھے کر دے معاف اپنے رسول پاک کے صدقے خطائیں بخش دے میری شہ لولاگ کے صدقے میرے مالک! دعا ہے تجھے آل پیغمبر کی رہا کر دے غنوں سے، کر بلا کی خاک کے صدقے“ میرے چار سوتا رکھی پھیلی ہے..... باتال کی اتھاہ تاریکی..... کچھ بھائی نہیں دے رہا..... کچھ بھی نہیں.....

”اندھیروں میں مجھے تابندگی دے دے میرے مولا درتوبہ کو تو کشادگی دے دے میرے مولا“ میں موت کی سفاک آٹھیں سن رہا ہوں..... وہ اپنے نوکیلے بچوں میں مجھے دبوچنے والی ہے..... جکڑنے والی ہے..... میں نے کلمہ شہادت پڑھنا چاہا، مگر..... افسوس کہ.....“ مجھے کلمہ شہادت یاد نہ آ رہا تھا..... شدید ترین خوف کی ایک سہرہ، برقی لہر نے میری ریڑھ کی ہڈی میں جنم لیا اور یکبارگی پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

”یا اللہ! بے شک..... تو بہت مہربان ہے، اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ بچہ جب کوئی غلطی کرتا ہے تو ماں اسے بے شک ڈانٹتی پھونکارتی ہے، مگر جب بچہ اپنی غلطی کا احساس کر کے روتا ہے تو ماں اسے سینے سے لگا لیتی ہے۔ اور رہی سارہ..... تو اے میرے اللہ! سارہ جیسی محبوب ترین ہزاروں بہنیاں ہیں، میں تیرے اور اپنے محبوب آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دوں اور ”اف“ تک نہ

جیل نے کئی خط لکھے اسے کوئی جواب نہ ملا، لیکن وہ مایوس نہ ہوا۔ اسے آغوش سے مشورے اچھے ملتے تھے اور دل کو بھی سکون ملتا تھا۔ اب بھی کبھی اگر وہ کسی مسئلے میں الجھ جاتا تو آغوش کے پوسٹ بکس پر اسے خط ضرور بھیجتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اسے جواب نہ ملے۔ لیکن نہ جانے کیوں دل کو تسلی ہو جاتی تھی۔ جیل کا تعلق نور پور نامی گاؤں سے تھا، بچپن سے ہی اسے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک بہت اچھے گریڈ میں پاس کیا۔ اس کی ایک خالہ شہر میں معتم تھیں، وہ جیل کو بے حد چاہتی تھیں۔ چنانچہ جیل کے والدین سے بات کر کے وہ اسے اپنے ساتھ لے گئیں، تاکہ جیل اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ جیل نے کالج میں داخلہ لے لیا، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں پر بلاوجہ بوجھ بن رہا ہے۔ گاؤں میں والدین کے پاس بھی اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ جیل کی اہانت کر سکتے۔ چنانچہ جیل نے فیصلہ کیا کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی جاب بھی کرے گا۔ تاکہ کم از کم اپنا بوجھ تو خود اٹھا سکے۔ شہر میں نوکری ملنا اتنا آسان تو نہیں تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کام اس قدر دشوار ثابت ہوگا۔ اب تک اس نے اپنے خالو اور خالہ سے اس بات کو چھپایا ہوا تھا لیکن ایک دن تک آکر اس نے اپنے خالو کے سامنے بات رکھ دی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ وہ برہم ہو گئے۔ ”تم نے یہ بات کیسے سوچ لی، مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔“

”آپ..... غلط سمجھ رہے ہیں خالو جان۔“ اس نے صفائی پیش کی! ”میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے میں نے نائف کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ میں دن بھر بیکار رہتا ہوں میں کوئی جاب کروں گا تو مجھے تھوڑا تجربہ بھی حاصل ہوگا۔“ ”تجربوں کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔“ ان کا جواب تھا۔ ”نی الحال تم اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ جاب کے چکر میں پڑ گئے تو پڑھائی کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹ جائے گی۔ اس لئے نی الحال اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔“ جیل خاموش ہو گیا، لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس بات سے قطعی اتفاق نہیں ہے۔ اس کی کوشش جاری رہی، لیکن اب تک اسے کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔ اخباروں میں نوکریوں کے اشتہار دیکھ کر وہ درجنوں کے حساب سے اپنی C.V ارسال کر چکا تھا۔ لیکن بس نصیب ہی کی بات تھی، یوں لگتا تھا جیسے حامل الہذا کو سانپ سونگھ جاتا ہو۔ اپنا یہ معاملہ بھی وہ ٹیکسٹ پر اپنے محبوب مصنف آغوش سے شیئر کر چکا تھا۔ اس تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ لیکن اس نے تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ چندا سیموں کے لئے وہ انٹرویو بھی دے کر آیا تھا لیکن اس کا حاصل نادرہ۔ جب قسمت کو ہی منظور نہ تھا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ لیکن پھر اچانک ایک دن..... وہ کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کی خالہ نے ایک براؤن رنگ کا لفافہ لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”یہ کیا ہے خالہ.....؟“ ”معلو نہیں بیٹا..... ابھی ڈاک دے کر گیا ہے۔“ اس پر تمہارا ہی نام لکھا ہے..... دیکھ لو..... گاؤں سے آیا ہوگا۔“

یہ کہہ کر خالہ کچن میں چلی گئیں۔ جیل نے لفافہ کھلا کر دیکھا۔ اس پر جیل کا ہی نام درج تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا تو اندر سے ایک خوب صورت لیٹرینڈ پیپر برآمد ہوا۔ جیل نے اسے کھولا، لکھا تھا۔ ”تمہارے لئے ایک نوکری ہے..... ٹائم مچ 8 بجے سے سہ پہر 3 بجے تک..... تنخواہ 15,000/1 کام کی نوعیت دفتری امور پر مبنی ہے۔ آکر ملو کل 2 بجے نور اپارٹمنٹ نمبر 336۔“ تنخواہ تو کافی محقول تھی، لیکن انجمن کی بات یہ تھی کہ جیسے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ جیل نے کندھے اچکائے اور لفافہ جیب میں رکھ لیا، جانے میں کیا حرج ہے۔ اس نے سوچا۔ ”تنخواہ تو کافی اچھی ملے گی۔“ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس موقع کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا، اور نور اپارٹمنٹ میں اپنی قسمت آزمانے کے بعد ہی کسی اور کو اس بارے میں بتائے گا۔ چنانچہ دوسرے دن وہ گھر والوں کو بتائے بغیر روانہ ہو گیا، نور اپارٹمنٹ ڈھونڈنے میں تھوڑا وقت صرف ہوا۔ لیکن 2 بجے سے قبل ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ یہ ایک کاروباری مرکز تھا۔ یہاں زیادہ تر دفاتر بے ہونے تھے۔ ایک پرنٹنگ پریس کے برابر میں 336 موجود تھا جیل نے دنگ دینا چاہی تو دروازہ کھلا چلا گیا۔ وہ ذرا الجھ گیا اور پھر اندر داخل ہو گیا سامنے ایک شخصے کا کمرہ دکھائی دیا۔ جیل اس کے قریب پہنچا تو مائیک سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ”اندرا جاؤ مسٹر جیل.....!“ وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن تھا کون.....!! ”دور نہیں مسٹر جیل..... اندر آ جاؤ.....“ تھی۔

پھر آواز آئی۔ جیل یہ سن کر آفس کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایک خوب صورت سی میز تھی، جس کے عقب میں ایک ریو لوگ چیز رکھی تھی ان دونوں کے برابر میں دو چھوٹی کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ ماحول بے حد صاف تھرا تھا۔ ”ایک کرسی پر بیٹھ جاؤ مسٹر جیل.....“ وہی آواز پھر آئی۔ اب کی باریوں لگا جیسے بہت قریب سے کہا گیا ہو۔ ”آپ..... آپ کون ہیں.....؟“ جیل کے منہ سے نکلا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے.....“ آواز آئی۔ ”کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور اگر تم اس جاب پر آمادہ ہو جاتے ہو تو پھر کل سے یہ کرسی تمہاری ہوگی۔ تم اس کرسی پر بیٹھ کر دفتری معاملات سنبھالو گے۔“ ”آپ کون ہوں..... اور کہاں ہیں.....؟“ جیل نے پھر پوچھا۔ ”آرام سے بیٹھ جاؤ.....“ کہا گیا۔ ”یہ سب کچھ اتنا دشوار گزار نہیں ہے۔“ جیل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اب بتائیں آپ.....!“ جیل نے فوراً اپنی بات دہرائی۔ ”میرے بارے میں اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ آواز میں ہلکی سی ترشی درآئی۔ ”اور نہ تم سے کوئی غیر قانونی کام لیا جائے گا، کہ تم کسی دشواری میں پڑو۔ تمہیں کام کی نوعیت بتائی جا رہی ہے۔ اگر منظور ہو تو کل سے آفس جوائن کر لیتا۔ آفس کی چابی تمہیں اسی ٹیبل کی دراز میں مل جائے گی۔ اوکے.....!“ جیل نے احمقانہ انداز میں سر ہلا دیا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ کام کی نوعیت کچھ خاص نہ تھی۔

طلسماتی انگلی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یعنی، بکھراج، لاجورد، نیلم، زمرہ، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگلی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے نیچے رکھنے سے لڑائی کا غم، جادو کس نے کیا، بکار و بار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نا فرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، حج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، کلیت یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردود عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگلی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سٹیشن

یا لمقابل سندھ مدرسہ کراچی

جو کہیں..... یہ برقعہ پوش اور نقاب لگائی ہوئی عورت یقیناً اس کی باس تھی۔
آج وہ آفس میں آئی تھی، اور اسی وجہ سے جمیل اپنا نام ختم کرنے کے بعد گمراہ نہیں گیا تھا۔
برقعہ پوش عورت نے باہر آ کر ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کیا، جمیل صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ عورت اپنے جسم کو پوری طرح سے چھپائے ہوئے تھی۔ صرف..... آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔
جمیل نے خود کو اس رخ پر رکھا تھا کہ عورت اس سے بے خبر تھی۔ وہ سامنے موجود ایک جائے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا۔
جیسے ہی وہ ٹیکسی میں بیٹھی، جمیل بھی ایک دوسری ٹیکسی کی طرف لپکا۔
اس نے جاسوسی ناول بھی پڑھ رکھے تھے۔
اور ان ہی کہانیوں کا تجزیہ آن تجربہ بن گیا تھا۔
ٹیکسی ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گنا گرایہ ملنے کی لالچ نے اس کی زبان کو تال لگا دیا۔
پھر یوٹی کامیابی سے تعاقب شروع ہو گیا۔
آخر کار کوئلہ کالونی کے ایک مکان کے پاس اگلی ٹیکسی رک گئی۔
جمیل کی ٹیکسی آگے نکلتی چلی گئی اس نے مرکز دیکھ لیا تھا کہ وہ عورت کس مکان میں داخل ہو رہی ہے۔
"بس۔۔۔ اب تم بھی ٹیکسی موڑ لو۔۔۔" جمیل نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ "مجھے اس مکان کے قریب اتار دیتا۔"

ڈرائیور نے سر ہلا دیا۔
جمیل کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہا، وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔
اس کا دل دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس راز پہ سے پردہ اٹھا دیتا چاہیے، جبکہ دل کا دوسرا حصہ جسے میں ڈرتا، پچھلیا ہٹ تھی اور ہلکا سا

وہ اپنی کرسی پر بیٹھا، تو تھوڑی دیر بعد کمرے میں آواز گونجی۔
"مزنر ٹیل۔۔۔ اگلے ہفتے تمہیں شہر سے باہر جانا پڑے گا۔"
"آپ کا ہی کام ہوگا۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔
"ظاہر ہے۔۔۔" آواز آئی۔
"ٹھیک ہے۔۔۔" اس نے سر ہلایا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "کیا آپ مجھے دیکھ رہی ہیں میڈم۔۔۔!"
"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔؟"
"دراصل۔۔۔" اس نے کان کھجایا۔ "میں آپ کو نہیں دیکھ پا رہا۔"
"جمیل صاحب۔۔۔" آواز اچانک ہی ختم ہو گئی۔ "آپ آم کھاؤ۔۔۔ گھٹلیاں مت گنو۔۔۔ اوکے۔۔۔؟"
"میڈم۔۔۔ آخر پردے میں رہنے کی وجہ کیا ہے۔۔۔؟ آپ سامنے کیوں نہیں آتیں۔۔۔؟" جمیل نے پھر کہا۔
"تو کرسی سے آپ کا دل تو نہیں بھر گیا۔؟"
چہچہے ہوئے لبے میں کہا گیا۔ "اگر ایسی بات ہے تو میں کوئی اور انتظام کر لوں۔۔۔؟"
"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آئی ایم سوری۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔! اس کے باوجود جمیل کا تجسس برقرار رہا۔ اب وہ اپنے پراسرار ہاس کا پیدار کرنے کے لئے بڑی طرح بے چین تھا۔
اور پھر اس نے سوچ لیا کہ کیا کرنا ہے۔۔۔ اب وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔
اب وہ اس دن کے انتظار میں تھا، جب باس آفس میں آئی تھی۔۔۔۔۔ وہ دن۔۔۔!
آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد بھی آج جمیل اس اپارٹمنٹ کے گرومنڈار رہا تھا۔
اور پھر اس کے دل کی دھکنیں تیز

اسے پنجے میں 2 یا 3 دفعہ کچھ پارسل ملتے تھے، جن پر پتے درج ہوتے تھے وہ ان پارسلوں کو وہاں پہنچاتا تھا اور وہاں سے جو دستی لفافے ملتے تھے ان کی میٹرس کھولے بغیر انہیں میز کی بجلی دراز میں رکھ دیتا تھا۔
بس یہی کام تھا۔ باقی تو یہاں کھیاں بھی نہیں تھیں کہ جنہیں مار کر وہ اپنا نام پاس کر لیتا۔
وہ اپنے خالو اور خالہ کو آگاہ کر چکا تھا کہ اسے ایک آفس میں جاب مل گئی ہے۔
چنانچہ اب وہ بڑے مزے سے اس پراسراری جاب کو خوش اسلوبی سے نبا رہا تھا۔
اس دوران وہ اندازہ کر چکا تھا کہ اس کی نادیہ باس کا تعلق کھینے لکھانے کی دنیا سے تھا۔
جمیل کو اس وقت آغوش کی بھی بے حد یاد دہائی۔ نہ جانے کیوں اب وہ اس سے کوئی رابطہ نہیں کر رہا تھا۔
"شاید وہ اب مفرد ہو گیا ہے۔ ہاں۔۔۔ یہی بات ہوگی۔"
"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔" اس نے ایک سرد آہ بھر کر سوچا۔ اور پھر اپنے پراسرار ہاس کے ایک پارسل کی طرف متوجہ ہو گیا۔
لیکن۔۔۔ تجسس انسان کی فطرت ہے۔ جمیل کو تنخواہ سے مطلب تھا۔ جو اسے اپنے وقت پر مل رہی تھی۔
اس کے باوجود وہ اپنے ہاس کے طریقہ کار سے شدید الجھن میں مبتلا تھا۔
پنجے میں صرف ایک دن اسے باس کی آواز سنائی دیتی تھی، اور اس دن اسے صبح دفتر کا دروازہ کھلا ملتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس دن خود آیا کرتی تھی۔
آج بھی وہی دن تھا۔ جمیل نے آج فیصلہ کیا تھا کہ اپنی باس سے اس کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔
اس کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ لیکن آج اس نے کمر باندھ لی تھی۔

وہ اپنی پاس کا ٹھکانا چاہتا تھا، اور عین ممکن تھا کہ اسے اسی وقت لو کرے سے نکال دیا جاتا۔

ول و وارغ کی اس جنگ میں بلا آخر جیت انسانی جیت کی ہوئی..... محسوس..... کھوج اور سراسر انے اسے مجبور کر دیا کہ وہ دروازے کی نکل بھاوے۔

اس کا ہاتھ اٹھا اور اس نے اپنی انگلی سے بٹن پریس کر دیا۔

اندرونی حصے میں گھنٹی کی آواز کا ارتعاش گونجا، جیل کا دل دھڑکنے لگا۔

پھر قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند ہی لمحوں بعد ایک جانی پیچائی آواز سنائی دی۔

”کون.....؟“

یہ..... یقیناً اس کی پاس کی آواز تھی۔

اس آواز کو سنتے ہی جیل کے دل کا عجیب حال ہو گیا، اس کی ہمت جواب دینے لگی۔

زبان گویا ٹمک رہ گئی تھی پھر بے ساختہ وہ پیچھے ہٹا اور وہاں سے نکل بھاگا۔

اس وقت اسے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ اس نے اتنی سخت اور اپنی اتنی تک وہ دو پر غور ہی پانی پھیر دیا تھا۔

گھر پہنچ کر جیل کو خود اپنے آپ سے ہی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی بھی کیا بزدلی.....! ہونہ..... وہ دل دہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔

آج اس کا کالج جانے کا بھی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بہت پابندی سے کالج جاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ خالہ پوچھ بیٹھیں۔

”کالج نہیں جا رہے.....؟“

”نہیں خالہ بی.....“ اس نے طویل سانس لی۔

”آج دل نہیں جا رہا.....“

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....؟“

”جی..... جی ٹھیک ہے.....“ اس نے جلدی سے کہا۔

”جائے بنا دو.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی خالہ..... دل کی بات کہہ دئی آپ نے“

خالہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، جیل نے ان کے جاتے ہی کاغذ قلم سنبھال لیا۔ اسے اپنی کیفیت سے آغوش کو آگاہ کرنا تھا۔ یہ ہفتہ بہت تیزی سے گزرا تھا، آج پھر باس کے آنے کا دن تھا۔ اسے امید تھی کہ آج آفس کھلا ہوا ملے گا، لیکن خلاف توقع اسے آفس کا دروازہ خود ہی کھولنا پڑا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ آج میڈم نہیں آئیں گی۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ خیرہ دیکھا جائے گا۔ وہ اپنی میز پر پہنچا۔ اس نے روزنامہ سچو دیکھنے کے لئے دروازہ کھولی دراز میں آج بھی پارسل موجود تھا۔ لیکن یہ کیا.....؟ وہ چونک اٹھا۔ اسے لئے والے تمام پارسل سر بہ مہر ہوتے تھے۔ لیکن یہ پارسل کھلا ہوا تھا۔

”تو کیا..... آج میڈم سے غلطی ہوگئی؟“ اس نے دھڑکتے دل سے سوچا۔ پھر جلدی سے اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور لگانے میں ہاتھ ڈال دیا۔ یہ ہاتھ سے لکھا ہوا افسانہ تھا۔ اور عنوان کے نیچے مصنف کا نام لکھا تھا..... ”آغوش“

اس کا دل دھچک سے رہ گیا..... ذہن میں آنہریاں سی پلٹنے لگی تھیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جس میڈم کے پاس وہ ملازمت کر رہا تھا اس کا کچھ نہ کچھ تعلق آغوش سے ضرور تھا، ورنہ پارسل میں موجود اس تحریر کے کیا معنی ہو سکتے تھے۔

اس وقت جیل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، وہ بار بار مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور پھر اس طرح چاروں طرف دیکھتا، جیسے میڈم ابھی اسے مخاطب کرے گی اور وہ اسے بہت سارے سوالات کر ڈالے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ آج میڈم کو وغیرہ حاضر تھی۔

بہر حال اس نے خود کو سنبھالا اور پارسل کو سیل کرنے لگا۔ یہ اس کی ملازمت کا حصہ تھا کہ پارسل کو اس پر لکھے ہوئے پتے پر پہنچا دیا جائے۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ اٹھا اور پارسل کو سنبھال کر آفس سے باہر نکل آیا۔ پھر پیسے ہی وہ صدر دروازے تک پہنچا۔ اس نے دیکھا دروازے میں ایک کاغذ اٹکا ہوا تھا۔

جیل نے اسے نکال لیا، کھولا تو اس پر لکھا تھا۔

مسٹر جیل.....! میں آج تمہیں یہ بات بتا رہی ہوں کہ میں تمہاری پسندیدہ مصنفہ آغوش ہوں میں کوئی مرد نہیں، ایک عورت ہوں۔۔۔۔۔ تم مجھ سے اپنی بہر بات شکر کرتے ہو۔۔۔۔۔ تم جاب کے لئے پریشان تھے، میں نے تمہیں اپنے پاس ملازمت دے دی۔ کیونکہ میں خود بھی اب ایک سہارے کی محتاج ہوں۔۔۔۔۔ میں اب خود کسی کا سامنا نہیں کر سکتی۔

میں آج تم سے اپنی ایک بات شکر کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اور وہ یہ کہ۔۔۔۔۔ میں..... اپنا چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں ہوں..... 5 سال قبل ایک حادثے میں میرا چہرہ چل گیا تھا۔

یہ بات میں تم کو بتا رہی ہوں۔۔۔۔۔ اور اسی وجہ سے میں نے خود کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔

اب تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ کیونکہ مجھے دیکھ کر تم مجھ سے دور بھاگو گے، مجھ سے نفرت کرو گے۔

فقط آغوش۔

یہ انکشاف جیل کے لئے کسی دھماکے سے ہرگز کم نہیں تھا، وہ تو اپنے محبوب رائٹر کو آج تک مردی سمجھتا رہا تھا۔

اب ساری باتیں سامنے آ چکی تھیں۔ آغوش کی تحریروں نے اسے انسانیت کا درس دیا تھا، اسے زندگی کے رموز سکھائے تھے۔

ذہن میں عقل و شعور کے طبق کھولے تھے۔

مشورے دیتے تھے اور انجمنوں سے نکالتا تھا۔

وہ اکثر اپنے اہم فیصلے آغوش پہ چھوڑ دیتا کرتا تھا اور اس کے جواب کا انتظار کیا کرتا تھا۔

اگر آج دی آغوش کسی مشکل میں گرفتار تھی تو اب اس کا بھی فرض تھا کہ وہ آغوش کی مدد کرے۔

آج اسے ہر صورت میں آغوش سے ملنا تھا۔۔۔۔۔ ابھی اور اسی وقت۔۔۔۔۔

یہ فیصلہ کر کے وہ صبح دروازے سے باہر نکل گیا۔

جیل نے نیل بجائے اور انتظار کرنے لگا۔ جلد قدموں کی آہٹ ہوئی۔

”کون ہے۔۔۔؟“

”میں جیل ہوں۔۔۔۔۔“

سانا سا چھا گیا۔

”دروازہ کھولے آغوش۔۔۔۔۔“ جیل نے پھر کہا۔ ”میں۔۔۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”واپس چلے جاؤ۔۔۔“ آواز آئی۔ ”میں نے تم کو معاف کیا تھا۔۔۔۔۔ پھر تم کیوں مجھ سے ملنے آئے ہو۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔“

”میں آپ سے مل کر ہی جاؤں گا۔۔۔۔۔“ جیل کا لہجہ مضبوط تھا ”ورنہ وہ پہرے سے شام تک اور شام سے رات تک یہیں کھڑا ہوں گا۔“

”تم ضد کیوں کر رہے ہو۔۔۔؟“ غصہ بھری آواز آئی۔ ”میں تم کو اپنے بارے میں بتا چکی ہوں۔۔۔۔۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔“ جیل کا جواب تھا۔ ”آپ ہی کی ایک کہانی میں ایسا ہوا تھا اور ہیر و نے ہیر و کی کو اپنا لیا تھا۔“

”میں عمر میں بھی تم سے بڑی ہوں۔۔۔۔۔“

”یہ بھی کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔۔۔۔۔“ جیل کا جواب تھا۔ ”اب ہمارے معاشرے میں یہ چیز عام ہے۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔“

”دیکھو۔۔۔۔۔ قماش مت بناؤ۔۔۔۔۔“ اندر سے حنیہ کی گئی۔ ”آس پاس والے سنیں گے تو کیا



عشق حیات ہے

اقصیٰ رباب- فیمل آباد

خوبرو حسینہ تابوت میں مردہ پڑی تھی کہ اس پر سحر
بھونکتے ہی وہ کسمساکر اٹھ بیٹھی اور اپنے گرد و پیش کا
جائزہ لینے لگی افسانہ میں ایک عجیب الخلق کریمہ آواز نکالتی
بگڑوح حاضر ہوئی اور پھر۔۔۔

چاہت دلوں سے سرشار ایک نوجوان کی روداد جس نے محبت کی خاطر موت پر غلبہ پایا

میرا نام منسل ہے۔ میں اپنے والدین کے
ساتھ لاہور مجھے پیارے شہر میں رکتی ہوں۔ ابھی میں نے
بی بی اسے کیا ہی تھا کہ میرے بابا جانی کے بچپن کے دوست
ہمارے گھر آئے وہ اور ان کی سز مجھے بہت چاہتے
تھے۔ (میری طرح ان کا بھی ایک ہی بیٹا تھا۔ جمال
احمد، ہم دونوں ہی اکلوتے تھے میرے والدین کو ایک بیٹے
کی چاہ تھی جبکہ میرے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد نہ

سے محروم رکھا۔ یوں وہ جب بھی جمال سے ملنے آئیں لگتا
وہ ان کا ہی بیٹا ہے ادھر اٹکل، آنٹی بی بی کی چاہ میں دیوانے
تھے۔ آنٹی، اٹکل جب بھی آتے میرے لئے ڈھیروں
شاپنگ کرتے اور مجھے ہمیشہ ڈھیروں تحائف دیتے اس
مرتبہ بھی وہ دونوں میرے لئے ڈھیروں چیزیں لائے۔
بابا جانی نے کہا۔ ”منسل! اپنے اٹکل آنٹی کے کھانے
پینے کا انتظام کرو۔“ میں لیکن میں آگئی۔ میں نے کھانا

رہے۔
مجھے بھی ایک ساتھی کی تلاش تھی۔ اس لئے
میں نے جہیں ملازمت دے دی۔ اس سے مجھے بھی
آسانی ہوگئی۔ اسی فلیٹ میں دوسری طرف میرا کمرہ
بھی ہے، جہاں سے تم سے بات چیت ہوتی ہے۔
آؤ۔۔۔ اندر آ جاؤ۔۔۔ مجھے اب خیال آیا ہے کہ تم بہت
دیر سے باہر کھڑے ہو۔ آ جاؤ۔۔۔!“
”نن۔۔۔ نہیں۔۔۔“ جمیل نے بوکھلائے
ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں چلتا ہوں۔۔۔ کل آپ
آفس میں آئیں گے۔۔۔ م۔۔۔ میرا مطلب ہے
آؤ گی۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ آج میرا آنا نہیں ہوا تھا۔۔۔
“آغوش نے کہا۔ ”کل تو آنا پڑے گا۔۔۔“
”بس پھر۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔“ جمیل نے جلدی
سے کہا۔ ”وہیں ملاقات ہوگی۔۔۔“
وہ اگلے قدموں محوم گیا، پھر اٹکل ہی اسے
کچھ یاد آیا وہ پلٹا اور ایک فحالت بھری شکر اہٹ کے
ساتھ آغوش کی طرف دیکھ کر بولا۔
”اب تو نایتیک پر بات نہیں ہوگی ناں۔۔۔؟“
آغوش نے جلدی سے ایک جملہ کہا اور دروازہ
بند کر لیا وہ جملہ تھا۔
”اب باقی کیا رہ گیا ہے؟“

جمیل نے وہاں سے سر پٹ دوڑ لگائی۔ ابھی
اسے یہ فیصلہ بھی کرنا تھا کہ اسے جا ب کرنی ہے یا
پڑھائی۔

کیونکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جا ب کرنے کے
بعد وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا اور دیے بھی اس
کے خالو اور خالہ اس کی جا ب سے ناخوش تھے۔
بات یہ تھی کہ راہ فرار اختیار کرنے کے لئے کوئی
مخفیہ راستہ بھی تو چاہئے ہوتا ہے۔
جمیل کو اب اسی راستے کی تلاش تھی۔



”سوچیں گے۔۔۔“
”موت تو آپ دے رہی ہیں۔۔۔ کھول دیں
دروازہ۔۔۔“
”اچھا۔۔۔ بابا۔۔۔ لو۔۔۔“
ان الفاظ کے ساتھ ہی کھٹ سے دروازہ
کھلا۔۔۔ اور۔۔۔ پھر۔۔۔
حقیقت سامنے آگئی۔۔۔ جمیل کے خواب ریاہ
ریزہ ہو کر بکھر گئے۔
وہ پلکیں جھپکائے بغیر آغوش کو دیکھ رہا تھا۔ آج
دہی آغوش اس کے سامنے تھی
جسے اس نے ہمیشہ اپنی خوشیوں اور غموں میں
شریک رکھا تھا۔ اور آج وہ اسے اپنانے کا فیصلہ
کر کے آیا تھا۔
لیکن۔۔۔ اس نے اپنے بارے میں جھوٹ
بولتا تھا کہ اس کا چہرہ جلا ہوا ہے۔
اس کا چہرہ صاف شفاف تھا۔۔۔ البتہ اسے
دیکھتے ہی جمیل پر یہ راز کھل گیا کہ نہ وہ عورت تھی اور نہ
مرد۔۔۔ وہ تیسری جنس تھی۔
جمیل کے جسم میں تو جیسے کانٹوں تو لہجہ نہیں دانی مثل
ثبت ہوگئی تھی۔۔۔ دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔
اس کے برعکس آغوش کے چہرے پر ایک طنز یہ
سی مسکراہٹ قہقہہ کر رہی تھی۔
اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔
”اب بولو۔۔۔ کیا تم اب بھی مجھے
اپناؤ گے۔۔۔؟“
”میرا تعلق تیسری جنس سے۔۔۔“ آغوش
کے ہونٹ ملے۔ ”اور اب یہ بات شاید تمہیں معلوم
ہے نہ مجھے سے کوئی دوستی کر سکتا ہے، اور نہ شادی۔۔۔
میں صرف اپنی تحریروں میں زندہ ہوں۔۔۔ تمہارے
خطوں نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا، اسی لئے
میں نے تم سے ملنے کی رشتہ توڑ دیا تھا۔۔۔ کیوں کہ مجھے
اپنے بارے میں معلوم تھا۔۔۔ اس کے باوجود تم مجھے
خط لکھتے رہے۔۔۔ اور اپنے حال سے آگاہ کرتے

تیار کر لیا تو ذرا رنگ روم کی طرف مٹی کی کڑی کو اطلاع دے سکوں کھانا تیار ہے۔ مگر اندر سے آتی آوازوں نے میرے قدم روک لئے۔

”بابا جانی کبہ رہے تھے۔“ مناجات تو ابھی چھوٹی ہے یا۔ اتنی جلدی شادی۔“

انکل بولے۔ ”پھر کیا: وا۔ اسے ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر ہی تو جانا ہے۔ کیوں ٹکر کرتے ہو۔“ وہ تو جیسے سب تہیہ کر کے آئے تھے۔ میرے والدین کو سنا کر چھوڑا۔

ای نے مجھے آواز دی۔ میں اندر داخل ہوئی اتنی نے میری انگی میں ایک خوبصورت انگٹھی پہنا کر مجھے گلے سے لگالیا۔ میں اپنے کمرے میں آگئی شادی دو ماہ بعد رکھی گئی۔ دو ماہ تو جیسے پر لگا کر اڑ گئے اور مہندی کا دن بھی آ گیا میرا دل گھبرا رہا تھا مہندی کی رسومات کے اختتام تک میں تھک چکی تھی۔ اسی مجھے آرام کرنے کے لئے کمرے میں چھوڑ آئیں۔

میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ میں کبھی شاید کزنز میں سے کوئی ہے۔ میں آنکھیں بند کئے سوئی جاگتی کیفیت میں تھی کہ ایک دم جیسے کوئی میرے بیڈ پر بیٹھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی پوری کوشش کی مگر میری آنکھیں نہ کھلیں، سانس جیسے سینے میں اٹک گیا۔ پسینے سے سارا جسم شرابور ہو گیا۔ زور لگانے کے باوجود نہ تو میری آنکھیں کھل رہی تھیں اور نہ ہی سانس بحال ہو رہا تھا۔ کہ اچانک ایک آواز آئی۔ ”تم یہ سب اتنا ہی آسان سمجھ بیٹھی ہو۔“

ساتھ ہی میں نے پورا زور لگایا اور اٹھ بیٹھی۔ میرا سانس بحال ہو گیا۔ میں جگت میں کمرے سے باہر بھاگی۔ اور فرنگ میں سے خنڈے پانی کی بوتل نکال کر پانی پینا شروع کر دیا، میں نے صدر کے مینشن اور رباب کو اپنے کمرے میں سلایا۔ پھر ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

بارات بہت دھوم دھام سے آئی۔ نکاح کے

بعد کھانے سے فارغ ہوئے تو بارات نے واپسی کا قصد کیا۔ اور میں روتی دھوتی اپنے بائیں کے گھر سے آئی، انکل کے گھر آ گئی۔

☆.....☆.....☆

میرے ہاؤس پر سرور کے جو بیٹھی نیند سو رہی ہے یہ میری پیاری سی بیوی مناجات ہے۔ یہ خوبصورت وجود آج میری زندگی کا مستقل حصہ بن گیا ہے۔ میرا نام بہال احمد ہے۔ مناجات میرے پاپا کے عزیز دوست کی اکلوتی بیٹی ہے ہمارا بچپن انکسٹھ کھیلنے گزارا۔ مناجات جب پانچویں اور میں ساتویں جماعت میں تھا پاپا کا ٹرانسفر ہو گیا۔ سو ہمیں لاہور چھوڑنا پڑا۔ لاہور سے زیادہ مناجات کو چھوڑنے کا دکھ تھا۔ مناجات کا نام بھی میں نے رکھا تھا۔ اور تب سے مناجات پر صرف اپنا حق سمجھتا تھا۔

اپنا بزنس شروع کرتے ہی میں نے ماما پاپا سے کہہ کر مناجات کے رشتے کے لئے بھیجا اور خود تودھا ہو گیا۔ اور پھر ماما نے فون پر جب مجھے خوشخبری سنائی کہ مناجات کی انگی میں میرے نام کی انگٹھی پہنائی تو مجھے لگا میری زندگی مکمل ہو گئی۔

وہ دن بھی آ گیا جب مہندی کی رسم ہوئی فائوس کے نیچے مہندی کا سارا سامان پڑا تھا کہ اچانک فائوس گر اور سارا سامان بکھر گیا۔ بارات والے دن میں نے آف وائٹ سوٹ پر براؤن شیر وائی پٹنی ماموں گھوڑا لے آئے کہ مسجد میں جانے کے لئے دولہا گھوڑے پر بیٹھے جیسے ہی میں گھوڑے پر بیٹھا گھوڑے کو بجانے کیا ہوا کہ فل اسپید میں بھاگ کھڑا ہوا۔ بڑی مشکل سے میں گھوڑے پر قابو پا سکا مگر اچانک میں گھوڑے سے گر گیا۔ میرے کپڑے خراب ہو گئے۔ مجبوراً میں نے قمیڑیں سوٹ پہنا کچھ بزرگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ بد شگون ہے۔ اب میری مناجات اپنے ہوش و باسن کے ساتھ میرے پہلو میں نیند کے حشرے لے رہی ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ شادی بخیر و خوبی انجام پاگئی۔

علیٰ انج دروازے پر دستک ہوئی جمال نے دروازہ کھولا انکل آئی سانس کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا

انہوں نے بہت محبت سے جواب دیا اور دھیر دھیر دل خوشیوں کی دعا کہیں دیں۔ یوں پیار و محبت میں دن گزرنے لگے۔ تین ماہ ہو گئے میری شادی کو کہ اچانک ایک رات وہی منبیدی والا واقعہ پھر ہوا۔ ویسے ہی مجھ کو سانس آنا بند ہو گیا۔ بائیں منٹ تک یہی کیفیت رہی بڑی مشکل سے میں اٹھ کر بیٹھی سانس بحال ہوا آنکھیں کھلیں تو دیکھا جمال کی جگہ ایک بوسا سانس میری طرف دیکھ رہا ہے میری چپٹیں نکل گئیں۔ سب گھر والے بھاگے آئے آنٹی نے کچھ میں خواب میں ڈھکی ہوں جمال بھی حیران تھا۔ اب تو ہر دوسرے دن میرے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ خوف سے میرا کھانا پیانی کم ہو گیا تھا۔ دل گھبرانے لگتا آئی میری طبیعت کو دیکھتے ہوئے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر عدیلہ کافی قابل اور سمجھدار تھیں۔ مجھے انہیں سب بتانا پڑا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے آنٹی بھی مگر غصہ نہیں۔ انہوں نے چیک اپ کیا اور آئی سے بولیں۔ ”مبارک ہو۔ آپ داوی بننے والی ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”اس حالت میں اکثر اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ برے برے خواب آتے ہیں۔ کوشش کریں نہیں اسکیلے نہ رہنے دیں۔“

ایک دن میں اپنے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی کہ مجھے اچانک وہی آواز سنائی دی۔ ”بہت ڈھیت ہو۔“ جمال کا چپچہای نہیں چھوڑ رہی اب اس کا ایک ہی حل ہے۔ میں تمہارے جسم میں آ کر ٹیسٹ کروں اور تمہیں اگلے جہان پہنچا دوں۔“

وہ جیسے ہی میرے قریب آئی اسے ایک جھٹکا لگا اور غرا کر پیچھے ہٹی۔ اور بولی ”میری غیر موجودگی میں تم نے یہ خیال پہلی کراہے غلط فہم میں آئے والے مہمان کو جگہ دی میں کیسے غافل ہو گئی اب میں تمہارے جسم میں اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک یہ آنے والا مہمان دنیا میں نہیں آ جاتا۔ مگر اب میں تمہیں جمال کے پاس برداشت نہیں کر سکتی اب دیکھو میرا تماشہ۔“

یہ کہہ کر اس نے جیسے میرا سانس میرے حلق میں روک دیا۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے۔ مگر میرا ذہن تار کیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔

مگر یہ کیا میں نہ ٹوٹ سکتی تھی۔ نہ بول سکتی تھی صرف میری آنکھیں کھلی تھیں جو سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اچانک مجھے ای کی آواز سنائی دی وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”میری مناجات کو کیا ہو گیا ایک دم۔“

جمال وھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ میں زندہ تھی اور مجھے مردہ سمجھا جا رہا تھا بہت کوشش کی کہ کسی طرح من سے آواز نکال کر بتا سکوں مگر بے بسی ہی بے بسی تھی کہ میرے سامنے سب چارے میرے لئے روپیٹ رہے تھے اور میں جیسے کوئی بوچھاڑ تھی میری آنکھیں سب نے بند کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری آنکھیں نہ بند کر سکے یوں مشورہ ہوا کہ شاید میں آخری دیدار کی طرح اس گھر کو اور اس گھر کے لوگوں کو اپنی کھلی آنکھوں میں بسا کر قبر کے اندر دوسں میں ساتھ ہی لے جانا چاہتی ہوں اور پھر میرا کفن تیار ہو گیا اور کچھ بزرگ عورتوں نے مجھے تختہ پر لٹا کر نہلا تا شروع کر دیا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی کہ عورتیں مجھے نہلا رہی تھیں اور ای جان اور آنٹی جی مجھ پر نیم گرم پانی ڈال رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ روتے روتے طے کا دور کر رہی تھیں پھر مجھے کفنایا گیا۔ مجھے تابوت میں رکھ دیا گیا بہت بولنے کی کوشش کی مگر بے سود اور اپنی بے بسی پر میری آنکھوں سے دھانسو تھے جو دوسروں کی نظروں سے تو پوشیدہ تھے مگر جمال جو مجھے ایک تک دیکھ رہا تھا اس سے چھپ نہ سکے اور اس نے وہ آنسو اپنی اکھیں کی پوروں سے سیٹھ لئے اور میرا دل دھڑکنے لگا کہ میرا جمال میری آنکھوں میں دیکھ رہا ہے اب وہ جان جائے گا کہ میری آنکھیں بے جان نہیں۔

اور یہی ہوا جمال پاس کھڑے انکل نصر سے کہنے لگا۔ ”دیکھیں پاپا آپ کو مناجات مردہ لگی ہے مجھے تو میری مناجات زندہ سلامت لگتی ہے۔“ میں خوشی سے کھل اٹھی کہ حقیقت کھل جائے مگر سب جمال کو میرے تابوت سے علیحدہ کر دیا کہ کہہ کر۔ ”بیٹا صبر کو جانے والے لوٹا نہیں کرتے۔“ اس کے ساتھ ہی سب نے میرا آخری دیدار کرنا شروع کر دیا اور اچانک لوگوں نے تابوت اٹھایا۔ اور میرے کانوں میں وہی زہریلی

آواز گونجی۔ آخری بار سب کو دیکھ لو، میں تمہیں کچھ عرصہ کے لئے ہجرم کے جذبات سے عادی کر رہی ہوں کہ تم قبر کی اندھیری ندی کی گویہ میرا احسان ہے تم پر۔“ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اور دوبارہ جب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں اسی تابوت میں لپٹی ہوئی تھی اور ایک پورا دن گزر چکا تھا مگر اب دن کی روشنی میری نظروں کے سامنے تھی تابوت کا ڈھکن کھلا ہوا تھا اور میرا وجود اس میں پڑا ہوا تھا۔ جب پھر وہی زہریلی ڈوبی نسوانی آواز سنائی دی۔ میری دنیائیں خوش آمدید۔“

میں نے بولنے کی کوشش کی تو حیرت انگیز طور پر میری آواز میرے حلق سے نکلنے میں نہ پوچھا۔“ تم کون ہو اور یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ مجھے میرے گھر جانے دو۔“ تو اس کے منہ سے خوف ناک قہقہہ برآمد ہوا اور اس نے کہا۔“ کہاں جانے دوں، مگر وہ گھر میرا ہے غلطی سے تم اس میں آباد ہو گئی تھی اور میں کون ہوں؟ میں شاہ جنات کی بیٹی ہوں آج سے سات سو سال پہلے میں اپنے والدین کے ساتھ بہت خوش و خرم رہتی تھی جب میں نے ایک خوبصورت نوجوان کو دیکھا وہ بہت خوبصورت بہادر اور جیالا، میں نے جب اسے دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی پھر تو میرا یہ معمول بن گیا کہ میں روز انداز اس کی راہ میں آنے لگی۔

وہ میری محبت میں گرفتار ہو ہی جاتا اگر تم اس کے سامنے نہ آتی ہاں کل کی شہزادی مہر دوش اور آج کی مناتل مجھے سمجھ نہیں آتی اپنے پیار کی قاتل کو کیا نام دوں۔

ہاں تو پھر تم اس کے راستے میں آ گئی اور وہ تمہارے حسن کے جال میں پھنس گیا۔ میرا بہادر اور خوبصورت اطفال، پھر میں نے سر توڑ کوشش کی اپنے پیار کو پانے کی۔ مگر تمہارا جادو اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں نے اسے پانے کے لئے کیا کچھ نہ کیا، اپنا گھر اپنے والدین چھوڑے جو مجھے اپنی جان سے عزیز تھے اور اس بے وفا نے ایک دم کہہ دیا کہ ”وہ مہر دوش کو چاہتا ہے اور اس سے شادی کرے گا۔“

میں اس وقت پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی جب میں نے اسے دھوکے سے وہاں بلایا تھا مہر دوش بن کر کیونکہ والدین سے ناراضگی پر میری تمام قوتیں ختم ہو گئی تھیں اور میں ایک عام لڑکی بن گئی تھی اور میں اطفال کے لئے اتنی قربانی دینے کے بعد اسے تم جیسی خوبصورت چہرے کے لئے کیسے چھوڑ دیتی۔ خوش خوش وہاں تم سے ملنے کے لئے آیا میں اس کی طرف پشت کئے کھڑی تھی وہ اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا اور میں خوشیوں سے سرشار تھی جب اس نے مجھے کندھوں سے تھا میری ساری قربانیاں شرمناک نہیں مگر جیسے ہی اس نے میری طرف دیکھا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا ابھی جس کے لہجے میں پھول برس رہے تھے وہی زبان اب انگارے برسانے لگی۔

میں نے اپنے پیار کا واسطہ دیا اس پر اثر نہ ہوا اور جب میں نے تمہیں گالیاں گونسنے دے کر دھمکی دی کہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی تو وہ غصے میں پاگل ہو گیا اس نے مجھے پہاڑی سے نیچے دھکا دے دیا اور میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے اڑتی ہوئی زمین پر آ گری، گرتے ہی میری گردن کی ہڈی ٹوٹی اور میں مر گئی۔ میرے والدین کو جب پتہ چلا تو وہ روتے پینتے مجھے اٹھا کر لے گئے پھر میری روح اسے شہزادے سے ملنے کے لئے جسم سے نکل کر اورد گرد بھٹکتی لگی۔

اس دن تمہاری شادی اطفال سے ہونے والی تھی اور میری روح سب ڈرامہ دیکھ رہی تھی میں روتی جھپٹی اپنے گھر آئی تو میری آہ و زاری میری والدہ سے برداشت نہ ہو سکی تو انہوں نے مجھے میری کھوئی ہوئی طاقت واپس کر دی اب میں سب کچھ کر سکتی تھی۔

میری والدہ نے طاقت واپس کرتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ہر ماہ چودھویں کی رات سے ایک دن پہلے گوہ جالوت میں ان کے پاس چودھویں رات کے جشن میں شامل ہوا کروں گی اور چار دن وہیں بتاؤں گی۔ وہ جشن وہ میرے نام پر میرے مرنے کے بعد شروع کیا گیا تھا اور میں نے وعدہ کر لیا کہ ہر چودھویں کی رات سے ایک دن پہلے آ جایا کروں گی۔

اور یوں طاقت واپس لے کر میں تمہارے کمرے میں آ گئی۔ تم خوبصورت دہن کے روپ میں مجھے ڈانٹ لگی، اپنی خوشیوں کی، اور پھر میں تمہاری نوکری کی شکل میں تمہارے سامنے دووہ کا گلاس لے کر حاضر ہوئی جو میں پہلے ہی تیار کر چکی تھی اس میں بہت تیز اثر ہر تھا کہ دووہ کا ایک قطرہ ہی تمہارے لئے بہت تھا میں نے جیسے ہی دووہ تمہیں دیا تم نے گلاس پکڑ کر دووہ پینا شروع کر دیا، دووہ کے دو گھونٹ ہی تمہارے حلق سے اترے تھے کہ تم بے جان ہو کر ایک طرف لڑھک گئی اور میں گلاس لے کر وہاں سے غائب ہو گئی۔

پھر تمہارے مرنے کی دھوم سارے محلے میں پھیل گئی اور یہ صرف نہ سب سے ہوئے اسی وقت اطفال کا دل بھی بند ہو گیا اور وہ بھی موقع پر ہلاک ہو گیا مجھے کافی دیر بعد پتہ چلا مگر کیا کر سکتی تھی۔

پھر میں نے اپنے دور کی ایک بہت بڑی کاہنہ جو باطنی حال اور مستقبل کا حال بتاتی تھی اس کاہنہ کا نام بولانی تھا میں اس کے پاس حاضر ہوئی شاہ جنات کی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ میری روح کو بھی پہنچاتی تھی سو اس نے مجھ سے آنے کی وجہ دریافت کی، جب میں نے اپنی تقدیر کا حال پوچھا تو اس نے ایک سفید کپڑا دیوار پر لگا کر کچھ پڑھنا شروع کیا اور پھر اس کپڑے پر اطفال اور تمہاری صورت نظر آئی کاہنہ نے بتایا کہ۔ ”یہ بہت عرصہ بعد دنیائیں آئیں گے۔“

یوں میں اس وقت کا انتظار کرتی رہی اور پھر سات سو سال بعد ایک دن میرا اطفال مجھے نظر آیا جب میں اس کے کمر تک پہنچی تو پتہ چلا کہ وہاں ایک بار پھر اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہیں۔ یہاں قسمت مجھے مات دے گئی کہ وہی رات میری کہ وہ جالوت جانے کی تھی اور وہی تمہاری مہندی کی سوس میں اپنی دغاوار کنیز مار بے کوبایت دے کر چلی گئی، اگر میں نہ جانی تو میری طاقتیں سلب ہونے کا خطرہ تھا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی مار بے کوبہا کہ ”یہ شادی نہ ہونے دینا۔“ میں سیدھی وہیں سے کہ وہ جالوت پہنچ گئی وہاں جشن کی تیاریاں شروع ہو چکیں، بیش میں بہت خوش اور جوش

خروش سے شامل ہوئی تھی مگر اس بار میرا دل اس محل نما گھر میں انکا جہاں تمہاری شادی تھی پھر جب چاروں کے بعد میں یہ سوچتی ہوئی واپس آئی کہ مار بے سب کچھ ٹھیک کر دیا ہوگا تو پتہ چلا کہ مار بے نے اپنی طاقت کے مطابق جو ہو سکا کیا مگر اس بار قسمت تمہارے ساتھ تھی تم نہ صرف شادی بلکہ اپنی شادی شدہ زندگی کی ابتداء کر چکی تھی اور اطفال جواب جہاں اٹھا کھلا ہوا تھا، بہت خوش و خرم تھا۔

پھر میری رکاوٹ دم توڑ نا شروع ہو گئی مگر میں نے حوصلہ نہیں چھوڑا، اور پھر تمہاری شادی کے پانچ ماہ بعد جب میں کوہ جالوت گئی تو میری ملاقات عظیم کاہنہ سے ہوئی میری حالت کو دیکھتے ہوئے کاہنہ نے مشورہ دیا کہ میں تمہارے جسم میں داخل ہو کر ایک دفعہ اگر جہاں کو پا لوں تو پھر مجھے اس سے کوئی الگ نہیں کر سکتا اور تم مر جاؤ گی۔

بے شک جسم تمہارا ہوگا مگر اس پر قبضہ میرا ہوگا۔ عظیم کاہنہ نے یہ بھی بتایا کہ تم حاملہ نہ ہو اور جب میں واپس آئی تو اس بار تمہاری قسمت کہ مجھ پتہ چلا کہ تم وہ جنوں سے حاملہ ہو مگر اب مجھے اطفال کے پاس تمہارا وجود ناقابل برداشت لگا، یوں میں نے تمہارا سانس روک کر تمہیں عارضی موت دے دی کیونکہ اگر تمہیں ویسے مرنے کی تو پھر میں بچنے کی وجہ سے تمہارے جسم میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جب تک یہ بچہ دنیا میں نہیں آتا تمہیں اس تابوت میں رہنا ہوگا، دن میں دوبار تمہیں تابوت سے نکال کر کھانا دیا جائے گا تا کہ تم بھی کمزور نہ ہو اور بچہ بھی صحیح رہے اگر میں تمہارا خیال نہ رکھوں گی اور تمہارے جسم میں مجھے داخل ہونے میں دشواری ہوگی اس لئے یہ کھانا اٹھ کر کھا لو۔ ایک گھنٹے بعد تمہیں اپنی پہلے والی حالت میں آ جانا ہے۔“

☆.....☆.....☆

آج تین ماہ ہو چکے ہیں میری مناتل کو مجھ سے بچھڑے ہوئے گھر میں سناٹا تھا چکا ہے وہ گھر جو مناتل کے ہوتے ہوئے خوشیوں اور ہنسیوں کا مرکز تھا اب کسی دیران قبرستان کا منظر پیش کر رہا ہے، مانا اپنے کمرے سے کم نکلتی ہیں سارا دن کمرے میں روتی ہیں جب میں اور پایا گھر آتے ہیں تو صرف ہمارے ساتھ کھانا کھاتی

ہیں اور انتہائی ضرورت کے لئے بولتی ہیں، یونہی دن گزر جاتا ہے مگر رات کو جیسے ہی میں کمرے میں جاتا ہوں تو رچرچہ مناسبات میں پکارتی ہے میں بے بس ہو کر سونے کی کوشش میں کئی نیند کی گولیاں لیتا ہوں۔ آج صبح سے ہی میرا دل گھبرا رہا ہے رات کو بھی میں بے چین رہا ہوں، ابھی سوئے مجھے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ میرے کانوں نے مناسبات کی آواز سنی۔ ”بھال مجھے بچاؤ بھال مجھ پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔“ پھر میں نے آواز کی طرف دیکھا تو کیا دیکھا ہوں کہ مناسبات ایک تابوت میں لیٹی ہے اور تابوت کا ڈھکن کھلا ہے اور مناسبات کے سینے پر ایک سانپ بیٹھا ہوا ہے میری خوف سے چیخ نکلتی گئی۔

چیخ کی آواز سن کر میرا پاؤں بڑے آئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ میں پیسے سے شرابور ہوں اور خوف سے میرا رنگ زرد ہو رہا ہے تو مانے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے پیار سے میرا ہاتھ چومنا اور بولیں: ”لگتا ہے خواب میں ڈر گیا ہے۔“

میں نے جلدی سے اپنا خواب انہیں سنایا جسے سن کر مانے رونا شروع کر دیا اور بولیں: ”بیٹا مناسبات کہاں تم تو اس کی موت پر ہی کہہ رہے تھے مناسبات کی آنکھیں زندہ ہیں مگر بیٹا موت تو اٹل حقیقت ہے۔“

مگر میرے دل میں یہ خیال پکا ہو گیا کہ میری مناسبات زندہ ہے اور کسی مشکل میں گرفتار ہے۔ صبح جاگنے کے بعد نہ چاہتے ہوئے میں نے تھوڑا سا ناشتہ کر لیا۔ اپنے دفتر میں میجر کو ضروری ہدایات دیں اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس آ کر گھر گیا کیونکہ خواب میں اس کی جگہ مناسبات کو دیکھا تھا وہ جگہ پہاڑوں کے درمیان غار تھیں جہاں یوں سارا دن پہاڑوں میں گھومتا پھر کر مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

یونہی آٹھ دن ہو گئے مجھے پہاڑوں کی خاک چھانٹتے کیونکہ تین دن تک میری مناسبات مجھے مدد کے لئے پکارتی رہی اور آج تو اس دن تھا مجھے پہاڑوں میں گھومتے ہوئے۔

میں گاڑی روڈ کے کنارے لاک کر دیا کرتا

اور پیدل نکل جا، میں آج کافی آگے تک گیا تھا کہ چلتے چلتے پہاڑوں کو دیکھتے دیکھتے شام سر پر آ گئی اور پھر میں نے واپسی کا قصد کیا کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے، میں واپس چلا جاؤں کہ ایک پہاڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری مناسبات مسک رہی ہے۔

میں آگے بڑھا وہ ایک بہت کثیف غار تھا ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو کر دبک کر بیٹھ گیا کیونکہ مجھے کچھ ناگوار احساس ہو رہا تھا جو مجھے چوکنا کر رہا تھا۔

اچانک غار میں مدھم مدھم روپنی ہونے لگی اور پھر اتنی روشنی ہو گئی کہ میں اندر با آسانی دیکھ سکتا تھا، میں نے پتھر کی اوٹ سے دیکھا تو مجھے ایک کھلا تابوت نظر آیا جس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔

اچانک میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر اپنی چیخوں کو روکا۔ ”اوہ! میرے خدایا! یہ تو وہی تابوت تھا جس میں مناسبات کو دفنایا گیا تھا، میں اسے پہچان گیا کیونکہ تابوت میں نے خود خرید لیا تھا اس کے سائیز پر کچھ علیحدہ سے ہلکا سا لکڑی لگا گیا تھا باقی تابوت گہرا ڈونڈ لکڑی کا تھا مگر غلطی سے کارنگر سے سائیز پر دوسرا لکڑی لگا دیا میں دیسے ہی وہ لے آیا چند منٹ ہی گزرے تھے کہ میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی تابوت پر چڑھی، اس نے زریں کچھ پڑھا اور تابوت کے اندر لیٹا ہوا مناسبات کا وجود اور کھانا۔

مناسبات کو دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی چاہتا تھا کہ بھاگ کر جاؤں اور مناسبات کو اس لڑکی سے چھین لوں مگر مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے ہوں، میں صرف دیکھ سکتا تھا حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لڑکی نے مناسبات کے آگے کھانا رکھا اور جب مناسبات نے کھانے سے انکار کیا تو اس نے زوردار چیخ مناسبات کے گال پر پر مارا۔

مجھے شدید غصہ آیا مگر پورا زور لگانے کے باوجود میں حرکت کی طاقت کھو چکا تھا یہ نہیں یہ کیا سحر تھا پھر اس نے زبردستی مناسبات کو کھانا کھلایا اور وہ دھ پلا کر کہنے لگی: ”اب تم مرو اس تابوت میں آج مجھے کوہ جالوت جانا ہے کیونکہ کل چودھویں رات کے جشن میں شرکت کرنی

ہے بارہ چھپنا کھانا کھلایا کرے گی۔“

ساتھ ہی اس نے تیلی بھائی کو ایک سیاہ قلم لڑکی جس کے بال سانب کی شکل کے تھے۔ میں نے اتنی بدصورت اور ڈراؤنی شکل آج تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ نمودار ہوئی اور جبکہ اس لڑکی سے بولی: ”تاہن کیا حکم ہے؟“

اس نے کہا: ”میں کوہ جالوت جا رہی ہوں اس چڑیل کا خیال رکھنا، دیکھنا تم جو بھی تشدد کر مگر اس کا خوبصورت جسم خراب نہ ہو کیونکہ یہ میرے ہی کام آتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لڑکی غائب ہو گئی۔

وہ بدصورت عورت مناسبات پر جیسے ہی چبکی تو مناسبات بے ہوش ہو گئی، اس کے ساتھ ہی سارا منظر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں بھاگا اور غار کو چاروں طرف سے دیکھا مگر اب وہاں کچھ بھی نہ تھا میں اٹے قدموں مناسبات کو پکارتے ہوئے واپس آیا اور جلد سے جلد گھر پہنچا، پایا میری حالت دیکھ کر حیران رہ گئے، مجھے پانی پلایا اور جب میں کچھ سنبھلا تو میں نے ساری حقیقت انہیں بتائی۔

پہلے تو وہ یقین نہ کر سکے میرے بار بار کہنے پر ان کو یقین آ گیا۔ ”مگر کیا کریں؟“ انہوں نے کہا۔

پھر وہ کہنے لگے: ”صبح تمہیں میں شاہ صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔“

صبح ہم شاہ صاحب کے پاس پہنچے تو تمام واقعات سننے کے بعد انہوں نے جواب دیا: ”میرے اعتبار سے بہت آگے ہے۔ اس لئے آپ فوراً پنڈی میرے مرشد عبداللہ شاہ کے پاس حاضر ہوں۔ آج ہی چلے جائیں کیونکہ آج اتوار ہے چاند کی چودھویں تاریخ ہے وہ آج آپ کو مل جائیں گے۔ اس کے بعد وہ پورا ہفتہ باہر نکلیں گے اپنے حجرے میں عبادت کرتے ہیں۔“

سو ہم پتہ لے کر فوراً میرے مرشد عبداللہ شاہ صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ہم نے سلام کیا انہوں نے جواب دیا اس وقت ان کے مرید کافی تعداد میں ان کے پاس جمع تھے انہوں نے سب کو اشارہ کیا تو وہ سب اٹھ کر باہر چلے گئے ان کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے

اشارہ کیا میں ان کے قریب جا کر ادب کے ساتھ بیٹھ گیا انہوں نے مجھے دیکھا اور فرمانے لگے: ”کتنے دستوں کی سیاحی کر چکے ہو، آخر کو ہر منزل ڈھونڈ نکالا۔“

میں نے حیرن ہو کر ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے کہنے لگے: ”مناسبات کو پالیا۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی: ”حضور صرف دیکھا ہے۔“

انہوں نے فرمایا: ”آج ہمارے پاس بھی وقت ہے اور تمہارے مقدور کے ستارے بھی عروج پر ہیں کہ وہ بدروح آج کوہ جالوت میں جشن منا رہی ہے اپنی کامیابی کا، اگر اب حملہ کیا جائے تو مناسبات کو آسانی سے چھڑا سکتے ہیں۔“

اس وقت دن کے دو بجے تھے میرا صاحب نے اپنے چار خاص مرید اپنے ساتھ لئے اور ہمارے ساتھ ہوئے وہ اور میرا بیٹا اپنی گاڑی میں، میں اور پاپا اپنی گاڑی میں ہم ایک گھنٹہ کے اندر پہاڑوں کے قریب پہنچ گئے اس وقت تین بجے تھے پھر گاڑیوں سے اتر کر ہم نے پہاڑوں میں سفر شروع کیا دو تین گھنٹے کی کچھ مسافت کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں اس پہاڑ کا غار تھا، غار اب بھی خالی تھا، مگر شاہ صاحب نے اسی پتھر کے پیچھے ہمارے ساتھ بیٹھنے کا ٹھکانہ بنایا اور پڑھائی شروع کر دی۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک پڑھنے کے بعد کل والا سین دہارہ ابھرا، پہلے غار میں روشنی ہوئی پھر تابوت نظر آیا۔ اس کے بعد وہ ملازمہ تابوت کا ڈھکن اٹھانے کے بعد مناسبات کو پکڑ کر اٹھایا جب مناسبات تابوت میں بیٹھ گئی تو ملازمہ نے کھانا دیا۔

شاہ صاحب بدستور پڑھتے رہے ان کی پڑھائی کا اثر تھا کہ ملازمہ نے کھانے کے بعد مناسبات سے کہا: ”اٹھ آج تجھے تابوت سے ذرا باہر نکال دوں تیری ٹانگیں نہ جڑ جائیں آخر یہ جسم میری ٹانگیں نے استعمال کرنا ہے۔“

اس نے جیسے ہی مناسبات کو باہر نکالا مناسبات تابوت کے پاس بیٹھ گئی اس ملازمہ نے کہا: ”آج چودھویں کی رات ہے مالک تو جشن میں ہو گئی میں نے تمہیں اس لئے

نگلا کہ میں بھی جشن مناسکوں، جیسے یہ چاند پورا روشن ہوگا میں تمہیں واپس تابوت میں ڈال دوں گی مگر اس سے پہلے تمہارا غمور سا خون چوسوں گی کیونکہ میرے ناگ بھوکے ہیں اور میں نے اس خوشبودار جسم سے نکلے والا خون پینا ہے اس کے بعد تو تم رہو گی نہیں۔“

انتہائی ہی شاہ صاحب پتھر کے پیچھے سے نکلے اور غار میں داخل ہو گئے۔ شاہ صاحب سب سے منع کر گئے تھے کہ اندر کوئی نہ آئے اور اپنے مریدوں کو کہہ گئے تھے کہ سورۃ ناس اور سورۃ جن بلند آواز سے تلاوت کرتے رہیں۔ مریدوں نے زور و شور سے تلاوت شروع کر دی۔

جیسے ہی پیر صاحب غار میں داخل ہوئے تو غار ایک دم تاریک ہو گیا مگر دیر ہو چکی تھی پیر صاحب اپنا دار ملازمہ پر کر چکے تھے اور ملازمہ شعلوں کی لپیٹ میں تھی ساتھ ہی فضا میں سر اٹھ چھل گئی۔

مناصل کی کھائی کی آواز باہر تک آئی پھر ایک دم غار روشن ہو گیا ملازمہ کا جلا ہوا جسم ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔

پھر پیر صاحب دیوار پر لگے بڑے سے آئینے پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری تو آئینے کے اوپر ایک کبوتر کی تصویر بھری پیر صاحب مسلسل ورد کرتے ہوئے جیسے ہی کبوتر کی تصویر پر پھونکا۔

ایک دم جیسے زلزلہ آ گیا آئینے میں کبوتر کی جگہ ایک خوبصورت لڑکی تڑپتی نظر آئی جو پیر صاحب کے آگے ہاتھ چھوڑ رہی تھی کہ اسے چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی پیر صاحب نے لڑکی پر پھونک ماری تو وہ بدھت بڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی وہ زور زور سے چلانے لگی۔ ”مجھے چھوڑ دو تم نے میرا جسم چلا دیا۔ اب میں تمہیں جلا دوں گی میں شاہ جنت کی بیٹی ہوں۔“ اس نے وہمکیں دیتی شروع کر دیں مگر شاہ صاحب نے اس کی طرف دوسری پھونک ماری تو بڈیوں میں آگ لگ گئی اس کے جسم کا بنجر پھڑکنے لگا اور گرد و دوسرے جنت بھی اسے بچانے کے لئے دور سے گھرائی دقت تیسری پھونک سے وہ ڈھانچہ زور و زور سے گرا اور ساتھ ہی آئینہ کچی ہو کر ٹکڑا گیا۔

شاہ صاحب نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا

اور مناجات کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ ”بیٹی چلو اپنے گھر۔“ اور یوں مناجات باہر آتے ہی ایک دفعہ پھر بے ہوش ہو گئی اب کے بارشاہ صاحب نے کہا۔ ”اسے چکا نہیں یہ خود ہی اپنی نیند سو کر اٹھے گی۔“

یوں مناجات کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ اور شاہ صاحب کا ٹھگرے ادا کیا، شاہ صاحب نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہم سے الگ ہو کر واپسی کی راہ لی۔

ہم باپ بیٹا خوشی خوشی گھر آ گئے مگر میں سب سے پہلے ماما نے مناجات کے ساتھ مجھے دیکھا تو ان کی جیسے چیخ نکل گئی پھر وہ خوشی سے بھاگتی ہوئی آئیں مناجات سے لپٹا چاہتی تھیں کہ پاپا نے انہیں روکا کہ ”مناجات جب تک خود نہ جاگے اسے چکا نہیں۔“ میں مناجات کو اپنے بیڈروم میں لا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ کچھ دیر مناجات کو کہنے کے بعد جیسے ہی میں باہر آیا ماما مجھ سے لپٹ گئیں اور روئے لگیں کیونکہ پاپا انہیں سب کچھ بتا چکے تھے۔

اس کے بعد میں نے لاہور آئی اگلے کونوں کیا اور انہیں فوراً کوئٹہ پہنچنے کا کہا۔ انہیں اس لئے نہ بتایا کہ کہیں انہیں خوشی سے کچھ ہونہ جائے کیونکہ مناجات کے بعد اگلے ہارٹ کے مریض بن چکے تھے آئی اگلے کو ان کے کا کہہ کر ہم لوگوں نے پہلے دن سکون کے ساتھ اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور میں اپنے کمرے میں آ کر مناجات کو دیکھنے لگا اس کی زندگی سے بھرپور آئی جانی سانس مجھے سکون دے رہی تھیں میں پھر باہر آ گیا کیونکہ اگر میں کمرے میں رہتا تو ہو سکتا تھا مناجات جاگ جاتی۔

اور وہ رات ہم تینوں ماں بیٹے نے جاگ کر گزاری آئی اگلے صبح چار بجے کی فلائٹ سے کوئٹہ پہنچے۔ آئی میرے گلے لگی روئے جاری تھیں اور کہہ رہی تھیں ”بیٹا کیا حلیہ بتایا ہے اپنا؟ جانے والی تو چلی گئی، اب تو خود کو سنبھال لو۔“

پھر اگلے مجھ سے ملے اور پوچھنے لگے ”بیٹا اتنی امیر بنی میں میں کیوں بلایا؟“

میں نے آہستہ آہستہ انہیں باتوں میں لگاتے

ہوئے کہا کہ ”اگلے فرض کریں اگر مناجات زندہ ہو تو۔“ تو اگلے بولے۔ ”بیٹا ممکن کبھی ممکن ہوئی ہے ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس کے تابوت کو قبر میں اتارا، بیٹا یہ کیسی باتیں کر رہے ہو اگر ایسا ہو جائے تو ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی کی خبر کیا ہو سکتی ہے۔“

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ پتہ نہیں کیسے مناجات کی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ کر باہر آ گئی اور جیسے ہی اس کی ہم پر نظر پڑی تو وہ خوشی سے اچھل پڑی وہ براۓ میں ستون کے پاس کھڑی تھی۔

لہجہ تک میں نے دیکھا اس کا چہرہ خوشی سے تھمرا ہوا تھا میں نے آواز دی۔ ”مناجات اصرار جاؤ۔“

میری آواز کے ساتھ ہی اگلے آئی نے مرکز دیکھا تو جیسے پتھر کے بت بن گئے، ماما جلدی سے آگے بڑھیں اور مناجات کو گلے لگا لیا مناجات بھی بہت خوشی سے ان کے ساتھ براۓ کی سیڑھیاں اتر آئی، ابھی مناجات ماما کے ساتھ کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ سب سے پہلے اگلے کو ہوش آیا وہ مناجات بیٹی کہتے ہوئے بھاگے اور مناجات سے ”لپٹ گئے ساتھ ہی آئی بھاگیں اور مناجات سے لپٹ کر بے تحاشہ روئے لگیں۔

جب سب مل ملا کر خوش خوش بیٹھے تو اگلے بولے۔ ”کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ سب کیا ہے؟“

پھر ماما نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور پیار سے بولیں۔ ”یہ میرے بیٹے کی حد سے زیادہ محبت اور دیوانگی کی وجہ سے آج ہم مناجات کو ایک دفعہ پھر بکھڑا کرے ہیں۔“

پھر ہنستے وغیرہ سے فارغ ہو کر ماما نے اپنی فیملی ڈاکٹر کونوں کیا تاکہ وہ مناجات کا اچھی طرح چیک اپ کر کے بتا سکے کہ مناجات بالکل فٹ ہے یا کسی طاقت کی دہائی کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر کو بھی سن کر شاک لگا کیونکہ وہ بھی مناجات کی آخری رسومات اللہ نے کرے عارضی رسومات میں شامل تھی جب ڈاکٹر آئی تو اسے بھی یقین کرنا مشکل تھا پھر چیک اپ کے بعد اس نے مختصر آپ بیٹی سنائی جس نے میرے ساتھ ساتھ وہاں دوسروں کو بھی حیرت میں مبتلا کر دیا

اور جب سب حیرت سے نکلے تو سب نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کیا۔

اور پھر مناجات کو سب سے ملانے کے لئے ماما نے ایک پارٹی بمعہ نعت خوانی اراچ کی۔ اس میں میں نے شاہ صاحب اور ان کے پیر و مرشد بڑے شاہ صاحب کو بلایا ان کی آنے پر ہم سب بہت خوش ہوئے محفل نعت بڑے شاہ صاحب کو بہت پسند آئی میلاد کے بعد پاپا اور ماما نے پیر صاحب سے پوچھا۔ ”اب تو کوئی خطرہ نہیں جمال یا مناجات کو تو پیر صاحب نے فرمایا کہ اس بدروح کو ای وقت چلا دیا تھا۔ اور اب جنت میں سے کوئی دشمن نہیں ہے کیونکہ انہیں جمال کی دیوانگی مٹا چکی ہے اور لفظ دیوانگی پر شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ سب ہی مسکرا دیے اور میں نے خوشی سے سر جھکا لیا۔

آج اس واقعہ کو بیٹے سات سال ہو گئے ہیں، میرے تین بچے ہیں حسان نعمان نور امین، نور امین میری بہت پیاری بیٹی ہے اور بھائیوں سے بڑی بھی اور مجھے اس کے ساتھ اتنا پیار کہ کیا بتاؤں بلکہ بیٹوں سے بھی زیادہ۔ مناجات کئی دفعہ گلہ کرتی ہے کہ میں تو اسے زیادہ پیار کرتا ہوں اور حسان نعمان سے کم، تو میں اسے بتاتا ہوں کہ۔ ”یہ نور امین ہی کا وجود ہے جس نے اس بدروح سے اسے محفوظ رکھا اگر میری نور امین مناجات کے وجود میں نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔“

یہ سوچ کر ہی میری جان نکل جاتی ہے اور مجھے اپنی نور اور زیادہ دل کے قریب لگتی ہے۔ نانا نانی اور گھر میں دادا دادی سب کی جان اس میں اٹکی ہوئی ہے۔ اور سب سے زیادہ حسان نعمان کی بھی اس میں ہی جان اٹکی ہوئی ہے۔ نعمان نے اگر ہماری فیملی مکمل کر دی ہے یہ ہمارا خوشحال گھر ہے جس کی رونق مناجات کے دم سے ہیں، اللہ ہمارے گھر کو ہر مشکل و مصیبت سے بچائے۔ (آمین)



کے پاس میری موجودگی کا پتہ چل جاتا۔ اور پھر یقیناً وہ باتوں باتوں میں یہاں بیٹھ جاتے اور پھر میری عزت خاک میں مل جاتی۔

بابو جی! آپ اب آرام کریں اور میں ترنت جاری ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ رام لال جی میرے کمرے میں جائیں اور مجھے نہ دیکھ کر یہاں ہو جائیں، کیونکہ آج کی رات بہت گھمبیر ہے، آج وہ پھر آ گیا ہے۔

یہ سن کر میں سرگوشی میں بولا۔ ”کاشی وہ کون ہے جو کہ آج آ گیا ہے؟ اور پھر اس کے آنے سے اس قدر پریشانی کیوں ہو رہی ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی۔“

”بابو جی! اب سے نہیں رہا کہ میں آپ کو اس کے متعلق بتاؤں، میں کل دن سے آپ کو اس کے متعلق بتا دوں گی۔ اب آپ آرام سے لیٹ جائیں، میں جاری ہوں۔“ اور یہ بولتے ہی کاشی میرے جسم سے علیحدہ ہوئی اور خاموشی کے ساتھ دروازہ سے باہر نکلتی چلی گئی۔

کاشی کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک شش و پنج میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ”وہ کون ہے؟ جو آج رات آ گیا ہے؟“

کافی سوچ بچار کے باوجود بھی میں اس گتھی کو نہ سلجھا سکا آخر تھک کر اپنی جگہ پر لیٹ گیا اور وقت کے تانے بانے کے متعلق سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں چلا گیا۔

اور پھر اس دن صبح 8 بجے میری آنکھ کھلی وہ بھی کاشی کے جگانے پر، کاشی نے میرا ہاتھ تھپک تھپک کر جگایا، میں فوراً اپنی جگہ اٹھ بیٹھا جب میری نظر کاشی کی نظر سے ٹکرائی تو وہ مسکرائی ہوئی مجھ پر اپنی نظریں مرکوز کر رکھی تھیں۔

”بابو جی! آج تو آپ بہت دیر تک سوتے رہے، ورنہ ہر روز تو آپ جلدی اٹھ جایا کرتے ہیں، میں کئی مرتبہ کمرے میں آئی مگر آپ بے سادہ سوئے پڑے تھے، ایک مرتبہ رام لال جی بھی آپ کے کمرے میں آئے تھے مگر آپ کو سوتا دیکھ کر بولے۔ ”کاشی آج پر تپا کو سونے دینا، جلدی جگا ناہیں۔“ اور یہ بول کر مندر چلے گئے۔

میں بھی مندر چلی گئی تھی، پھر آپ کا خیال آیا کہ آپ اٹھ گئے ہوں گے، یہ سوچ کر چلی آئی، کیونکہ آپ کو ناشتہ بھی دینا تھا۔ ”یہ بول کر کاشی نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچا کہ میں اٹھ کھڑا ہوں۔ مگر پھر اچانک پتہ نہیں میرے سن میں کیا آیا کہ میں نے کاشی کو اپنی طرف کھینچا تو وہ جھٹ سے مجھ پر آن گری۔ اور پھر فرس کر بولی۔ ”بابو جی! اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ کیا سوچے گا۔ جلدی سے اب آپ انہیں اور ایشان کر لیں، میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“

”اے ہاں! یاد آیا تم یہ تو بتاؤ کہ رات سے وہ کون تھا جو کہ آ گیا تھا۔ میں رات کافی دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا۔“

”بابو جی! ابھی سے نہیں کہ میں بتا دوں، آپ فوراً تیار ہو جائیں، میں بعد میں بتا دوں گی اور آپ غلطی سے بھی کسی کے سامنے یہ نہ کہہ دینا کہ رات کاشی میرے پاس آئی تھی۔“ اور یہ بول کر وہ مسکرائی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں فوراً اٹھا اور ایشان کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں کمرے میں آیا تو میرے پیچھے ہی کاشی تھالی میں پوریاں، حلوا اور ایک کوری میں آلو کی بجلیا لے کر آ گئی۔ اس نے تھالی میرے سامنے رکھی اور وہ خود میرے سامنے بیٹھ بیٹھ بولی۔ ”اب آپ جلدی سے ناشتہ کر لیں۔ مجھے مندر جانا ہے اور آپ بھی مندر میں چلے جائیں، رام لال جی آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

وہ جو رات سے آ گیا تھا اس کے بارے میں، میں بعد میں بتا دوں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کا ذکر رام لال جی بھی آپ سے کریں۔“

میں نے پوری کا ایک نوالہ بنایا اور کاشی کی طرف بڑھا دیا تو اس نے مجھے بہت غور سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے اپنا منہ کھول دیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے نوالہ اس کے منہ میں رکھ دیا اور بولا۔ ”کاشی اب تم بھی میرے ساتھ ناشتہ کرو۔“

”بابو جی! میں نے بھور سے ناشتہ کر لیا تھا۔ یہ تو

آپ کو معلوم ہے کہ ہم تمام ناریاں کس سے ہنسی ہیں۔ آپ جلدی سے ناشتہ کریں، زیادہ دیر ہوگئی تو ہو سکتا ہے کہ رام لال جی اس طرف آ جائیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں آپ ابھی تک سوئے نہیں رہے ہیں۔“

میں یک تک اس کی طرف دیکھنے جا رہا تھا، مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے اور پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک نوالہ بنا کر میرے منہ میں رکھنے کے لئے میرے ہونٹوں تک نوالہ لے آئی تو مجھے مجھے ہوش آ گیا اور میں چونک کر اسے پھر پورنگاہوں سے دیکھا۔

”بابو جی! آپ ترنت ناشتہ کریں، چلیں جلدی کریں۔“ اور پھر اس کی بات سننے ہی میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا، اس نے تھالی اٹھائی اور مسکرائی ہوئی بولی۔ ”اب میں جاری ہوں مندر میں، آپ بھی ترنت مندر میں پہنچیں۔“ اور یہ بول کر وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اٹھا اور اپنے کمرے سے نکل کر مندر میں پہنچ گیا۔

مندرجہ میں کافی دیر تھا، آج ہر دن سے زیادہ لوگ مندر میں موجود تھے اور بڑے چنڈت جی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ”سبنو! آپ لوگ گھبراہٹیں نہیں، آپ لوگوں سے میں کہیں زیادہ کشت میں ہوں۔ رات بھر میں سوئیں سکا اور پوری رات یہی سوچتا رہا۔“

میرا سن بہت دھکی دھرا ہے کہ خونی نے دھن راج کا خون کروایا اور پھر دھن راج کا سارا خون پی گیا۔ میرا سن ماننے کے لئے بالکل بھی تیار نہیں ہے کہ یہ ہوا تو کیوں ہوا، آپ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے جاپ کر کے پورے گاؤں کے گرد کنڈل باندھ دیا تھا اور پھر پورا مہینہ سارا گاؤں سکھی رہا۔

جس راستے وہ خونی گاؤں میں داخل ہوا، اس راستے پر بھی میں نے زبردست کنڈل کر دیا تھا۔ پھر وہ کیسے گاؤں کے اندر آیا۔ یہ میں سمجھنے سے بیا کل ہوں۔ دیوی ماما کے چڑھاوے سے فارغ ہو کر میں اس جگہ جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کہیں کسی نے کنڈل کو توڑ تو نہیں دیا ہے۔“

ایک ضعیف شخص ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”چنڈت جی! دھن راج کے گھر والے بہت کشت میں ہیں، وہ بہت زیادہ درور رہے ہیں۔ دھن راج بہت ہی پاٹا نوجوان تھا، اگلے مہینے اس کا لگن بھی ہونے والا تھا۔ بے چارہ کتنے ارمان سے لگن کی تیاریاں کر رہا تھا۔“

ایک اور آدمی کھڑا ہوا اور بولا۔ ”چنڈت جی اب ہم چلتے ہیں، دھن راج کی کربا کرم کے لئے تیاری بھی کرتی ہے، آپ یہاں سے فارغ ہو کر آ جانا۔“

چنڈت جی بولے۔ ”ٹھیک ہے آپ لوگ جائیں، میں یہاں سے فارغ ہو کر ترنت آتا ہوں اور ہاں یاد آیا پہلے میں اس جگہ جاؤں گا جہاں کہ میں نے کنڈل باندھا تھا۔ کئی لوگوں کو میں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں تاکہ پتہ تو چلے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

دیوی ماں اور بھگوان سے پراعتنا ہے کہ ہم سارے گاؤں والے سکھی رہیں، بھگوان اور دیوی ماں کی کرپا ہمارے سروں پر رہے۔ آپ لوگ دھن راج کے گھر جائیں میں بھی آج جلدی سے مندر سے اٹھتا ہوں۔“ اور یہ بول کر چنڈت جی ترنت اٹھ گئے اور رام لال جی سے بولے۔ ”رام لال تم یہیں رہو اور دیکھ بھال کرنا، میں چند لوگوں کے ساتھ کنڈل والی جگہ پر جا رہا ہوں۔“

یہ بول کر چنڈت جی اٹھے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”پر تپا تم بھی ہمارے سنگھ چلو۔“ اور پھر انہوں نے چار آدمیوں کو اور بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

”جی چنڈت جی! چلیں میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر ہم لوگ چنڈت جی کے پیچھے چل پڑے، ہم سب چلتے چلتے اس سڑک پر پہنچ گئے، جہاں کہ میں نے آتے سے دیکھا تھا کہ کئی ترشول تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گڑے پڑے تھے۔

چنڈت جی اور دیگر لوگ اس جگہ کو حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ چنڈت جی کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ بہت زیادہ عیاں ہیں۔ انہوں نے دو دو جوانوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم لوگ ذرا کھینچو میں جا کر دیکھوں!

کہیں کسی نے ترشول اکھاڑ کر کہیں پھینک تو نہیں دیا اور اگر ایسا ہوا ہے تو یہ کس نے کیا، ایسا ہونا تو نہیں چاہئے تھا، اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ یہ ترشول یہاں پر کیوں گاڑے گئے ہیں۔ میرا سن بہت گھبرا رہا ہے۔ تم لوگ جلدی سے کھیتوں میں دیکھو۔“

پنڈت جی کی بات سن کر کئی لوگ دوڑتے ہوئے سڑک کے اطراف کھیتوں میں چلے گئے۔ ترشول دیکھنے کے لئے۔

پنڈت جی! بہت زیادہ بیاہل تھے بار بار اپنا ہاتھ ماتھے پر مارتے اور غصیاں سمجھنے لیتے تھے تھوڑی دیر میں ہی وہ سارے لوگ جو کھیت میں ترشول دھوئے گئے تھے بھاگتے ہوئے آئے اور بولے۔ ”پنڈت جی! اس طرف تو کوئی بھی ترشول موجود نہیں۔“

یہ سن کر پنڈت جی اور بھی زیادہ گھبرا گئے اور بولے۔ ”گلتا ہے کہ کسی موالی نے یہ ترشول اکھاڑ کر بیچ دیا ہوگا اور یہ یقیناً کسی نذر کرنے والے نے ایسا کیا ہوگا۔

پر شاد تو ترنت چلا جا مندر میں، رام لال سے کہنا کہ پنڈت جی نے مونا دھاک کا جو بندل پڑا ہے اسے مڑ گیا ہے۔“ یہ سن کر وہ جوان جس کا نام پر شاد تھا۔ اس جگہ سے گاؤں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد پنڈت جی ایک آم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اشلوک پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم لوگ جو وہاں موجود تھے پنڈت جی کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ آم کے درخت کے نیچے اچھا خاصا سایہ تھا۔

پر شاد جو کہ مونا دھاک لینے مندر میں گیا تھا۔ فوراً بھاگا ہوا آیا اور دھاک کے کا بندل پنڈت جی کو دیا۔ پنڈت جی اٹھے اور ایک سے بولے۔ ”آم کے تھوڑے پتے توڑو۔“ ایک تو جوان فوراً آم کے درخت پر چڑھ گیا اور پتوں کی ایک ٹہنی توڑ لایا۔

پنڈت جی اشلوک پڑھتے ہوئے دھاکے میں گرہ لگاتے اور پھر اس گرہ میں آم کا ایک پتہ کس کر باندھ دیتے۔ اس طرح پنڈت جی نے دھاکے کا پورا بندل کام میں لے لیا۔ پھر وہ بولے۔ ”اب اس دھاکے کو درخت

جائے کیا سوچتے ہوئے چاروں اس کے سینے تک سمجھ دی۔ اودھ بھولان۔ دھن راج کا چہرہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ نک نکھڑ گیا ہو۔ منہ پر اچھڑا اور چھٹی پھٹی آنکھیں جو کہ دہشت زدہ تھیں۔ آنکھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے دھن راج نے مرنے سے پہلے کوئی بہت ہی بھیاںک اور خوفناک چیز دیکھی ہو۔

پنڈت جی نے ذرا سر کو اونچا کیا تو واضح نظر آیا کہ اس کے زخروں کے اوپر دو سوراج موجود تھے اور خون کا قطرہ تک اس کے کپڑوں پر موجود نہیں تھا۔

پنڈت جی بولے۔ ”خونی نے بہت ظلم کیا ہے۔ بے چارے کا سارا خون نکھڑ لیا ہے۔ اس کے جسم میں ایک قطرہ بھی خون موجود نہیں۔“

پنڈت جی اور پھر رات میں کاٹنی کی بات کہ ”آج وہ پھرا گیا۔ خونی نے سارا خون نکھڑ لیا۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جو کہ مجھے کچھ کے لگا رہی تھیں۔ میرے دماغ میں سوچ کی آندھی چل رہی تھی۔ بار بار یہی سوال میرے دماغ میں گھوم رہا تھا کہ ”وہ کون ہے جو رات کے اندھیرے میں آ گیا۔“

کھوڑے کے تاپوں کی اور گھوڑے کے نہننا کی فلک فٹاف آوازیں، پانی خونی جس نے دھن راج کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نکھڑ لیا اور پھر سب سے دہشت ناک منظر دھن راج کے زخروں کے اوپر وہ سوراج جو کہ واضح تھے۔“

مجھ میں بہت نہیں تھی کہ میں کسی سے یا پھر پنڈت جی سے سوال کر سکوں، کاٹنی سے بھی میں اس وقت دور تھا، ورنہ میں کاٹنی ہی سے اس خونی کے متعلق پوچھ لیتا۔ خیراں سوچ میں، میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

اس جگہ جتنے بھی لوگ موجود تھے سب کے سب خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے۔ خوف اور ڈر ان لوگوں کے چہروں سے واضح نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خونی اب آیا کہ تب آیا اور آئے ہی سارے لوگوں کا خون پی جائے گا۔ کچھ لوگ بھاگ بھاگ دوڑ میں لگے پڑے تھے، کیونکہ

دھن راج کی کریا کرم کرنا تھا۔ تقریباً کوئی دو گھنٹے میں دھن راج کو چتا پر لانے کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے، چار پائی پڑاؤں کو دھن راج کا آخری دیدار کرایا گیا اور پھر سب نے دھن راج کا آخری دیدار کر لیا تو چار پائی اٹھا کر مرگھٹ کی طرف لوگ چلے اور آوازیں گونجنے لگیں۔ ”رام نام ست ہے۔“

دھن راج کے گھر والوں کا رونا چیخنا ناقابل برداشت تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر منہ کو کھینچ آ رہا تھا۔ دھن راج کا باپ پنڈت جی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر دھاڑیں مار رہا تھا۔ پنڈت جی اس کی پیٹھ پر ہتھیں دیتے ہوئے بولے۔ ”راما نند گھبراؤ نہیں، دھن راج کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا، داب میں نے سوچ لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، داب اس پانی خونی کو چھوڑنا نہیں ہے، ہر حال میں اب اس کا انت ہو کر رہے گا، میں نے بہت ڈھیل دے دی، میں کل ہی اپنے گرد جی کے پاس جاؤں گا اور میں گاؤں کی رکھشا کے لئے ان کے پاؤں پڑ جاؤں گا اور یوں گا کہ گرد جی اب کوئی نذر کوئی اپائے کر دیں تاکہ اس خونی سے گاؤں والوں کی جان چھوٹ جائے، اور مجھے امید ہے کہ گرد جی پورے گاؤں والوں کی رکھشا کے لئے ضرور قدم اٹھائیں گے۔“

گاؤں سے نکلتے ہی مرگھٹ تھا۔ مرگھٹ میں چتا تیار تھی۔ دھن راج کو چتا پر لٹا کر اوپر لکڑیاں رکھ دی گئیں اور پھر کچھ چمڑک کر چتا کو آگ لگا دی گئی۔ سارے لوگوں کی آنکھیں اٹک رہی تھیں اور ساتھ ہی سارے لوگ خوف کی وجہ سے سہمے ہوئے بھی تھے۔

مرگھٹ سے واپسی پر سارے لوگ اور پنڈت جی دھن راج کے گھر گئے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر سب کے سب اپنے اپنے گھر وں کو چلے گئے۔ میں بھی پنڈت جی کے ساتھ واپس آ گیا۔ پنڈت جی بولے۔ ”پر تاپ اب تم اپنے کمرے میں آرام کرو۔ اگر بھوجن کی ضرورت ہو تو کاٹنی سے کہہ کر منگ لیتا، کیونکہ تم گھبرانا نہیں، داب اور کچھ بھی نہیں ہوگا، میں نے تمہارے سامنے گاؤں میں آنے والے راتے پر کنڈل باندھ دیا

ہے، تم بالکل بھی بیا کل نہیں ہوتا، دیوی ماں رکھشا کرے گی، میں بھی چلتا ہوں۔ گری زیادہ ہے۔ اشانان کے بعد میں بھی تھوڑا آرام کر لوں، ویسے تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت پڑے گا سنی سے منگا لیتا۔“ اور یہ بول کر پنڈت جی اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

پنڈت جی کے جانے کے بعد میں بھی بڑھ حال قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں موندھ لیں۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کاشی کی آواز سنائی دی۔ ”بابو جی! کیا آپ سو رہے ہیں؟“

کاشی کی آواز پر جھٹ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو کاشی میرے قریب بیٹھی ایک تک مجھے دیکھنے جا رہی تھی، اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکان تھی۔ پھر وہ بولی۔ ”آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں، جا کر اشانان کر لیں، میں بھونج لگاتی ہوں۔“

میں بولا۔ ”کاشی تم کہہ تو صحیح رہی ہو، میں واقعی بہت تھک گیا ہوں، میں اشانان کر کے آتا ہوں، بھوک تو نہیں، بس تم ایک کپ اچھی سی چائے بنا کر لے آؤ۔“ اور پھر میں اپنے کپڑے لے کر اشانان کے لئے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں اشانان سے فارغ ہو کر آ گیا تو جھٹ کاشی ایک کپ گرم گرم چائے بنا کر لے آئی اور بولی۔ ”بابو جی! چائے حاضر ہے۔ میں نے بہت چاؤ سے چائے بنائی ہے۔ پیتے ہی آپ کی ساری تھکن اڑن چھو ہو جائے گی۔“ اور یہ بول کر وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

میں چائے کی چسکی لینے لگا۔ کاشی بہت ہی دلکش، حسین اور خوب صورت تھی، اس کا کالہ سر اپنا واقعی دیکھنے کے قابل تھا، اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھگوان کے ہاتھوں بنی بنائی اپسر لگتی تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔

میں چائے پیتا رہا اور میری آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بھی اپنی نظریں جھکا لیتی اور پھر ترنت اپنی جمیل سے بھی گہری آنکھیں جس میں کب عجیب سی مدھن تھی بھی بڑی اپنائیت اور لگاؤ کے ساتھ مجھے دیکھ لیتی، میری نظروں سے نظریں نہ کراتے ہی پھر سے وہ

اپنی نظریں جھکا لیتی، خیر میں نے چائے پی لیا۔ چائے واقعی بہت مزیدار تھی، چائے کی اچھی جگہ پورا دودھ ہی دودھ تھا، اس نے دودھ پتی چائے بنائی تھی۔

”کاشی چائے تو واقعی بہت مزیدار ہے، سواو آ گیا، لگتا ہے تم نے بہت سُن سے چائے بنائی ہے، بولو کیا انعام دوں۔ چائے پی کر ساری تھکن دور ہوگئی۔ اچھا خیر! یہ تاؤم اتنا زیادہ میرا خیال کیوں رکھنے لگی ہو، اب تو میرے سُن میں بھی ہر وقت تمہارا ہی خیال رہنے لگا ہے، میرے سُن میں تو یہ بھی خیال سر اجمار رہا ہے کہ اگر مجھے یہاں سے جانا پڑا تو میں شاید تمہاری جدائی برداشت نہ کر سکوں۔“

”نیک بات سنو! میرے قریب آؤ۔“ میں نے کہا۔ ”جی کیا بات ہے؟ اور میں تو آپ کے قریب ہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”تمہیں اور قریب آؤ، پھر میں وہ بات بتاؤں گا۔ چلو جلدی سے میرے قریب۔۔۔۔۔“ اور میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میری بات سن کر وہ فوراً میرے قریب کھٹک آئی اور بولی۔ ”چلیں اب بتائیں بات کیا ہے؟“ جب وہ میرے بالکل قریب آ گئی تو میں بولا۔

”اپنی آنکھیں بند کرو۔“ تو جھٹ وہ بولی۔ ”بابو جی! کیا کھلی آنکھوں سے بات نہیں سنی جاسکتی اور بات تو کان سے سنتے ہیں، آنکھوں سے تو صرف دیکھتے ہیں۔“

”ارے بات ہی ایسی ہے، چلو اپنی آنکھیں بند کرلو۔ پھر میں بات بتاتا ہوں۔“ میری بات سن کر اس نے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر لیا، وہ بدستور، بے سدھ رہی اور پھر میں جھٹ سے اس کے چہرے پر جھپک گیا۔

اور پھر بڑ بڑا کر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور میرے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا کر بولی۔ ”بابو جی! یہ کون سی بات ہے، اگر کوئی دیکھ لیتا تو۔۔۔۔۔“ اور اس نے بات مکمل نہیں کی۔

”اگر کوئی دیکھ لے تو کیا ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ وہ

پر کی اپنائیں بھلا رہے ہیں، اور ویسے بھی تم کسی کا خیال نہ کرنا کرو۔ کیا ہوگا یہی ناں کہ پنڈت جی! مندر سے نکال باہر کریں گے، مارے بہا رہو، یہ سنسار ڈرنے والوں کو اور بھی ڈراتا ہے۔ بہت کم لوگ اس سنسار میں ہیں جو دھروں کو ان کا حق دیتے ہیں، بلکہ وہ لوگ زیادہ خوش نہیں سنسار میں جو اپنا حق کسی سے مانگتے نہیں بلکہ وہ حق چھین لیتے ہیں۔“

”بابو جی! میں بہت اچھا سُن ہوں، بھلا میں آپ کا پریم کہنے پاسکتی ہوں، کہاں میں دھرتی کی مٹی اور کہاں آپ آکاش پر چٹکا چاند، بھلا بھی آکاش اور دھرتی کا ملاپ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔“

کاشی کی بات سن کر میں پکڑا گیا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ ذہین بھی تھی۔ اس نے جو مثال دی تھی اپنی جگہ اس تھی لیکن پھر نور میں نے کہا۔ ”آکاش اور دھرتی کا ملاپ تو نہیں ہو سکتا مگر اکثر آکاش سے دیوتا دھرتی پر اترتے رہتے ہیں اور پھر دیوتا کی خوشی سے منٹش کی متوکا سائیں پوری ہوتی ہیں۔ آکاش سے دھوپ کی گری دھرتی میں خنی آتما ڈال دیتی ہے۔ آکاش سے برسات پانی دھرتی کی پیاس بجھاتا ہے اور پھر پانی پانی منٹش کی منٹش کے لئے اُسرت بن جاتا ہے۔ دھرتی کے سینے میں سے اناج اُگتا ہے، جسے کھا کر منٹش زندہ رہتا ہے۔“

کاشی میری پراہتھا ہے کہ ایٹور تمہاری منو کا سنا میں پوری کریں اور تم پر ہر پل خوشیاں بھجوا کر دیں، کاشی تم ہر سے خوش رہا کرو، میں تمہیں ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ دیوی ماں کے چہروں میں میرے لئے بھی پراہتھا کیا کہ وہ میرے دکھ جلدی سے ختم ہو جائیں، میں درد کی ٹھوکریں کھانے سے بچ جاؤں۔ میرے جیون میں بھی سکون آ جائے، میں بھی سکھی ہو جاؤں، اور پھر میرے سُن میں جوا بھلا ہے وہ پوری ہو۔“

”بابو جی! آپ کے سُن میں کیا ہے؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔ ”کاشی چلو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ میری اچھا ہے کہ تمہارے جیون میں، میں خوشیاں بھجوا دوں، تمہارے سارے دکھ دور کر دوں۔“ اور یہ بول کر میں نے

اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے، اور اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں مرکوز کر دیں۔ اچانک اس کی آنکھیں ڈنڈیاں کھلیں، اور پھر آنسوؤں کے چند قطرے آنکھوں سے نکل کر اس کے سرخ ہوتے گال پر ڈھٹکے۔ لگے اس کے آنسو دیکھ کر میں تڑپ اٹھا اور پھر اس کے آنسو اپنی انگلی کے پور پر لے کر اپنی زبان پر رکھ لئے اور جب اس نے مجھے ایسا کرتے دیکھا تو فوراً مسکراتے لگی اور بولی۔

”بابو جی! یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کی خوشی کے لئے اب آنسو نہیں بہاؤں گی۔“

اور پھر جھٹ میں نے اس کی دونوں آنکھیں چوم لیں تو حیا سے اس کا چہرہ اٹھار ہو گیا اور آنکھوں میں مدھن سی چھانے لگی۔ پھر وہ ترنت اُٹھی اور بولی۔ ”بابو جی! اب میں چلتی ہوں، کئی کام اور بھی منٹا ہے میں اور پھر رام لال جی آئے والے ہیں، وہ بول رہے تھے کہ میں نے پر تاب سے کچھ باتیں کرنی ہیں، میں پھر بعد میں آؤں گی۔“

اور یہ بول کر اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور مجھے ایک تک دیکھتی ہوئی مسکراتے ہوئے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ کاشی کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے اس کے خیالوں میں گم ہو گیا، چند منٹ بعد میں نے کروٹ بدلی تو اس سے رام لال جی کی آواز سنائی دی۔ ”پر تاب۔“ یہ منٹا تھا کہ میں فوراً اپنی جگہ اٹھ بیٹھا۔

رام لال جی بولے۔ ”کیا تم سو رہے تھے؟“ ”سو نہیں رہا تھا، بس بیٹے اور آنے والے سے کے متعلق سوچ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”پر تاب زیادہ نہ سو جا کر، بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔“ کاشی بھی منٹش جنوں کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔ منٹش بہت کچھ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا، اگر منٹش کے بس میں ہو تو اپنے لئے سنسار کی ساری دولت اور سارے سکھ جمع کر لے اور پھر اس میں سے کسی ایک کو بھی کچھ نہ دے، مگر یہ سب ایٹور نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، بہت کم لوگ سنسار میں ہیں جسے جو دوسروں کی خوشی

میں خوش ہوتے ہیں، منٹ کا لوبھی سن بھی شانت نہیں رہتا، بس ہر سے اپنے فائدے کے لئے سوچتا رہتا ہے، اگر منٹ کے بس میں ہوتا تو یہ کسی اور کو ایک نوالہ اور ایک گھونٹ جل بھی نہ دیتا۔

”جی پنڈت جی! آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ بس میری آپ سے یہ اچھا ہے کہ میرے لئے دیوی ماں سے پرارتھا کریں کہ میرے کٹ جلدی سے ختم ہو جائیں۔“ میں نے کہا۔

”پر تباہ تم گھبراؤ نہیں۔ بہت جلد تمہارے کٹ ختم ہو جائیں گے اور تمہاری منو کا منائیں پوری ہوں گی، بس تمھوڑے دنوں کی بات ہے۔ بڑے پنڈت جی بھی بول رہے تھے کہ بہت جلد پر تباہ خوش خوش اپنے گھر چلا جائے گا اس سے بولنا کہ زیادہ چٹا نہ کیا کرے یہ بھگوان کی اچھا سے ہوا کہ وہ اس طرف مندر کے سامنے آ گیا، نہیں تو پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا ہوتا، بس جسے بھگوان چاہے اس کے لئے راہ نکال دیتا ہے اور پھر اس کی بھلائی کے لئے کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ پنڈت جی تمہارے لئے بہت زیادہ سوچ فکر میں ہیں۔

گھبرانا اور سوچنا ختم کرو، زیادہ سوچنے سے ایسا نہیں ہوتا کہ سے سمت جائیں اور منٹ کے دکھ فوراً ختم ہو جائیں۔“

”پنڈت جی! ایک بات ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو پوچھوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں! پوچھو، اور میں جانتا ہوں کہ تم کیا پوچھو گے، ویسے بھی پنڈت جی بول رہے تھے کہ تم جا کر پر تباہ کو سمجھا دینا، وہ زیادہ بیا کل ہوگا، جو حالات رات میں اور آج دن میں نظر آئے اور پھر سب سے زیادہ خوفزدہ حالات جو دھن راج کے ساتھ پیش آئے۔“

”جی پنڈت جی! یہی بات ہے، اور یہی بات مجھے بہت زیادہ بیا کل کر رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”پر تباہ! تمہاری بات بالکل صحیح ہے اور بیا کل ہونے والی ہے۔ تم اس گاؤں میں نہ ہو اور تمہیں ان حالات کے متعلق بالکل بھی معلوم نہیں کہ ایسے حالات

کیوں پیش آتے ہیں۔“ رام لال نے کہا۔

”جی پنڈت جی! ایسا وہ کون خوشی ہے؟ جو رات کے اندھیرے میں آتا ہے، اور اس طرح ظلم ڈھا کر غائب ہو جاتا ہے۔ اور پورا گاؤں خوفزدہ ہو کر ہم جاتا ہے اور پھر دھن راج کی لاش دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کا سارا خون اس کے گلے میں سوراخ کر کے کسی پائپ کے ذریعہ نکال لیا گیا ہو۔

اور کب سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا کبھی کسی نے کوشش نہیں کی کہ اس خوشی کا خاتمہ ہو سکے، یا پھر یہ سب کچھ گاؤں والوں کے بس سے باہر ہے۔

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ سنسار میں ہر کٹ، ہر دکھ، ہر ظلم کا کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوتا ہے، اور اس کے لئے لوگ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کسی بھی جان لیوا دکھ سے جان چھوٹ جائے۔“ میں نے کہا۔

”پر تباہ! تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اور تم نے ٹھیک سوچا ہے، سنسار میں ہر کٹ کے خاتمہ کے لئے اپائے ضرور ہوتا ہے اور اس کا بھی اپائے ضرور ہے۔ اب میرا خیال ہے کہ بہت جلد اس خوشی سے گاؤں والوں کی جان چھوٹ جائے گی، پنڈت جی نے اب سوچ لیا ہے کہ وہ اپنے گرد جی سے کہہ کر اس خوشی سے چھٹکارا حاصل کریں گے۔

پر تباہ یہ بہت بڑی بات ہے۔ آج کل جو یہ خوشی بنا ہے۔ یہ ایک زمانہ میں بہت ہی منتشر، بس کھ، دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے والا، جب بھی کسی کو کٹ میں دیکھتا تو اس کا دل تڑپ اٹھتا، اور جب تک دھمی کا دکھ ختم نہ ہو جاتا، وہ سکھ سے نہیں بیٹھتا تھا۔ اگر روپے پیسے کی ضرورت ہو تو اپنے لیے سے خرچ بھی کرتا تھا۔

وہ اپنی دنیا میں خوش اور مگن رہتا تھا، کسی کے لیجر سے میں بھی کسی ناگنگ نہیں اڑاتا تھا۔ دوستوں کا دوست اور ظالم سے نفرت کرتا تھا۔ جوان ہوا۔ اس کے پتا نے بڑی چاؤ سے اس کا دیواہ کیا۔

سارا گاؤں ایک ہفتہ تک جشن مناتا رہا، پورے ہفتہ گاؤں کے سارے لوگ اس کے دوا رکھاتے پیتے

رہے، خیر خوش خوشی اس کے گھر دہن آ گئی۔

وقت سے دن رات گزرنے لگے، نو مہینے بعد ایٹور نے اسے چند ماہ کشر مانی ایک بچی سے خوش کر دیا، بچی کو کچھ دیکھ کر اس کے پر پور خوش رہنے لگے۔ وہ بچی بھی ہی اتنی سندھ کہ اگر اس پر آکھ پڑ جاتی تو اس پر سے آنکھ نہیں ہٹتی تھی۔

انہی دنوں اس کا من سنسار کے کاموں سے اجاٹ ہونے لگا۔ اس کا من چاہا کہ سنسیا بن جائے مگر لوگوں اور اس کی اپنی بچی اور گھر والوں کے سمجھانے پر اس نے خود کو سنسار کے کاموں سے الگ کر لیا اور دھیان گیان میں لگ گیا۔

بڑے بڑے دھیانی گیانی اور گرو قسم کے لوگوں کے چرنوں میں بیٹھنے لگا۔ تمام گیانی لوگوں نے اس کی بہت مدد کی، اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر جتنی چیزوں میں وہ آگے بڑھا گئے جانے لگا اور پھر وقت آیا کہ وہ ایک بہت بڑا گیانی بن گیا۔

سے پر لگا کر ازار ہا۔ اس کا نام گو پی تھا۔ اس کی ہنری جس کا نام انہوں نے چند بھی رکھا تھا۔ جیسے جیسے چند بھی بڑی ہوتی رہی ویسے ویسے سنسار کی ساری خوبصورتی اس میں سمیٹتی رہی۔ ابھی کم عمر ہی تھی کہ لوگوں کی آنکھوں میں بس گئی تھی۔

گو پی کو گھربار سے کوئی واسطہ تو تھا نہیں، وہ ہر وقت گیان دھیان میں لگا رہتا تھا، اس کے پاس ایک بہت ہی خوب صورت اور لاکھوں میں ایک کا لے رنگ کا کھوڑا تھا۔ قرب و جوار بلکہ اس پورے علاقے میں اس کے مقابلے کا کوئی اور کھوڑا نہیں تھا۔ گو پی جہاں بھی آتا جاتا، اس کھوڑے پر سفر کرتا تھا۔

گھربار سے اس کی دوری یوں تھی کہ گھربار کی ذمہ داری اس پر نہیں تھی۔ اس کے پتا کی زمینیں تھیں کہ گزراہ بہت ہی ٹھٹھاٹ بات سے ہوتا تھا۔ گو پی کی بچی بھی بس یوں سمجھو کہ ایک بکری کی مانند تھی۔ یعنی سیدنی سادی۔ وہ بھی اپنے پتی کے اچھا میں خوش تھی۔ گو پی کا جب بھی دل چاہتا اپنے گھر والوں سے ملنے

کے لئے آ جاتا تھا۔

مگر ایک بات ضرور تھی کہ وہ اپنی پتری چند بھی سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسے چند بھی سارے سنسار سے بڑھ کر پیاری تھی بلکہ کبھی کبھی وہ بولتا کہ ”میرا پران چند بھی میں لگا ہوا ہے۔ اگر کسی نے چند بھی کو میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھیں نکال کر چیل کوؤں کو دے دوں گا۔“ چند بھی بھی اپنے پتا کو اپنی جان سے بڑھ کر چاہتی تھی۔

سے کسی کا انتظار نہیں کرتا، سے کا پکر ہر پل چلا رہتا ہے، اور پھر وہ سے بھی آ گیا جب چند بھی جوان ہو گئی۔ چند بھی جوان کیا ہوئی کہ جو انوں کی آنکھوں سے نیند روکھ کر نہ جانے کہاں جا رہی۔ چاہے وہ گاؤں کا جوان ہو یا پھر قرب و جوار کے کسی اور گاؤں کا، سب ہی آہیں بھرتے نظر آتے تھے۔

جسے دیکھو ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھٹنوں چند بھی کے راستے میں کسی نہ کسی بہانے کھڑا ملتا، چند بھی زیادہ تر اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھٹک پر جاتی یا پھر آہم کی گلیاں جھولاجھولنے کے لئے جایا کرتی تھی اور پھر گھٹنوں ساری سہیلیاں مل کر آہم کے باغ میں اووم چو کڑی چایا کرتی تھی۔ انہی دنوں گاؤں کے ٹھا کر صاحب کا دیہانت ہو گیا۔ وہ سورگ باشی ہو گئے۔ ٹھا کر صاحب کے بعد ان کا سب سے بڑا بیٹا چندر اپنے پتا کی گدی پر بیٹھا۔ وہ بہت ہی لیجر، بد معاش، دشت، اوباش اور گندے من کا منٹ تھا۔

گاؤں کی جوان ناریوں سے اکثر چھیز چھاڑ کرتا رہتا تھا، مگر رات کے اندھیرے میں شراب کباب اور شباب سے دل بہلایا کرتا تھا، اس کے کئی دوست تھے جو کہ اس کے لئے کام کیا کرتے تھے، گاؤں کے لوگ اس کی بچ حرکتوں سے پریشان رہنے لگے تھے۔ اگر کوئی اس کے خلاف ہوتا تو راتوں رات کسی نہ کسی بہانے اس کا صفایا کرویتا، یا پھر تھانیدار سے مل کر اسے کسی کیس میں پھنسا دیتا تھا۔

اکثر تھانیدار اس کے ذریعے پر آتے جاتے نظر

آتا تھا۔ بلکہ یہ کہتا زیادہ اچھا ہوگا کہ گاؤں کا ہر آدمی اس سے پریشان تھا۔

گاؤں کے کچھ لوگوں نے کوئی سے شکایت کی کہ نیا ٹھا کر چندر اور جیسے مزاج کا آدمی ہے، تم اپنے گیان دھیان سے اسے لگام ڈالو۔

مگر وہ جواب دیتا کہ ”جو جیسا کرے گا وہ وہی ساری بھوک بھوکے گا، میں کیوں خواہ خواہ کسی کا خون اپنے سر لوں، اللہ نے سب کو پیدا کیا ہے، اللہ تو ہی جانے۔“

اور پھر ایک وقت آیا کہ چندر ایک بہت ہی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو گیا، بیماری ایسی تھی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

رات کا اندھیرا پھیلنے ہی اس کی بیماری زور پکڑ جاتی، پورے شہر میں درد پھیل جاتا، اور پھر سب سے زیادہ درد اس کے سر کو جکڑ لیتا۔ دردی وجہ سے وہ جانوروں کی طرح ڈکرائے لگتا، بلکہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پھلی کو پانی سے نکال کر باہر رکھ دیا گیا ہو۔

بڑے بڑے حکیم، وید، سادھو، جوگی اور سنیاسی آئے مگر کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کی بیماری کا علاج کرتا، رات بھر وہ ترہا رہتا تھا، اور صبح ہوتے ہی اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں، اس پر غینہ سوار ہو جاتی، وہ بے سدھ ہو کر کبھی زمین پر پڑ جاتا، نہ اسے بھوک لگتی اور نہ ہی پیاس لگتی تھی۔

اور پھر رات کا اندھیرا پھیلنے ہی اس کی ساری غینہ غائب ہو جاتی تھی اور درد میں ناقابل برداشت اضافہ ہو جاتا تھا۔

کچھ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ تم کوئی سے رابطہ کرو، تم نے اتنے وید، حکیم اور گیانی لوگوں سے اپنی بیماری کا علاج کرایا، ایک بار کوئی سے بھی مل لو، ویسے تو کوئی ہی ہر سے اپنے گیان دھیان میں لگا رہتا ہے، اگر اس کے آگے گزرا یا جائے تو شاید وہ تم پر ایک نظر ڈالے۔

لوگوں کی باتوں کا چندر پر شاید اثر ہو گیا اور ویسے بھی مرتا کیا نہ کرتا کے مطابق، اس نے کئی لوگوں سے کہا کہ ”ٹھیک ہے، تم لوگ کوئی سے رابطہ کر کے دیکھ لو“ اور اس کے لئے اس نے ان لوگوں کی مٹی بھی گرم کی، وہ لوگ کوئی کی مٹی میں لگ گئے اور کوئی تھا کہ کسی کو مل کے نہیں

دے رہا تھا۔ جیسے لوگ اسے کھو جتے اتنے ہی وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہنے لگا۔

لیکن لوگوں کو یہ ضرور پتہ تھا کہ کسی نہ کسی سے کئی دن بعد کوئی اپنے گھر والوں سے ملنے آنا ضرور ہے، اور پھر زیادہ تر وہ اپنی پتری چندر کسی سے تو زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا، ویسے بھی کوئی زیادہ سے زیادہ تین دن اپنی پتری کو دیکھے بنا سے بتا دیتا تھا اور چونکہ دن رات کے اندھیرے میں ضرور آتا تھا، اور اپنے گھر والوں، بچی اور پتری چندر کسی سے مل ملا کر رات سے ہی نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا تھا۔ وہ اتنی بھی اپنے گھوڑے پر اور جاتا بھی تو اپنے جیسے گھوڑے پر، گھوڑے کا نام اس نے غنٹی رکھا تھا۔

لوگ اس کے ٹوہ میں لگ گئے۔ لیکن پھر بھی وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ آخر ٹھیک بارگھا کر کے گھر کی چند عورتیں گوئی کے گھر پہنچیں اور اس کی بچی اور پتری چندر کسی کے آگے گزرا کر انے لگیں۔

چندر کسی نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ”آپ لوگ شانتی سے جائیں۔ ہمارا جب بھی آئے تو میں ان سے بولوں گی اور مجھے امید ہے کہ وہ میری بات ضرور مانیں گے۔“ چندر کسی اور اس کے گھر والے بہت خوش تھے اس لئے کہ ٹھا کر گھرانے کی عورتیں ان کے گھر آئی تھیں۔

خیر تین دن بعد کوئی رات آگیا۔ اس کے گھر والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پیار و محبت کی باتوں سے جب دل بھر گیا تو چندر کسی نے اپنے ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ”ہمارا بیٹا میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ کو میری ایک بات ماننی پڑے گی، اور آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ میری بات ضرور مانیں گے، اور اگر آپ نے میری بات اور میرے وعدے کا پاس نہ رکھا تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ ہر حال میں آپ نے میری بات رکھنی ہے، ورنہ میں جھوٹی پڑ جاؤں گی۔“

”اچھا میں وعدہ کرتا ہوں، تیری بات رکھ لوں گا، اور اس سے انکار نہیں کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے، اپنی لاڈلی کا کام کر کے مجھے بہت خوش ہوگی۔ اتنی عمر ہونے تک صرف ایک بار زبان کھولی ہے، تیرا ہمارا اپنی جان ب

کھل کر بھی تیری بات رکھے گا۔“ گوئی بولا۔

”تو ہمارا! آپ نے ٹھا کر چندر کسی کا علاج کرنا ہے، اور ہر حال میں یہ کام کرنا ہے، میں نے ان کی بچی سے وعدہ کر لیا ہے، وہ ہمارے گھر آئی تھیں۔ بس میں نہیں جانتی۔ یہ کام آپ نے کرنا ہے۔ میری خوشی کی خاطر، ورنہ میں ان کے سامنے جھوٹی پڑ جاؤں گی۔“ چندر کسی نے ہاتھ کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر بڑے لاڈ سے کہا۔

چندر کسی کی بات سن کر گوئی سوچ میں پڑ گیا، اس نے اپنی گردن نیچے کر لی، سر جھکا لیا، نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا، کہ اتنے میں پھر چندر کسی بولی۔ ”ہمارا کیا سوچ رہے ہیں؟“

”اچھا پتری! تیری بات میں رو نہیں ہونے دوں گا، تو جھوٹی نہیں پڑے گی، پتری تو نہیں جانتی وہ ٹھا کر چندر کسی خصلت کا منش ہے، وہ لوگوں کی عزت کا دشمن ہے۔ خیر فلاں سے میں آؤں گا۔ اور جو کچھ بھی دوں، اسے اس کی بچی کے حوالے کر دیتا ہوں ٹھیک ہو جائے گا۔“ اور پھر بولا۔ ”میں اپنی لاڈلی کی بات نہ مان کر کیا جیوت رہ سکتا ہوں۔“ اور یہ بول کر اپنے گھوڑے غنٹی پر بیٹھا اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

دوسرے دن ٹھا کر کی بچی آئی تو چندر کسی نے خوشخبری دی کہ ”ہمارا بیٹا میری بات رکھ لی ہے، آپ فلاں دن آکر دو لے جانا۔ ٹھا کر صاحب ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اور پھر اس رات جس کے لئے اس نے وعدہ کیا تھا گوئی آگیا، اس نے چندر کسی کے حوالے ایک بڑی سی پڑیا کی، پڑیا میں کوئی سفوف تھا۔ اس نے کہا۔ ”چندر کسی جب اس کی بچی آئے تو یہ دوادے دینا، اس میں سے آدھا وہ نمونہ تک کھائے اور تین دن ہی یہی سفوف اپنے بدن پر لیا کرے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

چندر کسی بولی۔ ”ہمارا بیٹا میری بات رکھ کر آپ نے میرا مان بڑھا دیا، ایک ہفتے سے کئی لوگ آپ کو ڈھونڈنے پاتے تھے، ہمارا بیٹا آپ بہت مہمان ہیں۔ کل وہ آگئی تھی تو یہ پڑیا میں انہیں دے دوں گی۔“ اور پھر اس کے بعد دیگر

باتیں ہونے لگیں۔

دوسرے دن ٹھا کر کی بچی آئی تو چندر کسی نے وہ دوا کی پڑیا، اس کے حوالے کر دی اور سمجھا دیا کہ دوا کس طرح استعمال کرنی ہے، خیر ٹھا کر نے تین دن دوا استعمال کی اور بھلا چکا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے گھر والے تو گوئی کو مان گئے، اور پھر چندر کسی کو ٹھیک لگا کہ بہت بہت پیار کیا۔ پھر اس کے بعد تو ایسا ہوا کہ بڑی ٹھا کر ان اور چندر کسی کی بچی چندر کسی کے نام کی مالا جپنے لگیں۔ وہ ہر روز اپنی نوکرانی کو بیچ دیتیں اور چندر کسی کو اپنے گھر لائیں۔

شروع شروع میں تو چندر کسی نے ان کے گھر جانے سے انکار کیا مگر جب بڑی ٹھا کر ان بہت ضد کرنے لگی تو ایک دن گوئی بولا۔ ”ٹھیک ہے پتری کھار چلی جایا کر مگر یہ خیال رکھنا، زیادہ جانا ان کے گھر ٹھیک نہیں، یہ ٹھا کر لوگ کبھی کسی کے متر نہیں ہوتے، اگر یہ کسی کو اچھا جانتے بھی ہیں تو صرف اور صرف اپنے مطلب کے لئے۔ ٹھا کر لوگ اپنے علاوہ سب کو بہت سچ سمجھتے ہیں۔ بس یہ اپنے مطلب کے لئے۔۔۔۔۔“ اور گوئی نے بات اور سی چھوڑ دی۔

ٹھا کر چندر، چندر کسی کو گوئی میں آتے جاتے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ چندر کسی کی جوانی ایسی تھی کہ اس کے لئے شاید منش کے پاس تعریف کے الفاظ نہ ہوں۔ کسا کسا گد ریا ہوا شریر، مست جوانی کی چال، چولی اور چندری میں تو اہل سرائی لگی تھی۔

چندر کسی کو دیکھ کر چندر کا اور بھی من مٹنے لگا۔ چندر کسی کی وجہ سے وہ اپنا سکہ چین کھو بیٹھا۔ اس خالم نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ یہی چندر کسی ہے جس کی وجہ سے مجھے نیا جیون ملا ہے، اس کا باپ کیا سوچے گا اور پھر یہ میرے لئے اپنے دل میں کس قدر نفرت رکھ لے گی۔

اب وہ تاک میں رہنے لگا کہ جب بھی چندر کسی چولی میں جاتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے چندر کسی کے سامنے آ جاتا اور بڑے پیار بھرے لفظوں میں چندر کسی کی تعریف کرتے تھک نہیں تھا۔ وہ اکثر بولتا۔ ”چندر کسی تو میرے لئے دیوی سان ہے، تو نے مجھے نیا جیون دلایا،

میں مرتے دم تک تیرا مان بڑھتا رہوں گا۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو تو اس حوالی سے ملے جاسکتی ہے تو جس چیز پر ہاتھ رکھ دے گی وہ چیز تیری ہو جائے گی۔ اگر تو یہ حویلی بھی مانگ لے تو یہ بھی میں تیری جھولی میں ڈال دوں گا۔ میں تیرے چا کا بھی احسان مند ہوں، گوئی میرے لئے بھگوان سے کم نہیں، میں علاج کرا کر اس کے تھک گیا تھا، میں جس کشت میں تھا اس تکلیف کو اب بھی سوچتا ہوں تو سہم کر رہ جاتا ہوں۔ جس دن بھی گوئی مجھے نظر آ گیا تو میں اس کے چہرے میں بیٹھ کر اس کا جوتا اپنے سر پر رکھ لوں گا۔ چندر بھی تو شریر کی ہی اچھی نہیں بلکہ سن کی بھی بہت مہمان ہے، تو نے میرا درد محسوس کرتے ہوئے اپنے چا کو علاج کے لئے رضی کیا، میں تجھے پر نام کرتا ہوں۔“

لیکن چندر کے سن میں ایک کھٹکا تھا اور وہ کھٹکا تھا گوئی کی موجودگی، وہ سمجھ چکا تھا کہ کسی بھی حال میں گوئی اسے نہیں چھوئے گا اگر اس نے چندر بھی کے ساتھ کوئی گری ہوئی حرکت کی تو اس کے بعد وہ اس اپنے میں لگ گیا کہ لو ہالو ہے کوکا ہے۔“

”کیوں نہ میں گوئی کو راستے سے ہٹانے کے لئے کوئی ایسی چال چلوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لامبھی بھی نہ ٹوٹے۔“ اور پھر یہ سوچ کر اس نے گوئی کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔

اپنے علاقے اور دو بار کے علاقوں کے پنڈت، سادھو اور گیمانی لوگوں سے ملنے لگا، اس کام کے لئے اس نے تجوری کا منہ کھول دیا۔ اور یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ دھن دولت کے لئے منٹ اپنا دھرم تک بیچ ڈال ہے اور گوئی تو ایک ادنیٰ سا مگر پہنچا ہوا گیمانی تھا۔

سب الگ الگ گوئی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگے۔ چندر اتنا چالاک تھا کہ ایک سے میں سب کو نہیں بلاتا تھا اور نہ ہی ایک سے میں سب سے بات کرتا تھا۔

گوئی کے گرد گھیر انک کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے اس کے پیچھے بنگلی ہوئی آتماؤں کو لگایا گیا، وہ آتماؤں صرف اور صرف اپنا بھینٹ لے کر کام کرنے کی

عاوی تھیں۔ آتے جاتے طرح طرح سے اسے کشت پہنچانے کے طریقے لگے آزمائے گئے۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ گوئی بیمار ہو کر چار پائی پر گر گیا۔

لیکن ظالم، جالاک اور لو بھی چندر اوپر اوپر سے گوئی کا بعد دینا رہا، گوئی کے نہ مانگنے پر بھی ہزاروں روپے اس کے ہاتھ میں تھا دیتا، ضرورتوں کا خیال رکھنے لگا، لیکن اندر ہی اندر گوئی کی جڑیں کاٹ رہا۔

چندر کا کرایا ہوا آتے دن کا جادو، سر چڑھ کر بولنے لگا۔ گوئی کی طاقتیں کم ہونے لگیں اور پھر ایک رات ایسا ہوا کہ دن سے ہی یونہی باندی شروع ہی، وقفے وقفے سے ایسی بجلی کڑکی کر لوگوں کا دل دہل جاتا، پورے گاؤں پر اندھیرے کا راج تھا، ہر کوئی اپنے گھر میں دبا ہوا تھا، گاؤں میں تو ایسے بھی بجلی نہیں ہوتی۔

رات سے چار بٹے کئے جوان گھر میں داخل ہوئے اور چندر بھی کے منہ پر زبردستی کپڑا لپیٹا اور پھر اسے اٹھا کر لے گئے۔ چندر بھی کی آواز سن کر گوئی دوڑا مگر ایک نے اس کے سر پر ایسا لٹھ مارا کہ وہ تپو را کر گر پڑا۔

گوئی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ چندر بھی کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ گاؤں کا ہر منٹ اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر چندر بھی کو ڈھونڈتا رہا مگر چندر بھی کسی طرح نہ مل کے دی۔

اور پھر ایک رات ایسا ہوا کہ گوئی کے گھر کو آگ لگ گئی، آگ اس ندر زور کی تھی کہ اس گھر میں کوئی بھی نہ بچ سکا۔ گھر کے چاروں اور آگ ہی آگ گئی، ایسا لگتا تھا کہ کچھ لوگوں نے مل کر منسوبے کے تحت پورے گھر کو آگ لگا دی تھی، گوئی، گوئی کے ماتا پتا، بھتی اور اس کا گھوڑا بھٹکتی بھی آگ میں جل کر ختم ہو گئے۔

پورا گاؤں دھکی تھا، ہر کوئی کشت کے ظالم میں تھا، گوئی اس کے گھر والے اور پھر چندر بھی کا ڈکھ لوگوں کے برداشت سے باہر تھا۔

ایک دن گاؤں کے سارے لوگ مندر میں جمع ہوئے اور پنڈت جی سے بولے۔ ”پنڈت جی! ہم گاؤں والوں کا وچار ہے کہ ہم دیوی ماں کے چہروں میں بیٹھ کر

اس ظالم اور پائی کے لئے بدو عا کریں کہ دیوی ماں جلد از جلد اس پائی کو کشت کر دے، جس نے گوئی اور اس کے گھر والوں اور چندر بھی کے ساتھ ظلم کیا ہے۔“

چونکہ سارے گاؤں والے مجمع تھے، لہذا پنڈت جی ان کی بات نہیں ٹال سکتے تھے، لہذا لوگوں کی اچھا کے مطابق دیوی ماں کے چہروں میں بیٹھ کر لوگوں نے اور خود پنڈت جی بھی اس ظالم کے حق میں بدو عا کر بیٹھے۔

ان دنوں اماؤں کی راتیں شروع ہو چکی تھیں۔ تیسرے دن اچانک چندر کی وہی بیماری جو کہ پہلے کی تھی یعنی رات ہوتے ہی وہ چیخ و پکار شروع کر دیتا تھا۔ رات سے اس کی چیخیں ورد کی وجہ سے پورے گاؤں میں سنائی دینے لگیں۔

تیسرے دن رات میں چندر اپنی حویلی سے باہر نکل گیا۔ وہ اسی طرح درد سے بلبلاتا ہوا چیخ رہا تھا۔ ”بجاء۔۔۔۔۔ بجاء۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ ارے کوئی تو نیچے بجائے۔ میں مر رہا ہوں۔ ارے یہ درد میری جان لے کر رہے گا۔“ وہ گاؤں کی گلیوں میں پھرانے لگا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر گاؤں کے لوگ باہر نکل آئے۔ وہ اسی طرح چیخا ہوا مندر کے سامنے پہنچ گیا۔

اچانک مندر کا بند دروازہ کھل گیا۔ مندر میں موجود ساری گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ گاؤں والے مندر میں جتنی گھنٹیوں کی آوازیں کر مندر کے سامنے جمع ہو گئے۔ مندر سے بہت تیز روشنی نکل رہی تھی۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ مندر سے دو روشن آہلے نکلے۔ دونوں بیولے نارپوں کے تھے، ان کے لمبے بال ہوا میں ابرارہ تھے۔ وہ بیولے آ کر چندر کے سامنے رک گئے، پھر کیا تھا چندر کی چیخیں اور بھی بہت زوردار طریقے سے نکلنے لگیں۔ وہ زمین پر لوٹنے لگا، کسی لمبا سے جھنڈا نکلتا تھا۔ وہ اٹھتا بیٹھتا اور پھر دھم سے زمین پر گر جاتا۔

اچانک ایک زوردار آواز سنائی۔ ”گاؤں کے لوگو! تم لوگوں کی بدو عا میں رنگ لے آئیں، تم لوگوں نے میرے چہروں میں بیٹھ کر بدو عا میں کی تھیں۔ اس ظالم

کے لئے جس نے گوئی، اس کا پر پوار اور اس کے گھوڑے کو جلا یا تھا، اور پھر یہی نہیں بلکہ اس ظالم نے چندر بھی کی کورات کے اندھیرے میں اٹھا کر اس کی عزت لوٹی اور پھر اس کا گلہ گھونٹ کر اسے مار دیا۔ اسے نیلے کے نزدیک گڑھا کھود کر دبا دیا۔ اس کا ظلم برداشت سے باہر ہے۔ اس کے ظلم پر ایشور کا بھی دل مسوس کر رہ گیا ہے۔ وہ ظالم کوئی اور نہیں بلکہ یہ چندر ہے۔ اس نے چندر بھی کی عزت لوٹنے کے چکر میں اتنا بڑا ظلم کا جال بچھایا۔ میرے برابر میں چندر بھی کی آتما کھڑی ہے۔

اس سو رکھ کا پاپ نہانی کے قابل نہیں، یہ لوگوں کے لئے عبرت بن جائے گا، چونکہ اس سے روٹھ جائے گا، یہ خود اپنے منہ سے موت مانگے گا مگر موت اس کے قریب کھڑی ہی تھی رہی ہے۔

آپ لوگ نیلے کے پاس سے چندر بھی کا ہنجر نکال کر چٹاکے حوالے کر دینا تاکہ اسے قتل ل جائے۔ اور پھر وہ دونوں ہیولے عاقب ہو گئے۔

چندر اپنی جگہ کھڑا چندر ہا، چلا تا رہا، اب کوئی بھی اس کی سننے والا نہیں تھا۔ اس کی ماتا جیوت بھی، اس نے لوگوں کے ہاتھ پر جوڑ کر اتنا کیا کہ کئی لوگ چندر کو پکڑ کر لائے اور ایک چار پائی پر بیٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تاکہ وہ حویلی سے باہر نہ نکل سکے، اور پھر اس طرح وہ ہر رات میں ورد کی وجہ سے چیخنے لگتا۔ اس کا کوئی اپنے نہیں تھا اور نہ ہی اس کا کوئی علاج تھا۔

دوسری اماؤں کی راتیں شروع ہو گئیں۔ ایک رات گاؤں والوں نے سنا کہ کوئی گھڑ سوار پوری رفتار سے اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے لارہا ہے۔ وقفے وقفے سے وہ گھوڑا زبردست طریقے سے نہہتا بھی تھا۔ اس گھڑ سوار کو کوئی بھی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ رات بہت اندھیر ہی تھی۔ سارا گاؤں سہا ہوا تھا۔ گھڑ سوار اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آیا، اور جب صبح حویلی والوں نے دیکھا تو چندر اپنی چار پائی پر مردہ پڑا تھا۔ اس کے گلے میں دو سوراخ تھے اور اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے پورے جسم سے

خون کا آخری قطر تک نہ چھڑایا گیا ہو۔

اس کی لاش کے قریب ہی ایک کانڈ پڑا ملا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ "اس پاپی کا انت ہو گیا، اب اس کے کارندوں کا بھیا تک انت ہوگا، اس کے بعد بستی کے ہر ایک نوجوان کا انت ہوگا، میں کسی بھی جوان کو جینے نہیں دوں گا۔ اس پاپی نے ہم پر بہت ظلم کیا تھا، اس نے ہمیں زندہ جلا کر مار دیا اور چندر کشی کی عزت لوٹنے کے بعد اسے گلا گھونٹ کر مار دیا اور نیلے کے پاس گڑھا کھود کر اس میں دبا دیا۔ میں اس پاپی کا پورا پورا رشتہ کر دوں گا۔" گوئی۔

کانڈ پڑھ کر گاؤں کے سارے نوجوان سہم کر رہ گئے اور پھر آہستہ آہستہ گاؤں کے نوجوان اپنی جان سے جانے لگے۔ جب بھی اداؤں کی رات آتی تو کوئی نہ کوئی نوجوان اس حالت میں مردہ ملنے لگا۔

گوئی کی آتما جب بھی آتی ہے اسی طرح گھوڑے کے دوڑنے اور چہنٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ بہت زیادہ فحش شالی ہے۔ بڑے بڑے اور مہمان کیانی اس سے مات کھا چکے ہیں، وہ کسی سے بھی نہیں رکنا، اور اس بات کا سارے گاؤں والوں کو معلوم ہے۔ اس کے آنے کی سب سے بڑی پہچان گھوڑے کے دوڑنے اور چہنٹنے کی آواز ہے۔

کئی ماہ پہلے بڑے پنڈت جی نے اپنے گرو جی سے کہہ کر اس کا ایک اپائے کر دیا تھا۔ گرو جی نے ترشولوں کے ذریعہ گاؤں میں آنے والے راستے پر کنڈل کر دیا تھا۔ مگر نہ جانے کون ظالم اور پاپی ان ترشولوں کو اکھاڑ کر لے گیا۔ ترشولوں کے اکھڑتے ہی اس کا راستہ صاف ہو گیا اور پھر اس طرح وہ گاؤں میں داخل ہو کر وجن راج کا خون پی گیا۔

ویسے پنڈت جی نے عارضی طور پر دھاگے سے کنڈل لگا تو دیا ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ اب اس کا مضبوط اور ہمیشہ ہمیشہ کے خاتمے کا پائے کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے پنڈت جی گرو جی کے پاس جائیں گے اور مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ دو رات گرو جی کے استھان پر

رکنا پڑے گا۔

پر تاب تم نے اندازہ لگایا ہوگا کہ گاؤں میں آبادی بہت کم ہے۔ اس کی بھیا جب سے پہلے تو غما کر کے ظلم کی وجہ سے لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے اور غما کر کے بعد گوئی کی آتما نے لوگوں پر ظلم شروع کر دیا۔ جن کی گاؤں میں جگہ زمین نہیں وہ تو چلے گئے اور جو لوگ گاؤں میں موجود ہیں وہ جدی پستی ہیں۔ یہاں ان کے گھر ہیں ان کی زمینیں ہیں وہ بھلا کہاں جاسکتے ہیں۔

خیر مجھے امید ہے کہ گرو جی اب کی بار ضرور گوئی کی آتما کے لئے کوئی نہ کوئی مضبوط پائے کر دیں گے۔

پر تاب تم ان باتوں پر دھیان نہیں دینا، چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ مندر میں اپنا قدم نہیں رکھ سکتا اور اگر اس نے مندر میں آنے کی کوشش کی تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔

پر تاب اب تم آرام کرو، میں چلا ہوں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو کامی کو آواز دے کر دینگا لیتا۔" اور یہ تمام باتیں کر کے رام لال جی اٹھے اور کمرے سے نکلے چلے گئے۔

مسرکاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بھوجن کی تھالی میرے سامنے رکھتے ہوئے خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئی اور مسرکاتی ہوئی مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی اسے ایک تک دیکھا کہ اچانک وہ جھینپ گئی اور بولی۔ "اس طرح کیا گھور رہے ہیں۔ جب آپ دروازے پر آ ہی گئے تھے تو کمرے میں بھی آ جاتے، میں کون سا آپ کو کھا جاتی۔ میں نے آئیے میں آپ کی جھلک دیکھ لی تھی۔ آپ کی نظر مجھ پر پڑے ہی آپ ترنت دروازے کے سامنے سے بٹ گئے، کچھ بھیج رہا تھا۔"

"ہاں یہ سچ ہے، میں نے جب دیکھا کہ تم بال سنواری ہو تو میں ترنت پیچھے ہٹ گیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں رام لال یا پنڈت جی کی نظر نہ پڑ جائے اور پھر پتہ نہیں دیا کہ وہ کون ہیں گے۔"

"لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ آج دونوں پنڈت جی اپنے اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ رام لال جی اپنے گھر چلے گئے ہیں، ان کی جھلی جی کو سخت بخار چڑھا ہوا ہے اور بڑے پنڈت جی ساتھ والے گاؤں چلے گئے ہیں، وہاں پر ان کی بہن رہتی ہیں، آج ان کے بڑے بیٹے کاٹن ہے۔"

آپ جلدی سے بھوجن کریں اور آرام سے لیٹ جائیں، لیٹنے سے لائین بجا دینا، تھوڑا سے بتا کر میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ ویسے بھی آج کوئی ڈر نہیں، دونوں پنڈت جی تو ہیں نہیں۔"

"کاشی جو تمہارے ساتھ لائین لڑکیاں ہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی نظر ہم پر پڑ جائے؟" میں نے تشویش مگر سہجے میں پوچھا۔

"بہن جی! ہم چاروں اپنے اپنے کمرے کی رانی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی کے کمرے میں نہیں جاتا۔ بڑے پنڈت جی کا یہ سخت حکم ہے۔ اور پھر وہ بھی کون سی چھٹی سوئی ہیں۔ انہیں بھی جب موقع ملتا ہے تو تاک جھانک کرنے سے نہیں چوکتی ہیں۔"

بس ہمارے پاؤں میں بھجوری کی بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ کون سا ہمارا من اعد سے ان حالات میں

خوش رہتا ہے۔ ہمارے سانج میں زبردستی کا یہ روک ٹوک اور بندھن ہم جیسی ناریوں کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ ہم سب مجبور ہیں، ہم کرم بھی کیا سکتی ہیں۔ اگر زبان کھلتی ہے تو وہ سانج سے بغاوت ہوگی اور زبان بند رہتی ہے تو ہم اندر ہی اندر کھٹے رہتے ہیں۔

اور ہاں ایک بات ہے جب کوئی ہم میں سے کسی کو مانگ لیتا ہے تو اسے خوش خوش جانے دیا جاتا ہے، لیکن اس کا دیواہ کر کے چاہے وہ ہمارے گاؤں کا دیواہ مگر کی اور ہی گاؤں کا کیوں نہ ہو، اس گاؤں میں اس کی آزادی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے اس صورت میں کہ جب بڑے پنڈت جی اس ناری سے خوش ہوں اور دیواہ کرنے والا بڑے پنڈت جی کی بھی زیادہ کرم کر دے۔

اچھا ابابا باتیں بہت ہو گئیں، اب جلدی سے بھوجن کریں، زیادہ دیر تک جاگنے پر کہیں نیند نہ آ جائے، اور جاتے سے رام لال جی بول گئے تھے کہ اپنے اپنے کمروں کا دروازہ مضبوطی سے بند کر لیتا۔"

کاشی کی باتیں سننے کے بعد میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر انہیں چوم لیا اور بھوجن کے لئے نوالہ بنانے لگا۔ میں نے نوالہ بنایا اور مسکراتے ہوئے پہلا نوالہ کاشی کے منہ میں رکھ دیا۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی نوالہ چبانے لگی۔

آج وہ بہت سندر لگ رہی تھی۔ میں نے اسی طرح اسے آدھی روٹی کھلا دی۔

جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو اس نے برتن اٹھاے اور کمرے سے نکلنے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ہاتھ منہ دھو کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور لیٹنے سے پہلے لائین کو بھانا بھولا نہیں تھا۔ بستر پر لیٹ کر میں اپنے کرم کے متعلق سوچنے لگا۔ میں کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ آج میں اپنے آبائی گاؤں سے ہزاروں میل دور پڑا تھا۔ میرے پر یوار کے کسی بھی فرد کو میرے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ میری اچانک غیر موجودگی پر ان کے دل پر کیا گزری ہوگی، یہ تو وہی جانتے ہوں گے، میں اس طرح کے خیالوں میں الجھا

رہا، ایک گھنٹہ گزرنے سے پہلے ہی۔

دبے قدموں کا منہ میٹھا کر کے میں آگئی اور میرے قریب بیٹھ کر بولی۔ "بابو جی!"

اس کی آواز کا سنا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں لٹالیا۔ وہ خاموشی سے بغیر کسی چوں چرا کے میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ اس کے جسم کی سوندھی سوندھی خوشبو میرے دماغ کو محسوس کرنے لگی۔ پھر اس نے میرے بازو پر اپنا سر رکھ دیا۔

"کاشی!"

میں سرگوشی میں بولا۔ "جی!!" وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

"کاشی تمہیں اندازہ ہے کہ میں تمہیں کتنا چاہنے لگا ہوں۔" میں بولا۔

"جی! مجھے اس کا اندازہ ہے کہ آپ مجھے خود سے بھی زیادہ چاہتے تھے جیسے میں اور ہر عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ مرد کی نظر کو پھانسی لیتی ہے اور صحیح اندازہ لگاتی ہے کہ سامنے والے کے دل دماغ میں اس کے لئے کتنی جگہ ہے۔" وہ دبو دبو الفاظ میں بولی۔

"کاشی تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو، میں تمہیں اپنی ذات سے بھی بڑھ کر چاہنے لگا ہوں اور اب تمہاری جدائی مجھے مار دے گی اور اگر تم مجھ سے دور ہو گئی تو شاید میں اپنا جیون تیاگ دوں۔"

یہ سنتے ہی جھٹ اس نے اپنی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ دی اور بولی۔ "بھگوان نہ کرے آپ کے ساتھ ایسا ہو، اور اگر ایسا ہوا تو آپ سے پہلے میں اپنا جیون ختم کر لوں گی، بابو جی! آپ میری پہلی چاہت ہیں اور یہ بھی عورت کی فطرت ہے کہ عورت جسے سب سے پہلے چاہے۔ زندگی بھر اس کی چاہت اس کے من سے نہیں نکلتی۔ چاہے کسی بھی مجبور کی کے تحت ان میں دوری ہو جائے، چاہے وہ گھر بار اور بچوں والی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ بھی عورت کی فطرت میں شامل ہے کہ اپنی پہلی چاہت کا پھانسی دل میں لئے ساری عمر بتاتی ہے اور کبھی اس کا انکار کسی سے نہیں کرتی۔

بابو جی! کبھی مجھے اکیلے نہیں چھوڑ جانا، نہیں تو یہ کاظمی چتا پر لپٹا بخوشی قبول کر لے گی۔"

اس کی یہ بات سن کر میں تڑپ اٹھا اور اس کے ہونٹ پر اپنی انگلی رکھ دی اور بولا۔ "آئندہ ایسی بات زبان پر نہیں لانا، میں تمہیں کسی بھی صورت میں چھوڑ دوں گا، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ جب بھی میں گیا تو صرف چند دن کے لئے ہی جاؤں گا اور پھر تروت واپس آ کر تمہیں سب کے سامنے دلین کے روپ میں منڈپ میں سات، پھر میرے لگا کر دموم حزلے سے لے جاؤں گا۔"

میری بات سن کر کاشی نے اپنا سر ذرا اوپر کھٹایا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے پھر سرگوشی میں بولی۔ "بھگوان کرے جلدی سے ایسا ہو جائے۔"

"کاشی ایسا ہی ہوگا، اب میرے جیون کا مقصد تمہاری چاہت و خوشی میں ہے، اگر تم نہیں تو میرا جیون بے کار ہے، میں تمہاری خاطر سارے سنسار سے نکلا جاؤں گا۔"

کاشی کی قربت نے میرے دل دماغ میں بالکل بھاؤ مچا دیا تھا۔ میں ہلکا رہا، وہ سختی رہی، اور وہ ہوتی رہی میں سنتا رہا مگر کسی ایک کی بھی بات دماغ میں جگہ نہیں بن رہی تھی۔ قربت قربت اور بھی زیادہ قربت بڑھتی رہی، سمندر کے سکوت میں بھراؤ ختم ہونے لگا، سرکش ہوا میں، سمندر کی خاموش لہروں کو چھیننا شروع کر دیا، لہروں نے سر اٹھاتا شروع کر دیا اور پھر آہستہ آہستہ طوفانی جھکڑوں نے سمندر کی لہروں کو اپنی پیٹ میں لے لیا۔ تو لہر بس بے قابو ہو کر ناقابل برداشت ہو گئیں، سرکش اور پھیری ہوئی لہروں کو دیکھ کر ہمارے جذبات انگڑائی لینے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم اتھاہ گہرائی کے گرداب میں غوطہ زن ہو کر ہوش سے بیگانہ ہو گئے۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ ہم بے بسدی چھا گئی۔

ہم دونوں پر اچھتی نظر ڈالے سے گزرتا رہا، ابھی تک ہماری سانسوں میں نمبر آؤ نہیں آیا تھا۔ آٹھ بجیں ہو چلے اور دل کی رفتار تھل تھل تھی۔ اس طرح نہ جانے اور کتنا سے بیت گیا کہ کچھ کاشی کی آواز میرے کانوں

میں بڑی۔ "بابو جی! میں جارہی ہوں تھوڑی دیر میں صبح کا اجالا پھیل جائے گا، اب آپ آرام کریں۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے کانوں پر لگائے اور پھر خاموشی سے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں تو بس اس کے خیالوں میں مدھوس تھا۔ کب اجالا پھیلے گا، کب صبح ہوگی، میں نہ جان سکا۔

صبح سات بجے کاشی نے مجھے جگا دیا۔ میری آنکھ کھلی تو اس کا مسکراتا ہوا دلکش چہرہ نظر آیا۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ بولی۔ "دونوں پنڈت مہاراج آگئے ہیں۔ آپ جلدی سے اٹھ کر اٹھان کر لیں، پھر میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔"

کاشی کا کھٹا ہوا تر دنازہ دلکش اور حسین چہرہ دیکھ کر میں بھی کھل اٹھا۔ اور پھر اچانک ایک مشہور شاعر کی غزل میرے دماغ میں آگئی۔

محسوس ہو رہی ہے تنہائی گزرا نہیں تیرے بغیر
کوئی ساتھی بھی نہیں میرا سہارا نہیں تیرے بغیر
رفیق گلستاں زینت جہاں تو بہت دکھی
کوئی اور من کو بھاتا نظارہ نہیں تیرے بغیر
کیونکہ زمانے والے ہم کو اپنا سمجھ بیٹھے
کوئی اور اس جہاں میں ہمارا نہیں تیرے بغیر
فسانہ زندگی میں نے تیرے نام لکھ دیا
اب کوئی عنوان کوئی شمار نہیں تیرے بغیر

میں انہی اشعار میں کھویا پڑا تھا کہ وہ بولی۔ "بابو جی کہاں کھو گئے، پنڈت جی آگئے ہیں، جلدی سے جا کر اٹھان کر لیں، کیا آٹھ بجے کوئی نہیں چاہ رہا ہے، کیا آج صبح جلدی آئی، میں جارہی ہوں کہیں رام لال جی آواز نہ دے رہے ہیں۔"

اور پھر صحت وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں تو بس اس کے خیالوں میں اپنا سدا بدھ کھو بیٹھا تھا۔ لیکن پھر میں نے اپنے سر کو جھکا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا، کپڑے لے کر اٹھان کے لئے چل پڑا۔

جلدی جلدی اٹھان سے فارغ ہو کر کمرے میں آ گیا۔ کاشی میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کاشی فوراً ناشتہ لے

کر آگئی، گرم گرم پوریوں، آلو کی، بھجیا اور پھر گرم دودھ پتی کی چائے نے حرا دوبالا کر دیا۔ آج تو ناشتہ کرنے تک وہ میرے پاس بیٹھی بھی نہیں۔ اور جاتے جاتے بول گئی۔ "میں مندر میں جارہی ہوں، آپ ناشتہ کر کے جلدی سے مندر میں آ جائیں۔ مندر سے واپسی پر میں برتن اٹھا لوں گی۔"

میں نے ناشتہ کیا اور جلدی سے مندر میں پہنچا۔ مندر میں دونوں پنڈت مہاراج بیٹھے لوگوں سے چڑھا دے وصول کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر رام لال جی نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ اس جگہ بیٹھ جاؤ، میں خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد بڑے پنڈت جی نے اشلوک پڑھنا شروع کیا، ساتھ ہی ساتھ مندر میں لگی گھنٹیاں بھی بجائی جانے لگیں، اشلوک سے فارغ ہو کر پنڈت جی بولے۔

"سجنو! میں اور رام لال آج دوپہر کے بعد ایک جگہ جائیں گے، یعنی میں اپنے گرد جی کے پاس جاؤں گا، کیونکہ صحن راج کی مرتبہ، میرے برداشت سے باہر ہے، گوپی کی آتما اب ظالم اور خون بن چکی ہے، چلو میں ہی کیا سارے گاؤں والے مانتے ہیں کہ ٹھا کر چندر نے اس کی اور اس کی پتری چندر کسی کے ساتھ انیائے کیا، بہت زیادہ ظلم کیا، ناقابل برداشت اور ناقابل یقین پاپ کیا، اور اس کو اس کی سزا مل گئی، گوپی کی آتما نے اسے ترک میں پہنچا دیا، اس کے بعد اس نے چندر کے پر پورا کا بھی خاتمہ کر دیا، اس کے بعد وہ گاؤں کے جوانوں کے پیچھے پر گیا، اور یہ ٹھیک نہیں، میں نے ترشول گاؤں کو کنڈل کر دیا تھا۔ مرنے جانے کس مورکھ نے سارے کنڈل اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

میں نے گرد جی سے جتنی رابطہ کیا تو گرد جی نے فرمایا ہے کہ تم میرے امتحان پر آ جاؤ، میں گوپی کی آتما کے لئے مضبوط پائے کرتا ہوں۔ یعنی گوپی کی آتما کا خاتمہ۔"

پنڈت جی کی بات سن کر ایک ضعیف فحش اٹھا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "پنڈت جی، ہم گاؤں والوں کی اچھا ہے کہ یہ کام جلد از جلد ہو جائے، اور ویسے یہ

کام تو بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ گاؤں کے کتے جوان خونی آتما کی بیعت چڑھ گئے۔ آپ گردی سے ہم تمام گاؤں والوں کی طرف سے غنی کرنا کہ وہ اس کام کو بخشنی جلدی ہو سکے کر دیں، تاکہ ہم گاؤں والے سبہ ہوئے جو خوفزدہ زندگی گزار رہے ہیں، ہر بات میں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ یہ نہیں وہ خونی آتما کب آجائے، پنڈت جی مجھے یہی کہنا تھا۔ آگیا جانا ہوں۔“

”کیش کا کا، آپ کی بات درست ہے، آپ صحیح کہہ رہے ہیں، کبھی کبھی کسی کام کے لئے بہانہ بن جاتا ہے، اور بھگوان سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ یہ سب بھگوان کی لیلیا ہے۔“

آپ سب شانت رہیں، اس کث کو تو دور کرنے کے لئے میں گردی کے آتماں پر جارہا ہوں، مجھے امید ہے کہ یہ کام پورا ہو جائے گا، اور میری تو کوشش ہوگی کہ گردی میرے ساتھ یہاں پر آئیں اور اپنے ہاتھ سے یہ بھگوان کر دیں، جس سے کوئی کی خونی آتما کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے، سنسار سے اس کا نشوونما اب نکلے گی۔

ٹھیک ہے اب آپ لوگ اپنے اپنے کام سے جاؤ، دوپہر کے بعد ہم دونوں، گردی کے پاس جانے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔“ پنڈت جی کی بات سن کر مندر میں موجود سارے لوگ مندر سے نکلے چلے گئے۔

مندر کے کام سے فارغ ہو کر دونوں پنڈت جی اپنے کمرے میں آئے، دونوں نے اشناں کیا کیونکہ گری زیادہ تھی۔ بھوجن کھایا اور تھوڑی دیر آرام کے لئے لیٹ گئے۔

کاشی میرے لئے بھی کھانا لے آئی اور میرے آگے کھانا رکھ کر بولی۔ ”بابو جی۔ آپ کھانا کھائیں، میں چلتی ہوں، پھر بعد میں ملوں گی، اس وقت یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں، دونوں پنڈت مہاراج گردی کے پاس جانے والے ہیں۔ ابھی تو آرام کر رہے ہیں، پہلے نہیں کب ان کی آنکھ کھل جائے اور وہ آواز دے لیں، یا پھر آپ کے کمرے میں آجائیں۔ تو میرا اس سے ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔“

اور یہ بول کر اس نے ایک بھر پور نظر مجھ پر ڈالی اور سرائی ہوئی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور ہر پریٹ کر وقت کے تانے بانے میں کھو گیا۔ لیکن آکر جھپٹتے ہی فوراً کاشی کا خیال دماغ میں گردش کرنے لگا، اور جھٹ میری آنکھ کھل جاتی، خیر میں اٹھا اور کمرے سے ٹھنڈا پانی نکال کر پی لیا۔ منہ پر بھی پانی کے چھینٹے مارے۔ پانی کے چھینٹے مارنے پر ڈر اس کو ملتا تو پھر بستر پر لیٹ کر اور آنکھیں بند کر لیں، مجھے آنکھیں بند کئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ رام لال جی کمرے میں آئے، میں نے آہٹ پا کر جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”پر تاب! میں اور پنڈت جی تو جا رہے ہیں، تم بالکل کسی بات کی پختہ نہ کرنا، اور اندر کا ذرا خیال رکھنا، دیے تو کوئی ذرا خوف نہیں لیکن پرش کے مقابلے میں تار یوں کا دل نازک ہوتا ہے، ہماری دانہسی پرسوں ہو کہ بہر حال تم جو کس رہتا اور خیال رکھنا۔“

اور ہاں، میں نے کاشی سے کہہ دیا ہے کہ تمہارا کھانا پینے کا ہر طرح سے خیال رکھے، اور پھر دروازہ اپنا مضبوطی سے بند کر دینا، دروازہ کھول کر نہیں سوتا۔“ اور یہ بول کر کمرے سے نکل گئے۔

آج اندھرا پھیلنے ہی کاشی رات کا کھانا لے کر آ گئی۔ اس نے کھانا میرے سامنے رکھ دیا۔ کھانا دیکھ کر میں مسکراتے لگا اور بولا۔ ”کاشی آج کیا کوئی خاص بات ہے یا پھر تم کہیں جا رہی ہو کہ آج اتنی جلدی کھانا لے کر آ گئی۔ آج سے پہلے تو تم اتنی جلدی کھانا نہیں لائی، یا ابیا تو نہیں کہ کھانا پانے والی جلدی سے کھانا پکا کر کہیں جانے والی ہو؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے سوچا آج آپ کو جلدی کھانا کھلا دوں، کیونکہ آج میں تھوڑی دیر تک اپنے ساتھی تار یوں کے پاس بیٹھوں گی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ کاشی آج تو دونوں پنڈت مہاراج ہیں نہیں تو کیوں نہ تم ایک جگہ تھوڑی دیر تک بیٹھ کر بائیں کر کے سن بہلائیں۔ اور جب غنڈا آنے لگے تو اپنے اپنے کمرے کو مضبوطی سے

بند کر کے سو جائیں، کیونکہ جاتے سے چھوٹے پنڈت جی نے تاکید سے کہا ہے کہ اپنے کمرے کی کنڈی مضبوطی سے بند کر لینا۔“

اسی وجہ سے میں نے آج جلدی کھانا لے آئی اور یہ بھی سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کمرے پیچھے میرے کمرے میں آجائیں اور اگر میں کمرے میں نہ ملوں تو۔۔۔“ اور کاشی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور ایک تک میری جانب دیکھ کر مسکرائی گئی۔

اس وقت ایسا لگتا تھا کہ سنسار کی ساری مصیبت سہم کر اس کے چہرے میں سامتی ہو، اور یہی نہیں بلکہ پورے سنسار کا حسن بھی سہم کر اس پر چھارو ہو گیا ہو۔

”کاشی تمہارا اس طرح دیکھنا مجھے مار ڈالتا ہے، میرا من میرے قابو میں نہیں رہتا، تم کس قدر مسرور ہو، اس کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں، بس من چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھ جاؤں اور تمہارے حسن کی دلکشی میں کھو جاؤں اور اس طرح جیون بیت جائے، ایٹھو نے تمہیں بڑی فرصت میں بنایا ہوگا، اگر کوئی میری نظر سے نہیں دیکھے تو اسے گئے گا کہ تم سے بڑھ کر پورے سنسار میں کوئی اور خوب صورت اور حسین نہیں ہوگا جتنا تم ہو۔“ میں نے کہا۔

”چلیں میں آپ کی بات مان لیتی ہوں اور آپ بھی میری نظر میں جو ہیں اس کے لئے میرے پاس بھی الفاظ نہیں اور شاید کبھی بھی ان الفاظ کو نہ پاسوں گی کہ آپ کا من۔۔۔“ اور اس نے بات مکمل نہیں کی۔ پھر جھٹ سے لپٹ۔ ”اچھا اب چپ چاپ کھانا کھائیں، انہی باتوں کے لئے بہت سے پڑا ہے، میں جلدی جا رہی ہوں، وہ تینوں میرا انتظار کر رہی ہوں گی، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے زخمی تے ڈھونڈتے اس طرف نکل آئیں اور مجھے آپ کے اتنا قریب دیکھ کر دانتوں میں اپنی انگلیاں دبائیں اور نظریں جھکا کر اسے پاؤں بھاگ جائیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، پھر آؤں گی اور برتن لے جاؤں گی۔“

”ارے تو کیا میں اکیلے ہی کھانا کھاؤں گا، کم از کم چار لوگوں کے لئے تو میرا ساتھ دو۔“ میں نے کہا۔

”ابھی سارے نوالے آپ خود ہی کھا لیں، میں بعد میں آؤں گی، تو آپ کے لئے گڑ کے چاول لٹی آؤں گی، آج رجنی نے گڑ کے چاول بنائے ہیں، بول رہی تھی کہ آج میرا من گڑ کے چاول کھانے کو کر رہا ہے، دیے بھی آج تو دونوں پنڈت مہاراج ہیں نہیں۔ جب گڑ کے چاول لاؤں گی تو آپ کے ساتھ دو چار نوالے کھا لوں گی، اب آپ اچھے بچے کی طرح میری بات مان لیں، اور کھانا کھائیں، مجھے واپس آنے میں کوئی گھنٹہ بھرتو لگے گا۔“ اور وہ چلی گئی۔

میں سن پر جبر کر کے کھانا کھانے لگا، کیونکہ اگر اس سے کھانا نہیں کھاتا تو کھانا ٹھنڈا ہو جاتا اور پھر کھانے کا سارا سواد ختم ہو جاتا۔ خیر پورا کھانا تو میں نے نہیں کھایا، آدھا سے زیادہ بچا دیا۔ دیے بھی اتنی جلدی اور پھر آج دن میں دیر سے کھانا کھایا تھا اور کھانا ابھی ہضم نہیں ہو پایا تھا۔ دیے روزانہ کھانے کا سے آٹھ سے ساڑھے آٹھ بجے کا ہوتا تھا۔

خیر میں نے جو بھی کھایا جتنا بھی کھایا، کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھویا اور لاٹین بجا کر بستر پر لیٹ گیا۔

انتظار۔۔۔۔۔ اور پھر انتظار کرتے ہوئے میں کروشیں بدلتے لگا، اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ جب کسی کو ٹوٹ کر چاہا جاتا ہے تو اس کا انتظار کتنا کٹھن ہوتا ہے، اب آئے کہ۔۔۔۔۔ تب آئے۔۔۔۔۔ اور اس طرح میں ایک ایک پل کو گنتے لگا۔ کروشیں بدلتے بدلتے جب میں ٹھک جاتا تو اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ جاتا۔

رات کا شاید دس بجے کا سہ ہوگا، جب کمرے میں کسی کے آنے کا احساس ہوا، وہ دے دے تپسوں آئی اور اندھیرے میں میرے درجہ کو ٹوٹ کر میرے جسم سے لگ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”پر تاب بابو! سو گئے کیا؟“

میرے من میں جھٹ آیا کہ میں اس سے سوتا ہوں جاؤں، اس نے پھر گشکی کی۔ ”تپ بابو۔۔۔۔۔ سو گئے کیا؟“ اور پھر میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوٹنے لگی۔

اس کا انداز اتنا غضب کا تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں ترنت اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم تو آج



غیر انسانی مخلوق

محمد رضوان قیوم - راولپنڈی

پورا گھرانہ اپنی خوبصورتی اور فیاضی میں اپنی مثال آپ تھا، انہیں دیکھ کر لوگ عیش عیش کر اٹھتے تھے کہ اچانک ان کے کانوں میں بانسری کی مدد بھری آواز ٹکرائی تو ان کی ہیبت بدلنے لگی اور پھر.....

یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہنا دیدہ اور اورانی مخلوق دنیا میں عام انسانوں کی طرح رہتی ہیں

وہاں اس کے نام کی مناسبت سے عورتوں کے حوالے سے اشیاء ملا کرتی تھیں۔ اس دور میں بھی عورتیں زیادہ چٹ پٹی اشیاء کھانے کی شوقین ہوا کرتی تھیں۔

لیکن بازار میں کافی رات تک خریداریوں کا رش رہا کرتا تھا میری جس مقام پر ریڑھی لگتی تھی، وہ اتفاق سے ایک قسم کا ایسا چوک تھا جہاں سے مزید اور بازاروں کا بھی ایک ٹک تھا۔ میرا جب گول گپے کی ریڑھی کا کام

ذیبر نظر کہانی کے راوی عبداللہ چاچا ہیں جو خود اس کہانی کے ایک کردار تھے اب اس کہانی کو ان کی زبانی سنیں۔

یہ 1942ء کی بات ہے میں ابدالہ سٹی کے لیکن بازار میں اپنی سرکاری نوکری کی ڈیوٹی دینے کے بعد شام کو گول گپے کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ میں جس بازار میں اپنی ریڑھی لگاتا تھا

جاگتے۔ میں اپنی جگہ لیٹ گیا تو وہ بھی میرے پہلو میں لیٹ گئی۔

اس کے لب کلمے اور اس کی سرگوشی سنائی دی۔ ”پر تاب! ایک بات پوچھوں؟“

”شکر ہے کہ تمہیں میرا نام تو یاد آیا، ورنہ تو تم نے باپو جی..... باپو جی..... کارنا لگا رکھا تھا۔ اب تمہارے من سے اپنا نام کن کر لگا ہے کہ تمہارے من میں بھی میری چاہت زیادہ ہے اور ہاں! پوچھو! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“ میں نے کہا۔

”پر تاب! میں تمہیں بتاؤں کہ تم میری اب تک کی زندگی میں وہ واحد وجود ہوئے کہ میں اپنی جان سے بھی زیادہ چاہنے لگی ہوں۔ کہیں تم مجھے سچ منہ ہار میں چھوڑ تو نہیں دوں گے..... کہیں تمہارا من اور جگہ لگ جائے اور تم مجھے دھوکہ دے دو۔ کہیں ایسا تو نہیں کرو گے؟“ وہ ایک ایک لفظ کو چبا کر بولی۔

”کاشنی؟“

”جی بولیں! میں سن رہی ہوں۔“

”کاشنی اگر تم کو کہ مجھے اپنا دل دے دو تو میں بلا

جھجک اپنا سینہ چیر کر، اپنا دل اپنے ہاتھوں نکال کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا، میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں، اپنی زندگی تو ہار سکتا ہوں مگر کسی بھی صورت تمہیں خود دے الگ نہیں کر سکتا، یہ میرا وجہ ہے۔“

اور پھر وہ مجھ سے چٹ کر مجھے زور سے دہرایا۔ اس کی گرم گرم بے قابو سانسیں میری سانسوں سے ٹکرائیں۔ اور پھر جذبات سے مغلوب ہو کر طوفانی تیزخبروں میں ہمارے قدم اکڑ گئے اور پھر ہم ہوش سے بیگانہ ہمارے میں بہتے چلے گئے۔

کہ اچانک کسی کھوڑے کے تنہانے اور اس کے ناپوں کی آواز سن کر کاٹنی لڑ کر رہ گئی، اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا، وہ اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لائی اور میرے کان میں گھبراہٹ ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ ”پر تاب! بھگوان خیر کرے۔“ (جاری ہے)

مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا کر جیسے بھول گئی تھیں۔ اوہ.....! بھگوان! میں تو انتظار کرتے کرتے اکڑ کر رہ گیا۔ مجھے آج پتہ چلا کہ اپنے من میت کا انتظار کتنا ٹھنسا ہوتا ہے۔“

”ارے میں بھی تو اپنی جگہ ترپ رہی تھی، ان تینوں نے تو مجھے جیسے جکڑ لیا تھا، لاکھ بولتی رہی کہ بھی اب مجھے سخت تینڈا رہی ہے، مگر مجال ہے جو میری بات ان کے کان میں جاری تھی۔“

”اچھا تھوڑی دیر اور بیٹھ..... تھوڑی دیر اور کبھی..... کون سا آج سویرے اٹھتا ہے اور پھر مندر جانا ہے، ایسا موقع تو سالوں میں بھی کبھی ملتا ہے۔“

خیر میں بڑی مشکل سے جان چھڑا کر پہلے اپنے کمرے میں آئی۔ اور پھر کوئی آدھا گھنٹہ تک اپنے کمرے میں بیٹی رہی، اور دروازہ بھی ذرا زور سے بند کیا کہ انہیں پتہ لگ جائے کہ میں اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا ہے۔

”ویسے بھی ان تینوں کی عادت ہے کہ بستر پر گرتے ہی بے خبر ہو جاتی ہیں، اور صبح سے پہلے ان کی آنکھ ہرگز نہیں کھلتی۔“

ارے ہاں! میں گڑ کے چاول لائی ہوں، اور موم جی بھی لائی ہوں، لائٹیں، اس سے جلا نا ٹھیک نہیں۔ پہلے میں دروازہ بند کر کے کواڑ کے نیچے جھری میں کپڑا لٹھوس دیتی ہوں تاکہ روشنی باہر نہ جا سکے۔“

اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ دروازہ بند کر کے دروازہ کے کواڑ کے نیچے جو لگی سی جھری تھی اس میں کپڑا ٹھوسا اور پھر بعد میں موم جی جلائی۔ لیکن موم جی کی روشنی زیادہ تھی۔ اس لئے لائٹیں جلا کر اسے مدھم کر دیا اور موم جی بجھادی۔ کمرے میں بہت ہی دھکی روشنی پھیل گئی۔ پھر اس نے تھنٹے گڑ کے چاول میرے سامنے رکھ دیا اور بولی۔

”چلیں اب آپ یہ چاول کھائیں۔“

کتورے میں تھوڑے سے چاول تھے، خیر ہم دونوں نے نل کر وہ چاول کھائے۔

”چاول کھا تے ہی پانی پی لینے کے بعد اس نے لائٹیں بجھادی اور بولی۔ ”اب آپ آرام سے لیٹ

بہت اچھا چلنے لگا تو میری دیکھا دیکھی میرے قریب ہی ایک چھوٹے گی ریڑھی "نورن" نامی ایک شخص نے لگائی تھی شروع شروع میں تو مجھے اس کی آمد بردی لگی۔ اس کے متعلق میں یہ سوچا اور سمجھ رہا تھا کہ یہ میرے کاروبار میں آؤں رہا ہے لیکن میری یہ سوچ غلط تھی۔ اس کی ریڑھی میرے ساتھ جڑنے سے ہم دونوں کا کام واہ واہ دوگنا ہو گیا تھا۔ سارا دن عورتیں لڑکیاں ہماری ریڑھی پر گول گپے چھو لے کھاتی رہتی تھیں وہ آہستہ آہستہ میرا دوست بن گیا تھا وہ میری توقعات سے زیادہ اچھا اور خلص انسان تھا اس نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اپنے گول گپے میں مزید ذائقہ لانے کے لئے اس میں میری بنائی چاٹ استعمال کیا کرو۔ اس سے ہم دونوں کو بہت فائدہ ہوگا۔"

میں اس سے تیار چٹ پنی چاٹ لے کر اپنے گول گپے میں ڈالنے لگا تو واقعی اس کا مشورہ کامیاب رہا۔ چٹ پنے کھانے کے شوقینوں کو ایسے کھلے پیٹھے چھو لے چاٹ بھرے گول گپے کھانے سے اب دوگنا مٹا آتا تھا۔

رفتہ رفتہ میرا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں نے اپنی لگی لگائی سرکاری نوکری چھوڑ دی۔ اور میں فل ٹائم ریڑھی لگانے لگا تھا۔

نورن کا کام بھی اچھا چل پڑا تھا بعض دفعہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ریڑھیوں سے وہ چیزیں لے لیا کرتے تھے جس کی ہمارے پاس کی ہوتی تھی ہم دونوں اپنی ریڑھی رات کو تقریباً ایک دو بجے تک بند کرتے تھے۔

ہم دونوں نے مشترکہ طور پر اپنی ریڑھیوں کی دھلائی مصفا کی کے لئے ایک غریب شخص کو رکھ لیا تھا جو اس زمانہ میں ایک روپیہ روز لیتا تھا اس کا نام "میدو" تھا اس شخص کا معمول تھا کہ وہ صبح 10 بجے آتا اور رات گئے تک رہتا تھا وہ بہت زیادہ سختی تھا۔

ایک دن ہم رات گئے جب اپنی ریڑھیاں بند کرنے گئے تو میدو تیز تیز پٹیں دھو رہا تھا کہ اچانک

ایک انگریز جوڑا ہماری جانب آبا ان کے ساتھ ایک خوبصورت پتی بھی تھی قریب آنے پر پتا چلا کہ جسے ہم گورا سمجھ رہے تھے وہ تو دینی شخص ہے جبکہ اس کے ساتھ آئی ہوئی پتی اور اس کی بیوی خالصتاً انگریز تھی۔ اس دینی شخص کا لباس تو گوروں والا تھا لیکن اس کی زبان بالکل متای لوگوں کی طرح تھی۔

"ہاں بھئی تین چار گول گپے ذرا ہماری بیگم کو کھلاؤ گے۔" اس شخص نے کہا۔

"اچھا حضور!" میں جواب دیا۔

میں نے پلیٹ کو اچھی طرح کپڑے سے صاف کر کے اس میں چار گول گپے بچا دیے اور ساتھ ہی کھٹائی پانی ایک پیالے میں ڈال کر انہیں دیا۔ میم نے گول گپوں کو کھٹے پانی میں ڈبو کر کھایا وہ بڑے خوبصورت انگریزی زبان میں بولی Very, Very Sour (بہت کھٹا ہے)

اس نے اپنے لبوں سے سی سی کی آواز نکالی شروع کر دی تھی۔

وہ میم شکل و صورت سے انتہائی خوبصورت سرخ و سفید چہرے کی حامل تھی "But Very Tasty" (لیکن بہت مزیدار ہیں)

اس دینی شخص نے مجھے اردو میں کہا کہ "اسے مزید گول گپے نہ بناؤ ورنہ اس کا گلا خراب ہو جائے گا۔"

"اچھا سر۔" میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"More" (اور چاہئے) اس میم کے اور ہاتھ سے لگتا تھا کہ اس کو گول گپوں کا ذائقہ کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔

"مجھے اور کھٹے بال چاہئیں" اس نے اپنی انگریزی میں یہ جملہ کہا تو وہاں کھڑے ہم لوگ ہنسنے لگے۔ گوری نے بغیر ہو کر میرے چھایہ میں پڑے گول گپوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو میم صاحب کو دووانے اور ڈال دو۔" صاحب نے کہا۔

جبکہ ان کے ساتھ آئی گولڈن بالوں پر مشتمل

پتی بڑے آرام سے اس جگہ پڑے ہوئے بیٹھ پر بیٹھ گئی وہ اپنی ماں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی اس کی عمر دیکھنے میں 4 سال کے لگ بھگ تھی وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اس کے بھی بال ہتھکریالے، سنہری تھے۔ جبکہ اس کی آنکھوں کے ڈیلے بالکل سبز رنگ کے تھے۔ اس کے چہروں میں زارک نیلے جوتے بہت اچھے لگ رہے تھے وہ دیکھنے میں بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی جیتی ہوئی گڑیا ہو۔

میں نے ایک سوکھا گول گپا اسے دیا تو وہ وہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرنے لگی کہ مجھے پانی میں میں ڈبو کر دو۔

اس کے باپ نے مجھے منع کیا "تم اسے کھٹا پانی نہ دینا۔"

"بیوی کو!" صاحب نے میم سے کہا۔

میم نے مجھے خالی گول گپوں کی پلیٹ دیتے ہوئے کہا

"ویری ٹھیک!"

صاحب نے مجھے اس زمانے میں دس روپے دیئے۔ حالانکہ ان گول گپوں کی قیمت ایک پیسہ تھی۔

میں نے اس سے کہا "یہ بہت ہیں۔" تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو براہ کرم۔"

میری جانب نورن (میری اچھی لگی دیہاڑی والی) بھر سے حیرت سے دیکھ رہا تھا اسے جب میم نے محسوس کیا تو اس نے 5 روپے اسے بھی دیئے اور نیچے بٹنے میدو کو جو برتن دور ہاتھ اسے بھی دو روپے دیئے۔ وہ بھر پلے گئے۔

نورن نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے میم صاحب کی طبیعت اچھل پھل ہے اس نے اس کا کھٹا کھانے کا دل کر رہا ہوگا۔ دیئے عموماً گورے کھٹا کھانا پسند نہیں کرتے۔"

"یاد رہے میم کتنی خوبصورت اور ساتھ ہی اچھے دل کی مالک تھی۔" میں نے نورن سے کہا۔

"نومیم کی بات کر رہا ہے وہ پتی تو اس سے

دو ہاتھ آگے حسین و خوبصورت تھی۔ صاحب اس بچی کا نام فینسی لے رہا تھا۔ ایک ہماری بیویاں ہیں کالی کلوٹی جمل لنگڑیاں ہوتی رہیں۔"

ارے باؤجی۔ یہ میم ویم گورے انگریزوں کی صرف چڑی ہی گوری اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں لیکن جگ پوجھو تو ان کے دل اندر سے کالے تھیں بھرے ہوتے ہیں اور ان کے ذرا قریب جاؤ تو بھگوان قسم ان کے جسم سے ایسی ہلکے آتی ہے جیسے کہ پیدائشی بچوں کی جڈیوں میں سے آتی ہے، ہماری عورتیں کالی چڑی والی ضرور ہوتی ہیں لیکن وفادار اور اصل حسن والی ہوتی ہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں میدو تو صحیح کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہوتی رہیں اور بھر وقت مقررہ پر ہم دونوں نے اپنی اپنی ریڑھی بند کر کے گھر کی راہ لی۔

دوسرے دن ٹھیک اسی ٹائم رات کو پھر وہی جوڑا ہماری ریڑھیوں کے پاس آیا۔ "یاد رہا رے گول گپوں میں ایسا کونسا جاوؤنی امرت ہے جس کو پکھنے کے بعد میری بیگم ان گول گپوں پر عاشق ہو گئی ہے، یہ آج مجھے قصداً لائی ہے۔" صاحب نے کہا۔

"اسے ایک پلیٹ بنا دو اور مجھے دو چار پیسے ڈال دو۔"

میں ابھی گول گپوں کو چٹا کر اس میں چھو لے اور پانی بھی صحیح طریقہ سے نہیں ڈال پایا تھا کہ میم نے میرے ہاتھوں سے عدیہوں کی طرح پلیٹ جھٹ سے چھین لی۔ مجھے یہاں وہ بڑی بدتمیز لگی تھی۔ لیکن میں منہ سے کچھ نہ بولا۔

اس شخص سے میں نے ادب سے پوچھا "سر آپ کہاں کام کرتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں سروے آف انڈیا۔" مجھے میں بحیثیت اسٹنٹ ڈائریکٹر آیا ہوں۔ اور تمہارے اس خوبصورت شہر میں تقریباً ایک ماہ رہوں گا۔"

”یہ کون سا حکم ہے صاحب۔“ میں نے پوچھا۔
نورن میری بات کا تے ہوئے بولا۔ ”یاد رکھ اس
جگہ کو کیا سمجھو گے۔“

صاحب نے طنزیہ طور پر ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم
لوگ بس کئے بیٹھے چھوٹے اور گول۔ گپے بچو۔“ نورن
شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

صاحب نے اپنی جیب سے پھر 10 روپے
نکال کر مجھے دیے اور 10 روپے نورن کو دیے
ہوئے بولا۔ ”میری بات سے شاید تمہارا دل دکھا ہو میں
اس لئے معذرت چاہتا ہوں یہ لو 5 روپے میں خود اپنے
آج پر جرمانہ ڈالتا ہوں۔ اور یہ پانچ روپے اس کو دے
دو۔“ میدو کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں نہیں سر۔ ایسی کوئی بات نہیں آپ
اچھے دل کے مالک ہیں اللہ آپ کو خوش
رکھے۔“ نورن بولا۔

صاحب نے کہا۔ ”یہ بچی ذرا آپ کے پاس کچھ
دیر بیٹھنے لگی۔ ہم تھوڑی دیر بعد آتے ہیں۔“
”سر اس وقت تقریباً ساری دکانیں بند ہو چکی
ہیں اور دوسرے وہاں آگے کچھ تفریح کے لئے نہیں
ہے۔“ میں نے کہا۔

”بھئی ہم تفریح کے لئے تھوڑی آئے
ہیں۔ دراصل ہم صاحب پر یکھٹ ہیں انہیں ڈاکٹر نے
زیادہ سے زیادہ چلنے کو کہا ہے۔“ صاحب نے بڑی بے
باکی سے کہا۔

نورن نے مجھے اس طرح آنکھ ماری جیسے کہ وہ
مجھ سے کہہ رہا ہو کہ میرا اس مہم کے بارے میں صحیح شک
تھا کہ یہ اس حال سے ہے۔

”جی سر! ابھی ہم دونوں کچھ دیر یہاں رہیں
گے۔ آپ بے شک تھوڑی دیر بعد آرام سے آجائے
بچی ہمارے پاس ہی بیٹھی رہے گی۔“ اور پھر وہ دونوں
چلے گئے۔

نورن نے اپنی ریڑھی کا کام سمیٹا اور اپنے
گھر چلا گیا۔ میں اکیلا اس بچی کے ساتھ بیٹھا رہا۔

میدو بھی میرے ساتھ بندھا رہا اب آئے کب آئے
مثال والی انتظار کی کیفیت شروع ہو گئی تھی۔

بہر حال وہ دونوں کافی دیر بعد آئے جھکن کی وجہ
سے میں حال سے بے حال تھا اور پھر نیند کا جھونکا بھی
مجھے تنگ کر رہا تھا۔

”سوری! ہم ذرا دور چلے گئے تھے۔“ صاحب
نے معذرت کی بہت ہی خوش اخلاقی سے۔

میں نے بھی جواباً مصنوعی خوش اخلاقی سے
کہا۔ ”کوئی بات نہیں سر۔“

صاحب نے اپنی جیب سے پھر کچھ روپے مجھے
اور میدو کو دیئے نوٹوں کو دیکھ کر ہماری ساری نیند
اور تھکاوٹ فوراً اڑن چھو ہو گئی ایک آدھ دن چھوڑ کر
صاحب بعد اپنی میم اور بچی کے ساتھ لاٹزنا اس ایک
مخصوص رات کے وقت ہمارے پاس آتے تھے۔
ان کی ذات سے ہم غریبوں کی مسلسل اچھی
دیہاڑیاں گلنے لگی تھیں۔

ایک رات صاحب نے اپنا نام بیاس سنگھ بتلایا
نیز یہ بھی بتلایا کہ وہ ناروال گاؤں کا رہنے والا ہے اور وہ
اپنی تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر لندن پڑھنے گیا تھا وہاں
اس مہم جس کا نام بیوی ہے (جو واقعی حسین اور سراپے
کے لحاظ سے انتہائی بیوی کی قسم تھی) ہمارے درمیان عشق
شروع ہو گیا تھا اور پھر ہم نے شادی کر لی۔ ہم لوگ
جلد واپس لندن چلے جائیں گے۔“

ایک دن نورن نے مجھ سے کہا۔ ”یہ آفسر
ہمارے بڑے کام آ سکتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

اس نے کہا۔ ”یہ اپنے جھگے کا ڈائریکٹر ہے اس
سے میں یہ کام لوں گا کہ اپنے بڑے بیٹے کو اس کے جھگے
میں بھرتی کر اؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”یار اس سے ہمیں یہ کام
لیتا چاہئے کہ اس کی بدولت ہم انبالہ میونسپل کمیٹی سے
اپنی ریڑھی کا مستقل لائسنس لے لیں۔“
”یار تو دھیرج رکھ۔ دیکھ میں کس چال پوسی سے

بیاس سنگھ سے کام لیتا ہوں۔“ اس نے بڑے وثوق
سے کہا تھا۔

حسب معمول ایک رات بیوی نے میری
ریڑھی سے گول گپے کھائے اور وہ دونوں میاں بیوی
ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بازار کی جانب
کلنے گئے۔ جبکہ بچی فنی ہمارے پاس بیٹھ رہی تھی۔

بیاس سنگھ چکر لگانے کے بعد مجھے لازمی مزید
روپے دیتا تھا اس کی جانب سے دیئے گئے ایکسٹرا
مفت کے روپوں کا لالچ میری نیند کے آئے شمار
پر حاوی رہتا تھا۔

ایک رات نورن معمول کے مطابق چلا گیا
تھا جبکہ میدو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں میدو کا
ایک پرانا دوست اس جیسا ہی غریب وہاں آ نکلا۔ وہ
وینچے میں بالکل عام مزدور سالک رہا تھا اس کے
کپڑے پھٹے ہوئے۔ پاؤں میں سستی سستی ہوئی چنیل
اس کی غربت کی واضح عکاسی کر رہی تھی۔

وہ زمین پر بیٹھے برتن دھوتا میدو سے بڑی گرم
جوش سے ملا۔ ”میں ان کے پاس کام کرتا ہوں۔“ میدو
نے اس سے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

میں نے اخلاطاً اسے سلام کیا تو اس نے جواباً
مجھے غصے سے دیکھا تو میں نے پوچھا۔ ”آپ کا نام
کیا ہے؟“

”کنیش“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ میں نے پھر سوال کر دیا۔

اس نے مایوسی سے کہا کہ ”آج کل فارغ
ہوں۔ میں پہلے گھرات میں ایک ایسے شخص کے پاس
کام کرتا تھا جو کہ روحوں، بدروحوں سے واسطہ
اور جادوگری کے کام کرتا تھا اب وہ مر گیا ہے لہذا میرا
کام بھی وہاں سے چھوٹ گیا ہے الغرض اب میں فارغ
ہوں۔ میں اب یہاں پر اپنے ماموں کے پاس آیا ہوں
ان کا یہاں کافی بیکوں کا کارخانہ ہے۔ میں ان کے
پاس بیٹھ رہا ہوں گا۔“

چونکہ وہ میدو کا مہمان تھا اس لئے میں نے اس

کے لئے سوئے کی بوتل منگوا دی۔ اس نے بلا تامل غٹا
غٹا اسے پینا شروع کر دیا۔

اس کے بعد اس نے بڑے منہ پھٹ انداز میں
کہا۔ ”کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مجھے چھوٹے نمبر سے گول
گپے کھلا دیں۔“

”یہ تو گلے پڑنے والا مہمان ہے۔“ میں نے دل
میں سوچا۔ بہر حال میں نے اسے ایک گول گپے والی
پلیٹ بنا کر دے دی۔ گول گپے کھانے کے بعد وہ میدو
کو یہ کہہ کر چلا گیا کہ ”اچھا ہوا تو مجھے مل گیا اب ہماری
دوستی خوب پروان چڑھنے کی میں کل پھر آؤں گا۔“

دوسرے دن وہ رات کو پھر آ گیا۔ اس بار میں
نے اسے زیادہ لفٹ ندی، میں نے اپنے ساتھ کھڑے
نورن کو کہا۔ ”یار یہ میدو کا دوست بہت لچڑا انسان
لگتا ہے۔“

نورن نے میدو کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ”اسے
اشارے اشارے میں کہہ دینا کہ میرے یہ دونوں مالک
تیری آمد سے ناراض ہیں تو یہاں نہ آیا کر۔“ میدو نے
ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں اسے طریقہ سے بھگا دوں گا۔ آپ
دھیرج رکھیں۔“

دوسرے دن رات میں وہ پھر آ گیا اور میدو
کے پاس بیٹھ کر اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا۔ اتفاق
سے وہی شخص بیاس سنگھ اپنی میم اور بچی کے ساتھ آئے
میں نے اسے موئے موئے گول گپے نکال کر ان پر کھٹی
میٹھی چٹنیاں ڈالیں اور ایک اچھی پلیٹ بمعہ کھٹے پانی
کے میم کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔

جبکہ فنیسی بچی معمول کی طرح ہمارے اسٹول
پر خاموشی سے بیٹھ گئی وہ اس دن انتہائی خوبصورت
لگ رہی تھی۔

نیچے زمین پر بیٹھا میدو کا دوست کنیش اس سے
اپنی الٹی سیدھی باتوں میں مگن تھا وہ تیز تیز بول رہا تھا وہ
بولتے بولتے رک گیا اور پھر صاحب اس کی میم اور بچی
کو کھانسی لگا کر دیکھنے لگا۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ جوں کی
چال چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا اور اس نے مڑے

سے گول گپے کھاتی میم کو تھس سے دیکھنا شروع کر دیا۔
 ”نورن نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”اوسے
 کنش پیچھے ہٹ میم صاحبہ کو آرام سے گول گپے کھانے
 دے۔“

اور صاحبہ بیاس سکھ نے اپنی ناک میں رونال
 رکھتے ہوئے کہا۔
 ”اودہ اس غلیظ شخص کے جسم سے کتنی غلیظ
 بدبو آ رہی ہے۔“
 میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”دفع
 ہو یہاں سے۔“

وہ کچھ دیر اور مسلسل دیوانہ واران تینوں کو دیکھنے
 لگا تو میں نے اسے بھڑکی دیتے ہوئے کہا۔ ”بھاگ
 یہاں سے اگر تم میدو کے دوست نہ ہوتے تو میں تمہیں
 پھینٹ مار دیتا۔“ بیاس سکھ نے اپنی میم کو مخاطب کر کے
 کہا۔ ”بیوی! آؤ ذرا چہل قدمی کر کے آئیں اس
 دیوانے کے کپڑوں میں موجود بدبو میرے دماغ پر چڑھ
 گئی ہے آؤ ذرا چہل قدمی کر لیں۔“ فنیسی آپ تھوڑی دیر
 بیٹھیں ہم ابھی آتے ہیں۔“

بیاس سکھ نے جاتے جاتے مجھے
 کہا۔ ”مسز عبدال۔“ اس بچی کا خصوصی خیال
 رکھنا اور اسے اس دیوانے سے دور رکھنا۔ دیکھو اس
 کو گندگی سے المرجی ہے۔“
 فنیسی خاموشی سے بچ پر بیٹھی رہی۔

میم اور صاحبہ کے جانے کے بعد نورن نے
 خصوصی طور پر کنش کو اپنے پاس انتہائی غصہ سے بلایا اور
 اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
 ”تو نے ہمارے اچھے معزز گاہکوں سے اتنی
 بدتمیزی کیوں کی۔“

اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں دعویٰ سے
 کہہ سکتا ہوں کہ یہ انسانی اگر بڑ نہیں بلکہ یہ کوئی
 پراسرار مخلوق ہیں۔“
 ”تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ یہ تو اپنا بیوقوفانہ دعویٰ
 کس بنیاد پر کر رہا ہے۔“ نورن نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”میں نے ان گوروں کی غیر انسانی یوکوسنگھ لی
 ہے اور دوسرے ان کی گردن کے آخری حصے پر وہ نشان
 دیکھ لیا ہے جو کہ غیر انسانی مخلوق کی گردنوں کے نیچے
 ہوتا ہے۔“

”بکواس بند کر اور یہاں سے دفع ہو جا۔“ اس
 بار تو میدو نے بھی اسے دھکارتے ہوئے کہا۔ ”تو اب
 یہاں نظر نہ آنا اور آئندہ بھی تو یہاں نظر آیا تو ہم تیری
 ٹانگیں توڑ دیں گے۔“

”یار اس جڑے کی وجہ سے ہماری ٹھیک ٹھاک
 دیہاڑی لگ جاتی ہے اور یہ اپنے پاگل پن میں لگتا ہے
 ان اچھے گاہکوں کو بھگوانے گا۔“

کنش نے اٹا بڑے ذہین بننے سے کہا۔ ”یہ
 بازار اور سڑکیں کسی کے باپ کی ملکیت نہیں ہیں میں
 یہاں ہر قیمت پر آؤں گا۔“

”چل بھاگ یہاں سے۔“ اور پھر میں نے
 غصے میں آ کر ایک زوردار پھیراس کے منہ پر بڑو دیا اس
 کے بعد وہ ہم سب کو گالیاں دیتا ہوا کہہ کر چلا گیا کہ ”تم
 لوگ ایک نہ ایک دن میری جانب سے کئے گئے دعویٰ
 کی حقیقت کو سمجھ لو گے۔“

”جا جا!“ نورن نے اسے اپنی ریڑھی پر
 پڑے ہوئے دیکھتے ہوئے کانٹے لگاتے ہوئے کہا۔ ”چل
 بھاگ یہاں سے۔“

وہ فنیسی کو بنور پاگلوں کی طرح گھورتا ہوا وہاں
 سے بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم آپس میں اس کے
 پاگل پن کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں
 دونوں میاں بیوی معمول کے مطابق چہل قدمی کر کے
 واپس آ گئے۔ بیاس سکھ نے ہمیں دوبارہ مہیے دیے۔
 میں نے بنور ان سب کی گردنوں کے نیچے کنش کے
 بتلائے ہوئے نشانات کو دیکھا۔ وہاں واقعی وہ نشانات
 موجود تھے۔

لیکن بیاس سکھ اس کی بیوی بیوی بالکل عام
 انسانوں کی طرح لگ رہے تھے وہ دونوں ہشاش بشاش

تھے۔ میں اور دو فنیسی کے قریب پیار کرنے کے بہانے
 میاں میں نے اس کی گردن کے نیچے دیکھا ہوا بلکا نشان
 دیکھا تو مجھے بھی ڈراسا کھٹکا ہوا اور یہ خیال آیا کہ ”ہوسکتا
 ہے۔ کہ ان لوگوں کا واقعی کوئی غیر انسانی مخلوق سے تعلق
 ہو۔“ ان کے جانے کے بعد میں نے نورن کو اپنے پاس
 بلایا اور اسے اپنے اندر پیدا اندیشے کو بیان کیا تو نورن
 مجھ سے بولا۔ ”یار معاف کرنا مجھے بھی تیری دماغی
 کیفیت پر پاگل پن کا شک پڑتا ہے۔“

میں اس رات کنش کی جانب سے کی گئی بات
 کو دل میں لگاے سو نہ سکا۔ مجھے بھی کوئی خیال نہ آتا
 کہ یہی کچھ۔ الغرض میں نے وہ رات بڑے کرب میں
 گزاری۔ میں صبح ہی صبح اپنے جانے والے ایک
 ایسے شخص کے پاس گیا جو کہ جادو وغیرہ کا کام کیا
 کرتا تھا۔ میں نے اسے اس جڑے اور بچی کے
 بارے میں اور کنش کے دعویٰ کے متعلق بتایا تو اس
 نے مجھے ملا جلا جواب دیا۔ ”اس زمین پر بعض دفعہ
 غیر انسانی مخلوقیں تفرقہ مدہل بہلانے کے لئے آ جاتی
 ہیں اور عوام ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی گردنوں
 کے نیچے جو مخصوص نشان تم بتا رہے ہو کچھ بات ہے
 میں نے ایسی بات کسی مانفون القطرت وجود کے
 بارے میں نہیں پڑھی ہے کنش کا دعویٰ غلط بھی ہو سکتا
 ہے اور سچ بھی۔“

لیکن اس نے مجھے مشورہ دیا کہ ”تم اس اٹلے
 سیدھے بے مقصد سوچ کو اپنے دل و دماغ پر سوار نہ
 کرو۔ بلکہ تم صرف اپنی مزدوری کر دو اور ان سے پیسے
 انہنوں۔“

دو دن بعد وہ دونوں اپنی بچی کے ساتھ آئے۔
 کنش بھی ایک آدھ دفعہ ہمارے سامنے سے
 بڑی اکرے سے گزرا حقیقت میں وہ ہمیں اپنے تئیں یہ
 بتانا چاہتا تھا کہ میں یہاں سے گزر سکتا ہوں۔ یہ
 بازار ہر کنش سرکاری ہیں کسی کے باپ کی جاگیر نہیں
 ہے۔

ہم نے اسے نہ صرف دیکھتے ہوئے نظر انداز

کر دیا تھا بلکہ اسے کوئی لفٹ نہ دی تھی۔ اس نے اپنے
 ہاتھ میں پیلے رنگ کا ایک تھملا پکڑا ہوا تھا جو کہ خالی سا
 پچکا ہوا لگ رہا تھا ایک رات پھر بیاس سکھ اپنی میم کے
 ساتھ آیا اس رات ان کے ساتھ فنیسی نہ تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”صاحبہ آج فنیسی نہیں آئی۔“
 ”بھئی وہ بھتی ہے کہ عبدل انکل کے قریب
 جو پاگل شخص نظر آتا ہے مجھے اس سے بڑا خوف آتا ہے
 اس کے پاس سے مجھے بدبو آتی ہے وہ بہت غلیظ ہے۔“
 ”سر کیا حکم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بنا دو۔ ایک آئینل پلیٹ میم صاحبہ کے لئے
 اور ایک میرے لئے۔“

میم اس دن پہلے سے زیادہ انتہائی خوبصورت
 لگ رہی تھی۔ اس کی سفید اور گلابی رنگت کی آمیزش والا
 اس کا چہرہ اور اوپر سے گہری نیلی آنکھیں دیکھنے والوں
 کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔

”یار! اس کے چہرے پر دولت حسن کی کتنی
 شادابی ہے۔ آج تو میرا دل میرے قابو سے باہر ہو رہا
 ہے۔“ نورن بولا۔

ہاں یار تو سچ کہتا ہے۔ آج یہ واقعی انتہائی
 جاذب نظر لگ رہی ہے۔ ”میں نے کہا۔ وہ گول گپے
 کھاتی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

”آہستہ آہستہ کھاؤ۔“ بیاس سکھ نے اس کی
 جانب پیار بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کنش دور سے آتا ہوا مجھے نظر آیا
 وہ تیز تیز قدم چلتا ہوا ہمارے قریب آنے لگا تھا۔ بیاس
 سکھ نے غصیلی نظروں سے اس کی جانب دیکھا
 اور پھر اس نے چپٹی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور کہا۔

”اس پاگل بد بودار شخص کو ہمارے قریب آنے
 سے روکو۔“ میں نے اپنی جگہ سے چلائے ہوئے کہا
 ”اوسے تو اگر ہمارے قریب آیا تو یاد رکھ تیرے ساتھ
 بہت برا سلوک کروں گا۔“

میں نے ایک ڈنڈا اٹھایا جبکہ نورن نے وہی
 پھینٹے والا چوٹی کھٹک پکڑ لیا تھا۔ وہ اتنی سرعت انگیزی



موت کی مسکراہٹ

عثمان غنی - پشاور

کمرے کے ملگجے اندھیرے میں درہیلو نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زندہ وجود کو اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ کر ہوا میں معلق کر لیا اور پھر دونوں چہت پر پھنچے اور دونوں وجود کو.....

عیش و نشاط کے گرداب میں غوطہ زن جسم پر سکتہ طاری کرتی ایک عبرت ناک دروازا

”اسد تم سوچو! اگر تم بتاؤ گے، تو وہ تمہیں قتل کر دے گا، وہ بہت ہی ظالم ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں ہی بتا دوں!“

”مگر افسوس میں وہ تمہیں نقصان پہنچا دے گا۔“

”خیر کچھ بھی ہوا میں اپنا ذہن بنا چکی ہوں۔ اب میں مزید تمہارے بنائیں رہ سکتی!“

”میں بھی!“ اسد بیار بھرے لہجے میں بولا۔

”اسے یہ بات بتائیں سکتیں..... وہ بہت ظالم ہے..... وہ تمہیں مار ڈالے گا۔“ اسد نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

”لیکن نے اثبات میں سر ہلادیا۔“ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

اسد کمرے میں ٹپکنے لگا۔ ”ذرا سوچو! تم کیا کہہ رہی ہو؟“

سے زمین پر گر کر بے سدا ہو گیا۔

میدو اس کی جانب لپکا اور ہم میم صاحب کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھے۔ میم جس کا سر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی صرف پشت نظر آ رہی تھی جو کہ مکمل طور پر کھردری بے رنگی ہوئی تھی کسی نے کہا۔

”میم صاحب کو اسپتال لے کر جاؤ۔“

”یہ میم نہیں ہے یہ بدروح ہے۔“ گنیش نے چلاتے ہوئے کہا، ہمیں اس کی بات کا یقین تو ہو گیا تھا کہ یہ واقعی کوئی بدروح ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اس پریشانی کی کیل دماغ میں گھس کر چہرہ رہی تھی کہ ”یہ ہوا کیا اور ہو گیا رہا ہے؟“ دماغ کچھ سمجھنے سے ماؤف ہو چکا تھا۔

اسی اثناء میں تھوڑی دیر بعد نورن نے میم صاحب کو پکڑ کر جب سیدھا کیا تو اس کا چہرہ اتنا بھیاںک، بالکل روکھا اور کراہیت انگیز ہو چکا تھا کہ وہ دیکھنے میں واقعی چڑیل لگ رہی تھی۔

نورن اسے دیکھ کر دیے اپنا حواس کھونے لگا، اس کے قدم لڑکھڑنے لگے تھے۔ جبکہ میدو وہاں سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

میری خوف کے مارے دھوتی خراب ہو گئی، وہ اب بیوی نہیں رہی تھی بلکہ مکمل چڑیل کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بجلی کی مانند شدید جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے اٹھ کر ایک اندھیری گلی میں بھاگتی ہوئی غائب ہو گئی، اسے وہاں کسی نے روکنے کی کوشش اور ہمت بھی نہ کی تھی۔ ماحول میں شدید تناؤ اور خوف کی فضا چھا چکی تھی۔

اس کہانی کا دوسرا درون ناک پہلور اوئی نے یہ بتلایا کہ گنیش نے اسی حالت یعنی بے ہوشی میں اپنی جان و سدی لیکن وہ اپنے دغوی کا کھرا نکلا تھا۔



سے ہمارے قریب آ گیا تھا کہ ہمیں اسے روکنے کا موقع تک نہ ملا۔

میں نے جب یہ دیکھا کہ وہ جنوبی انداز میں ہماری جانب آ رہا ہے تو میں نے ایک زوردار ڈنڈا اس کے کندھے پر مار دیا۔ اس نے بڑے ذہین انداز میں اپنے ہاتھ میں پکڑے تھیلے میں سے ایک بانسری نکالی اور اسے زور زور سے بجانے لگا۔ ہم اسے پکڑنے، مارنے کی کوشش کرتے تو وہ چوہے کی طرح اچھل کر اوڑھوڑے بھاگنے لگتا لیکن اس نے اپنے منہ میں لگی بانسری کو نہیں چھوڑا وہ اسے مسلسل دیوانہ وار بجانے جا رہا تھا۔

میں اور نورن اسے حریف مارنے کیلئے آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ بیاس سنگھ اپنے منہ سے عجیب و غریب کتوں اور بیلیوں والی آوازیں نکال رہا تھا وہاں سے بھاگ گیا۔ اس نے اپنی بیوی میم کی بھی پرواہ نہ کی۔

دوسری جانب میدو نے چلا چلا کر مجھے اور نورن کو آوازیں دے کر متوجہ کیا کہ ”میم کو دیکھو کیا ہو رہا ہے؟“ ہم نے گنیش کو وہیں چھوڑا اور میم صاحب کی طرف لپکے میم صاحب کے ہاتھ میں موجود گول پھول کی پلیٹ، چھوٹ کر زمین پر گر گئی تھی۔

میم صاحب کو بچانے کیسا دورہ سا پڑ رہا تھا کہ جوں جوں اس کے کانوں میں بانسری کی تیز آوازیں پڑ رہی تھیں اس کی حالت غیر سے غیر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ چڑمڑ ہو کر سیٹھ لگی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے آج کل کے کسی بڑے غبارے میں سے ہوا نکل رہی ہو اور وہ غبارہ سٹکر رہا ہو۔ یہی ہی نہیں بلکہ اس کے جسم سے انتہائی بھیاںک بدبو آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہاں موجود ہم سب نے اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھے اچنبہ کی حالت میں اسے دیکھ رہے تھے۔

بہر حال گنیش اپنی بانسری کو تیزی سے بجاتے ہوئے پسینہ میں شرابور ہو گیا تھا پھر وہ اچانک دھڑام

”ابھی ہمارے پاس پورے 4 کھٹے ہیں۔ وہ چار کھٹے بعد آفس سے آئے گا۔“ لیلیٰ پریشانی کو جھٹک کر بولی۔

”مجھے بھی تمہارے ساتھ سکون ملتا ہے۔ اس ہوٹل کے کمرے میں ہم تم اکیلے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں ہے دیر سے قریب آ جاؤ۔“

”میں تمہارے قریب ہی تو ہوں۔“ لیلیٰ اسد کے بالکل قریب آ گئی لیلیٰ نے خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ اور پھر دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر جذبات کے طوفان میں پھیرے کھانے لگے۔ تین کھٹے تین دنوں ساتھ رہے۔ اس کے بعد لیلیٰ بولی۔ ”اسد مجھے جانا ہو گا، عمران آنے والا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ امیری بیوی مہر بھی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“

دونوں ایک ساتھ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلے اور ہارنگل کر مختلف سٹوں میں چلے گئے۔ لیلیٰ وہاں سے سیدھی گھر چلی گئی اس نے ایک نگاہ اپنی کھائی میں بندھی گھڑی پر ڈالی پانچ بج رہے تھے عمران کی واپسی کا وقت ہو رہا تھا وہ کسی بھی لمحہ گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔

لیلیٰ اپنے بیڈروم میں گئی اس نے الماری سے عمران کی شارٹ گمن نکالی اور اسے اپنے بیڈ کے سرہانے رکھ دیا۔ اس نے جیسے ہی بیڈ کی چادر درست کی۔ اس کے کانوں میں عمران کی گاڑی کی مانوس آواز سنائی دی۔

اس کی گاڑی کیراج میں رک جی جی تھی اور اب وہ اندر آ رہا تھا اس کے قدموں کی آواز اب واضح طور پر اس کے آنے کی ثبوت دے رہی تھی۔

ایک منٹ بعد دروازے کی پینڈل گھمانے کی صاف آواز آئی عمران ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر زور سے بولا۔

”لیلیٰ! میں آ گیا ہوں۔ چائے کی بڑی سخت طلب ہو رہی ہے جلدی سے پلیز! ایک کپ چائے لاؤ۔“

گھر لیلیٰ نے سنی ان سنی کر دی جبکہ اس نے

صاف طور پر عمران کی آواز سنی تھی۔ عمران نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا پھر ڈرائنگ روم سے نکل کر اندر بیڈروم میں آ گیا۔

لیلیٰ نے جواب دینے کے بجائے عجیب نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ تو وہ رک گیا۔ اور گن آگھوٹوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر بولا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں تمہارا انتظار اتم نے چائے کیوں نہیں دی؟“

”میں بہت زیادہ مصروف تھی۔“

”مصرف..... کیا مطلب کیا کر رہی تھی؟“ لیلیٰ نے پہلے سے خود کو تیار کر لیا تھا اور وہ بالکل جھگڑے کی موڈ میں تھی۔

”میں اپنے ایک دوست کے پاس گئی تھی اور واپسی پر میرا جسم چھکن سے چور چور ہو رہا ہے۔“ یہ سنتے ہی عمران کی آنکھیں حیرت سے جیسے پھٹ پڑیں!

”کیا کیا تم نے؟“

”سنائیں تم نے! یہی کہ ایک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ تھی!“

”کیا ہو اس ہے یہ؟ تم وہاں کیا کرنے گئی تھی؟“

”بھولے مت بنو عمران۔ جو میں کہہ رہی ہوں صاف طور پر سنو! میرا کسی کے ساتھ زوروں کا فیئر چل رہا ہے میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی میں تم سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔“

یہ سنتے ہی عمران کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، وہ دروازے کے چوکھٹ کا سہارا لیتے ہوئے نیچے پھسلتا چلا گیا اور بے دم سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر جم کر رہ گئیں اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا وہ کچھ دیر تک اسی حالات میں بیٹھا رہا۔

اور پھر چند لمحوں کے بعد اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

اور جب اس نے خونی نظروں سے لیلیٰ کو دیکھا تو وہ کانپ کر رہ گئی، خوف کی ایک سرد درق لہر اسے اپنی

وریدہ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوئی ”کون ہے وہ کبھی؟“ عمران نے دھاڑتے ہوئے پوچھا!

میں جانا چاہتا ہوں کون ہے وہ؟ ”عمران کا لہجہ زہر خنقا“

”یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تم مجھے آزاد کر دو۔“ لیلیٰ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

عمران غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھوں کی منہیاں غصے سے پیچھے ہوئے بولا۔

”میں نے تم سے سوال کیا ہے وہ کون ہے؟“ اس کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔

”میں کسی بھی قیمت اس کا نام نہیں بتاؤ گی۔“ لیلیٰ کی بات سن کر عمران آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا جبکہ لیلیٰ خوف سے سمٹ کر رہ گئی۔

نزدیک پہنچ کر عمران نے اپنے ہاتھ سے لیلیٰ کا گاد پر لیا لیلیٰ خوف کی شدت سے بری طرح ہانپنے لگی۔

اس کے بعد عمران نے اپنے ہاتھ سے لیلیٰ کو اوپر اٹھایا لیلیٰ زمین سے ایک فٹ بلند ہو گئی اس کے بعد عمران کے مضبوط ہاتھوں نے لیلیٰ کو زمین پر زور سے دے مارا اور پھر اس کے اوپر جھکتے ہوئے بولا ”بتا کون ہے وہ؟“

لیلیٰ کو عمران کی دھمکی کی طرح چلتی ہوئی سانس صاف طور پر محسوس ہو رہی تھیں۔

”بتا۔“ عمران نے ایک بار پھر لیلیٰ کا گلہ دہیچے ہوئے کہا۔

لیلیٰ نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کھائی پکڑ لی اور بولی ”مجھے چھوڑ دو میرا گلے میں سانس گھٹ رہا ہے۔“

عمران نے یہ سنتے ہی اس کے گلے پر مزید دباؤ بڑھایا۔ اور غصے سے بولا۔

”ابھی تو میں نے حقیقت میں کوئی گزند نہیں پہنچائی ہے۔“

لیلیٰ اپنا حلقوم چھڑانے کے لئے ہاتھ بھر چلائے لگی۔

اور پھر اچانک عمران کے ٹانگوں کے درمیان اس نے ایک زوردار لٹ مار دی۔ جس سے عمران دہرا ہو کر پیچھے ہٹ گیا مگر فوراً اس نے لیلیٰ کے جڑے پر ایک زوردار گھونسا بڑوایا۔ جس سے لیلیٰ کی ہسیا تک جی نکل گئی۔ پھر اس کے گلے پر سے اپنی گرفت ختم کر دی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ وردے دہرا ہوا تھا۔ پھر سنبھل کر لیلیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔

لیلیٰ جیسے ہی عمران کی گرفت سے نکلے وہ جلدی جلدی لمبے لمبے سانس لینے لگی اور فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

عمران نے اسے ٹھوکریں ماریں۔ اور پھر اس کے بالوں کو گرفت میں لے لیا۔

بالوں سے پکڑ کر اس نے لیلیٰ کو کھڑا کیا اور زور سے اسے بستر پر پھینک دیا اور پھر ہمیشہ کی طرح اپنی شرٹ اتارنے لگا۔

لیلیٰ کا وجود درد سے دکھ رہا تھا اس کا وجود درد کا آماجگاہ بن گیا تھا وہ کراہ رہی تھی وہ اپنی اس کیفیت کو درست کرنے کے لئے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اس نے جلد ہی اپنی سانسوں پر قابو پایا۔

اب عمران شرٹ کے بغیر اس کے سامنے کھڑا تھا لیلیٰ نے دوسرے ہی لمحے جست لگائی اور بیڈ کے سرہانے سے شارٹ گمن نکال لی جو اس نے عمران کے آنے سے کچھ دیر قبل وہاں چھپائی تھی اس نے شارٹ گمن کا رخ عمران کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

”بس..... مجھ پر تمہارا یہ ظلم آخری بار تھا۔“

”یہ..... کیا ہے؟ دیکھو..... دیکھو..... تم کو ملی مت چلا نا؟“ وہ ہکھلانے لگا۔

لیلیٰ نے شارٹ گمن کی نال کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کیا۔

”تمہیں، بہت سہہ لیا میں نے تمہارا ظلم اگر تم ایک اچھے شوہر ہو تو میں بھی اپنے لئے دوسرا سہارا تلاش نہیں کرتی تم جانور ہو دو ذلیل انسان داب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”مم..... مم..... مجھے مت مارنا میں تمہیں

ڈراما سچائی کی مشہور و معروف کتابیں

75/-	پراسرار کہانیاں
75/-	دہشت ناک کہانیاں
75/-	حیرت انگیز کہانیاں
75/-	خوفناک کہانیاں
75/-	ڈرامائی کہانیاں
75/-	آسیبی کہانیاں
75/-	بھیا ناک کہانیاں
75/-	خونخیز کہانیاں
75/-	ناگ دیوتا (مکمل ناول)
75/-	پیشاز دیوی (مکمل ناول)
75/-	پھندا (مکمل ناول)
75/-	قدیری روچیں (مکمل ناول)
75/-	غیبی آواز (مکمل ناول)
75/-	روح بیتی (مکمل ناول)
150/-	بوقاف (مکمل ناول) جلد
150/-	مداری (مکمل ناول) جلد
150/-	طلسم زاد (مکمل ناول) جلد
150/-	ہنت فرعون (مکمل ناول) جلد
150/-	ہمزاد کا عشق (مکمل ناول) جلد
150/-	بھنور (مکمل ناول) جلد
450/-	جادوگر (مکمل ناول) جلد
200/-	ادتار (مکمل ناول) جلد
60/-	لبے ہاتھ
60/-	بھٹکتی روح
60/-	لاٹ کا چنگامہ

شیخ بک ایجنسی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

حرام خورد، میرے ہوتے ہوئے تم نے کسی اور کو ہاتھ لگانے کی کوشش کیے کی۔“

اسد نے بڑی مشکلوں سے، مہرہ کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے ہٹایا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”میں آگ لگا دوں گی، اس گھر کو، نام بتاؤ مجھے اس کمینے عورت کا۔“ مہرہ بیانی انداز میں چیخی!

”پاکل عورت نکل میرے گھر سے، تو نے میرے گھر کو دوزخ بنانے رکھا ہے، ہر وقت شک، بدرفت کسی پولیس کی طرح مجھ سے طرح طرح کے سوالات میں گویا اپنے ہی گھر میں مجرم بن کے آتا ہوں۔“ اسد ہلکا ہلکا۔

”نیکام، میں نکلوں اس گھر سے، ذلیل آدی۔“ مہرہ نے ٹیلی لیپ پر سے گلہ ان اٹھا کر اسد پر دے مارا۔ وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر اسد کو مارنے لگی وہ ہری طرح چیخ رہی تھی مگر اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہیں نکل رہا تھا۔ اسد بڑی مشکلوں سے اس کی بھینگی ہوئی چیزوں سے خود کو بچاتا رہا۔ جبکہ جہاں جہاں پر مہرہ نے اس کے چہرے پر خراشیں ڈالی تھی وہ بھی سوجن کی وجہ سے شدید درد کر رہی تھی۔

مہرہ نے دیوار سے وال کلاک اتارا اور اسد کی طرف زور سے پھینک دیا، وال کلاک، اسد کے کندھے پر لگا، وہ پوری قوت سے ڈنگ گیا، وال کلاک کا شیشہ چھٹنے کی آواز سے ٹوٹ گیا، کئی شیشے کے باریک ٹکڑے اس کی گردن میں لگے۔

خون کی باریک پتلی نکلیں، اس کے سفید ثرت کو سرخ کرنے لگیں۔ جبکہ مہرہ اسد کی پرواہ کئے بغیر بدستور چیخ کر بولی۔ ”بتائیے وہ کون ہے؟ درندہ میں اس گھر کو آگ لگا دوں گی۔“

”نہیں بتاؤں گا۔ جو کرتا ہے کر لے؟“ اسد غصے سے سختیاں سمجھ کر بولا۔

”نہیں بتائے گا۔“ مہرہ چیخی، اور ایک بار پھر غصے سے اسد کی طرف بڑھی۔ اس نے جیسے ہی اپنے ہاتھ اسد کی گردن کی طرف بڑھائے۔

معمول مہرہ دیوی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور دیوی پر ساس بھونکی جھگڑا لیسو میل دیکھ رہی تھی۔

”کہاں سے آ رہے ہو؟“ مہرہ نے تھوڑی پرہیزگاری سے اس سے پوچھا؟

کہاں سے آؤں گا، ظاہر ہی بات ہے آفس سے ہی آ رہا ہوں۔“ اسد نے بے زار لہجے میں کہا۔

”یہ تو میری بات کا جواب نہیں۔“ چیخ بتاؤ مجھے کس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے تھے، کس بیچ ذات کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔“

”بکواس بند کرو۔“ میرے سر میں شدید درد ہے مجھے تنگ مت کرو۔“ اسد بولا۔

”میں نے تمہارے آفس فون کیا تھا، تم آج آفس نہیں گئے، میں نے تمہارے دوستوں کو بھی فون کئے مگر تم کسی کے پاس نہیں تھے اور تمہارا فون بند تھا۔“

مہرہ، چیخ چیخ کر بولی، اس کی تنبیہ کرتی ہوئی انگلی اسد کے چہرے کے سامنے آگئی۔ ”بتاؤ مجھے بے حس انسان کس کے ساتھ گناہ کر کے آئے ہو؟“

”ذلیل عورت، تم نے میری زندگی جہنم بنا دی ہے۔ ایک سال سے تم بے جا شک کی بنیاد پر مجھ پر بہتان لگاتی آئی ہو۔“

مگر سن لو! آج میں تمہارے شک کو یقین میں بدل دیتا ہوں۔

میں ہوٹل میں تھا ایک دوست کے ساتھ بڑا حسین وقت گزارا اس کے ساتھ ایک مہینہ ہو گیا ہے میرا اس سے انصر چل رہا ہے اور اب میں اس کے معاملے میں بشیدہ ہوں میں اسے اس گھر میں لانے والا ہوں۔“

اسد نے سرخ نظروں اور تیز آواز سے مہرہ کی تنبیہ کرتی ہوئی انگلی جھٹک کر ہٹا دی۔

مہرہ نے سن کر ایک لمحہ کے لئے سن ہی ہو گئی مگر وہ جلد ہی سنبھل گئی اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی چیخی چلاتی

اسد پر جھپٹ پڑی! اس نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے اسد کے چہرے پر کئی گہری خراشیں ڈال دیں۔

”میں تم کو آگ لگا دوں گی۔“ بے وقاف انسان

آزاد کروں گا۔۔۔۔۔“ عمران ہٹکایا۔

”نہیں، تم بہت ظالم ہو، میرے بعد کسی اور کا جینا و شوار کرو گے۔“

”اور پھر لیلی نے شارٹ گن کا ٹریگر دبا دیا، ٹریگر دباتے وقت وہ بیجانی ہنسی ہنس رہی تھی جبکہ موت کے خوف سے عمران کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اس کی ٹانگیں خوف سے کانپ رہی تھیں۔

لیکن یہ کیا ایک کھوکھلے کھٹکے کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیا۔

لیلی بھونچتی رہ گئی۔

عمران کی آنکھیں جو چند لمحے پہلے خوف و دہشت سے بھٹی پڑ رہی تھیں، اب ان میں آگ برسنے لگی تھی، اس نے لپک کر شارٹ گن لیلی کے ہاتھ سے چھین لی اور آؤٹ شارٹ گن کے جیسیر میں داخل کرتے ہوئے قہارت سے بولا اب تو مرنے کے لئے تیار ہو جا۔

لیلی نے عمران کی انگلی کو شارٹ گن کے ٹریگر پر حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً پیچھے ہٹنے لگی، وہ اس سے چند فٹ دور چلی گئی۔

”سن! بد ذات عورت اگر تو مجھے اس کتے کا نام بتا دے، تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔“ عمران نے تھوک نچکتے ہوئے بولا۔

جواب میں لیلی نے نفی میں سر ہلایا اور آنکھیں فوراً سمجھنے لگیں، عمران نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا اور پھر ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔

☆.....☆.....☆

اسد نے گاڑی کیراج میں روکی، اور گاڑی سے اتر کر کیراج میں کھڑی مہرہ کی گاڑی کو قہارت کی نظر سے دیکھا۔

”منہوس ابھی تک گھر پر ہے۔ کہیں بھی نہیں گئی؟“

ایک منٹ بعد وہ واپسی دروازے سے گھر کے اندر چلا گیا سب سے پہلے وہ لاؤنج میں گیا، حسب



انتقام

نظارت نمر- فیصل آباد

ہر طرف رات کا ہیبت ناک ماحول طاری نہا، اسٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکا مردہ برف کی طرح ساکت پڑا تھا کہ اچانک اس میں حرکت پیدا ہوئی، وہ کسمسماٹے ہوئے اسٹریچر پر اٹھ بیٹھا اور پھر.....

دلخراش، دماغ گار، دہشت ناک اور تجھرا گئیں کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تحفہ کہانی

مگر مجبوری تھی جب بھی اس کی ڈیوٹی یہاں لگتی اسے چاروٹا چار آٹا ہی پڑتا اور سب سے زیادہ ستم اس دقت ہوتا جب اس کی سیدھ پوٹی ٹائٹ میں لگ جاتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

”کیا تھا اللہ میاں! اگر میری ڈیوٹی آج اس جگہ نہ لگتی۔“ اس کا دل چاہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ روزی روٹی کے اس سلسلے کو بند کر کے وہ کہانی کہاں سے۔ پہلے ہی اسپتال میں پتہ

اسپتال کی خوبصورت عمارت میں یہ ایک بے صورت جسم تھا۔ اگرچہ عمارت تو اس صے کی بھی ویسی ہی دلی شان تھی مگر اس کی بد صورتی کی وجہ دراصل اس کا پوسٹ مارٹم اور ناٹوئی کے لئے مخصوص ہونا تھا۔

یہاں پر اکثر اوقات عجیب کنی پھٹی، چلی ہوئی قبر سے نکالی ہوئی سن شدہ لاشیں لائی جاتی تھیں جن کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا تھا تاکہ یہ پتہ چلا جا سکے کہ ان لوگوں کو کواکر کسی نے مارا تھا تو کیسے کیا تھا۔ لیکن اس اسپتال میں کام کرنے والی ایک نرس تھی۔ اسے سب سے زیادہ نفرت اسی شعبے سے تھی،

شادی کی پہلی رات میں دونوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ ہم دونوں غنی خوشگوار زندگی کا آغاز کریں گے نہ کسی بھیلی زندگی کا کوئی طعنہ نشہ ایک دوسرے کو دیں گے نہ کوئی بے بنیاد شک ایک دوسرے پر کریں گے، نہ مار پیٹ سے کام لیں گے، ہم اپنے بچوں کے لئے مثالی جوڑا بنیں گے جن کا آئیڈیل ہر ماں باپ بننا چاہے گا۔

وہ دونوں اپنی مون منانے کے لئے دوسرے دن اپنی مون منانے کے لئے دینی جانے والے تھے دونوں کی خوشیاں دیکھنے کے قابل تھیں، دونوں مستقبل کے تانے بانے بننے رہے، اسد کی جان اپنی بیوی اور لیلیٰ کی جان اپنے شوہر سے چھوٹ گئی تھی۔ خوشیوں میں مگن رات کے آخری پہر وہ دونوں نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ لیکن وہ آنے والے وقت سے بے خبر تھے، ان کے قریب ہی موت کھڑی ان پر مسکرا رہی تھی۔

نیند کی آغوش میں گئے انہیں ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اندھیرے کمرے میں دور درشن ہیولے نمودار ہوئے ایک ہیولہ کسی عورت کا جبکہ دوسرا ہیولہ ایک مرد کا تھا۔

دونوں ہیولے ہوا میں معلق آگے کو بڑھے اور گہری نیند میں غرق لیلیٰ اور اسد کو دونوں نے اپنے ہاتھ کے آہنی جکچے میں جکڑ لیا۔ مرد ہیولے نے لیلیٰ کو اور عورت ہیولہ نے اسد کو جکڑ رکھا تھا۔

اسد اور لیلیٰ دونوں بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ ان دونوں کو لے کر وہ دونوں ہیولے چار منزلہ مکان کی چھت پر پہنچے اور بڑی سفاکی سے دونوں کی گردنوں کو پہلے توڑا اور پھر دونوں کو چھت سے نیچے زمین پر دے مارا۔

اسد اور لیلیٰ کی لاش زمین پر بے یار و مددگار پڑی تھی۔ پھر دونوں ہیولے اپنی اپنی سمت روانہ ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔



آدھا گھنٹے کے اندر اسد کی گاڑی کے آگ پر قابو پایا گیا اس کی آدھ جلی بھیا تک لاش گاڑی سے نکال کر ایبوسنس میں ڈال کر مقامی اسپتال لے جایا گیا۔

گاڑی اور مہر و دونوں کا حال بد سے بدتر ہو چکا تھا دونوں پچانی نہیں جا رہی تھیں۔

اسد کو آدھے گھنٹے کے بعد اطلاع مل چکی تھی۔ اطلاع ملنے ہی وہ خوشی سے پھولے نہیں سار ہوا تھا۔

رات کو ہی اسد نے مہر و کے کار کے بریک فری کر دیے تھے۔ اور سی این جی سیلنڈر کے وال ڈھیلے کر دیے تھے، کہ کار اشارت ہوتے ہی پریش کی وجہ سے سی این جی گاڑی میں پھیل جاتی اور دوسری بات یہ جو اسد کو معلوم تھی وہ یہ تھی کہ مہر و بلا کی جین اسو کر ہے۔ اور وہ پریشان ہو تو سب سے پہلے بگڑیٹ سلگا لیتی ہے۔ اس لئے اسد نے نہایت ہی بھیا تک موت کا جال مہر و کے لئے بچھایا تھا۔

اور مہر و بالآخر موت کے بھیا تک پہنچنے میں جکڑ کر اس دنیا سے دور چلی گئی۔

مہر و کے بھائیوں نے مہر و کی موت پر شدید ہنگامہ کیا۔ مگر گاڑی اس قدر جل چکی تھی کہ کوئی ثبوت وہ اسد کے خلاف ثابت نہیں کر سکے اور بعد میں معاملہ سی این جی کے سیلنڈر پہنچنے پر ڈال دیا۔

مہر و کی آخری رسومات اس کے بھائیوں نے نہایت احترام و عقیدت سے ادا کیں اور اسد نے پھر پور شرکت کی۔ جبکہ مہر و کی آخری رسومات میں اسد نے خود کو بہت ہی زیادہ افسردہ ظاہر کیا۔

دوسری جانب لیلیٰ بھی صاف طور پر پوچھ گئی کہ اس کے شوہر کی لاش کی حالت ایسی ہی تھی۔ جیسے وہ لیلیٰ پر تشدد کرتے کرتے موت کے منہ میں چلا گیا ہو، لیلیٰ کے جسم پر موجود نیل اور تشدد کے نشانات نے بھی اسے اچھا خاصہ مظلوم بنایا۔ عمران کی جتنی جائیداد تھی وہ اس دن موت کے بعد لیلیٰ کو مل گئی۔ اور لیلیٰ کو ایک ظالم شخص سے نجات مل گئی۔ لیلیٰ نے اپنے عدت کے دن پورے کئے اور پھر سادگی سے اسد سے شادی کر لی۔

نہیں کسی کس کی سفارش سے تو کسی ہاتھ میں آئی مگر دل میں اس ڈاکٹر کو کوئی وہ تیز قدموں سے چارج لینے جلدی تھی جس نے اس کی ناک کی ڈیوٹی یہاں لگا لی تھی۔

سسر مادیر نے خوشدلی سے اسے چارج دیا اور اپنا بیک اور چپس سمیٹ کر سرسکائی ہوئی باہر چلی گئی۔ سسلی نے اپنا پرس میز پر بچ دیا۔

”کیا بات ہے بہت غصے میں معلوم ہو رہی ہو؟“

دانت نکالنے فراز کی طرف اس نے کہا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ یہ مرد وہ پتہ نہیں کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ جبکہ وہ اس کے غصے سے بے پروا بڑی فرصت سے جیسر پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ سسلی کھول کر رہ گئی۔

سسلی کو فراز سے شدید پڑ تھی۔ بالکل اتنی ہی جتنی کہ اس شعبے میں ڈیوٹی دینے سے تھی بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ تھی۔

فراز ایک مٹھی سا کالا کٹا جس پر کچیس سالو جوان تھا۔ اس کے چہرے کی ابھری ہوئی بڑیاں اور ہنسی ہوئی آنکھیں دیکھنے والے کے جذبہ کا امتحان لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس پر اس کے کندھے یوں جھکے ہوئے تھے جیسے دونوں کندھوں کے درمیان کسی نے زوردار گھونسا سید کر دیا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو سسلی پر کڑوں ہی دل میں اسے ڈکٹا جن کا خطاب بھی دے ڈالتی تھی مگر سامنے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ فراز ایک بڑے ڈاکٹر کی سفارش پر یہاں بھرتی ہوا تھا اور اس ذمائی بات پر اس ڈاکٹر سے اپنے مخالف کو چھانڈ بھی پلدا پڑتا تھا۔

اس لئے سب ترسیں ہی اس سے بچ کر رہتی تھیں مگر سسلی کی شاید قسمت بری تھی کہ وہ اسے دیکھ کر خوشنواوریشہ تھی ہونے لگا تھا جتنا وہ بیٹھا بیٹھا بولتا اتنی سسلی کو برا لگتا اس کا دل چاہتا کہ وہ کسی دن اس کا بھی پوسٹ مارٹم کراڈ لے کیونکہ فراز کی ڈیوٹی ہمیشہ صرف اسی شعبے میں ہوتی تھی کیونکہ یہاں کام ہی ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔

فراز کو نظر انداز کر کے اس نے کانغذات کا پابندہ اپنی طرف کھٹک لایا۔ اور انیس ترتیب اور فائلوں میں لگائے لگی کچھ رو پریش تھیں انہیں اس نے لفافے میں بند کر کے مہر لگا دی۔ وہ کام میں مصروف تھی اور فراز اسے دیکھنے میں زنج ہو گئی۔

”بہنیں کوئی کام نہیں ہے۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ جا کر دیکھ آؤ کہ مردہ خانے میں اس وقت کتنی ڈیوٹی بائیز پڑی ہیں۔“

وہ کسی طرح بھی سکھاتے اپنے سامنے سے اٹھنا چاہتی تھی۔ وہ ایک اداسے بولا۔

”پہلے زندہ لوگوں سے قول لوں پھر لاشوں کی کتنی بھی کر لوں گا۔“ سسلی دانت پٹس کر بولی۔

”دیکھو فراز اگر تم اپنی اپنی چھوٹی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو دیکھ لینا ایک دن بہت بڑے انجام سے دوچار ہو گئے تم۔“ وہ منہ کھول کر بے انتہام تہنید لگا کر بٹھا۔

”بڑھ چکی ہے پاپیش کوئی۔“

سسلی نے ایک ناراض نظر سے اسے دیکھا اور خود اٹھ کر سردخانے کی طرف چلی گئی وہ بھی جیسے ہی تھا۔ سردخانے میں چھ لاشیں پڑی تھیں۔ شہر کا کہ سب کی سب سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھیں ورنہ ان کی کٹلی آنکھوں کو دیکھ کر سسلی کا دل سوکھے پتے کی مانند ٹرنے لگتا تھا۔ وہ پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔ چائے بنانے لگی تو فراز فوراً ہڈ سانس لے بولا۔

”بھئی ذرا ایک کپ میرے لئے بھی بنا دیتا ہمارے ہاتھ کی چائے میں بڑا ذائقہ ہوتا ہے۔“

بس اسی وقت سسلی کا غلیظ جواب دے گیا۔ اس نے فراز کی نظر بچا کر پورا چہرے بھر کے تنک اس کے کپ میں ڈال دیا اطمینان سے چائے تیار کی کپ میں انڈلی اور خاموشی سے ایک کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سسلی کے خاموش رویے کو اپنی آنکھوں میں خیال کر رہا تھا سو بڑے چپک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

سسلی خاموشی سے چائے پی چائے پینے لگی۔

چائے کا پہلا گھونٹ لے کر وہ جی بھر کر بدمزہ بولا۔

”ختم نہ میری چائے میں کتنا تنک ملایا تھا؟“

اب سسلی کی باری تھی۔ وہ انجان بنے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا تنک ہے۔ میں نے تو تیار ہی ڈالا تھا تم جانتے ہو کہ میں تنک والی چائے پیتی ہوں۔“

فراز نے کپ رکھ دیا اور اٹھ کر چلا گیا۔ سسلی سکون سے بیٹھ گئی۔ کم از کم وہ ایک گھنٹے تو اب سکون سے گزرنے والے تھے۔ ابھی اس نے چائے قسم کی ہی تھی کہ سر جن اکرم

آئے تھے انہوں نے آتے ہی حکم صادر کیا۔

”سسلی جلدی کرو۔ سٹریچر نمبر 2 لے آؤ۔۔۔۔۔ میرے پاس وقت بھی کم ہے۔“

سسلی جی کڑا کر کے سردخانے میں جا گئی اور اسٹریچر نمبر 2 کو کھیل کر باہر لے آئی۔ اسے مردوں سے ڈرنا نہ تھا۔ مگر فوری میں کوئی اس کے غرے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ حیران تھی کہ ابھی تک کوئی اور نہیں آیا تھا۔ اصل میں سر اکرم وقت کے بہت پابند تھے۔ اس لئے وقت پر یہاں پہنچ گئے تھے جبکہ جوئیر ڈاکٹر ز میں سے کوئی بھی ابھی تک نہیں پہنچا تھا پندرہ منٹ تک انتظار کرنے کے بعد وہ غصے میں آ گئے۔

وہ واپس جانے کے لئے قدم بڑھا چکے تھے جب جوئیر ڈاکٹر کی ایک ٹیم دروازے میں داخل ہوئی وہ لوگ جلّت میں آگے بڑھ رہے تھے مگر سر اکرم ان کی بات سننے بغیر آگے بڑھ گئے صوب کے منڈنگ گئے کیونکہ سر اکرم کے ناراض ہونے کا مطلب تھا کہ وہاں کھنڈہ جڑا لکھا کر انہیں پھر سے رہائی کرنا۔

وہ سب کی طرح سر اکرم کے پیچھے لپکے ہوئے چلے گئے پھر سسلی سامنے اسٹریچر پر دگے مردے کے ساتھ اکیسارہ گئی اس وقت پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ اس رات اس کے ساتھ جن دو سسٹرن کی ڈیوٹی تھی وہ دونوں ہی آج چھٹی پر تھیں جوئیر ڈاکٹر ز سر اکرم کو نہانے چلے گئے تھے۔ انہیں شاید اس مردے پر انٹونی کا بجیکٹ پر پیکچر کر کے دیکھنا تھا۔

سسلی خاموشی سے پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی، اسی وقت وہ باتیں اچانک قورق پڑ رہیں ایک تو یہ کہ فراز اب تک نمودار ہو گیا اس کے تاثرات عجیب سے تھے دوسرے اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ سسلی خوف زدہ ہو کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس پر دو تین خوف ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے ایک تو لائٹ جانے سے اندھیرے کا خوف دوسرے فراز کے ناقابل فہم بلکہ کسی حد تک خطرناک تاثرات نمودار ہونے سے اس کچھ کا صلی پر ایک مردے کا وجود۔ وہ اندھیرے اندھیرے میں اپنی کسی چھوڑ کر ایک طرف ہو گئی۔

اسی وقت تنک سے کوئی چیز کرسی سے گر گئی، سسلی نے اپنے منہ سے نکلنے والی چیخ کو مکمل رکھا۔ وہ اس طرح

کی تھی جیسے لوہے کا کوئی اوزار کرسی سے ٹکرایا ہو اسے فراز سے اس رویے کی امید نہیں تھی۔ بقیہ یہ ایک قاتلانہ حملہ تھا کیونکہ سسلی شاخت کر چکی تھی یہ آواز خنجر مالے ہی کسی ہتھیار کے کرسی کی لکڑی سے ٹکرانے کی آواز تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ فراز اسے قتل کرنا چاہتا تھا اب اسے اپنا بچاؤ بہت ہوشیاری سے کرنا تھا۔ دائیں طرف فراز جبکہ بائیں طرف مردہ تھا۔ جسے سسلی خود درخانے سے نکال کر لائی تھی اس نے غیر محسوس انداز میں مردے کی طرف حرکت کی وہ نہیں چاہتی تھی کہ فراز کو اس کی حرکت سے اس کی موجودگی کی جگہ کا علم ہو جائے۔ ساتھ ساتھ وہ دعا بھی مانگ رہی تھی کہ اللہ کرے یا تو لائٹ آجائے یا پھر کوئی ڈاکٹر یا اسٹاف میں سے ہی کوئی اس طرف آجائے جھٹکے جھٹکے وہ اسٹریچر کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی۔

دوسری طرف فراز کبھی علم ہو گیا کہ وہ اس طرف کو کھٹک رہی تھی اس نے تیزی سے اسی طرف قدم بڑھائے، گھب اندھیرے میں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے اس اسٹریچر سے ٹکرایا جس پر مردہ پڑا تھا۔ اسی وقت لائٹ آگئی سسلی اور فراز ایک دوسرے کے عین سامنے کھڑے تھے مگر درمیان میں مردہ تھا۔ لائٹ کی وجہ سے سسلی کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ جیسے ہی فراز نے ہاتھ میں چمکا خنجر بلند کیا، سسلی نے تیزی سے جھٹکی دے کر خود کو اس کے وار سے بچایا، دونوں کی توجہ پوری طرح ایک دوسرے پر تھی وہ مردے کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

گمراہ گئے ہی لئے دونوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ فراز خنجر پھینک کر بھاگ گیا۔ مگر سسلی بھاگ نہیں سکی کیونکہ مردہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور بیٹھنے کے ساتھ ہی اس نے سسلی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، سسلی نے اس کے منہ سے کھسکی چادر کی طرف دیکھا بیٹھنے کی وجہ سے چادر اس کے منہ سے گر گئی تھی اب مردے کی کٹلی ہوئی ہے فوراً تمہیں اس کے سامنے تھیں، مردے کا منہ کھٹنے لگا سسلی نے دیکھا اس کے دانت بالکل ڈر کیلا کے دانتوں کی طرح تھے اس کے منہ سے ایک بیسیا تک چیخ نکلی۔ مردے نے کھنچ کر اسے اپنی گت میں گر لایا، وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنے منہ کو گت میں لے کر بیٹھی ہے۔ سسلی نے اپنے لوہے جیسے مردے کو دیکھا اس کا دل

دھڑکنا بھول گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ابھو بیٹی! ابھو! سا کھانا کھاو۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

سُملی اپنے بستر پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی جب اس کی ماں اس کے لئے کھانے کی ٹرے لے کر آئی۔ مگر سُملی خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ اس کی ماں نے زبردستی دو چار لقمے اسے کھلائے اور برتن لے کر چلی گئی۔ اس حادثے کو جب تقریباً ہفتہ ہو گیا تھا مگر ابھی تک سُملی صدمے سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ فراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا کیونکہ خنجر پر اس کے منکر پرنس مل گئے تھے اس نے اعتراف بھی کر لیا تھا کہ سُملی اس کی محبت کا مذاق اڑاتی تھی اس لئے غصے میں آ کر اس نے سُملی کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس رات اسے مردے کے چنگل سے جوئیر ڈاکٹر زکی اس ٹیم نے نکالا تھا جو سرا کر م کو مٹانے چلی گئی تھی۔ جب وہ واپس وہاں آئے تو یہ دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے کہ مردہ سُملی کو گود میں لئے اس کا خون پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکیاں تو چیخیں مارتی وڑ کر دوڑ گئیں جبکہ چند ایک جی دار لڑکوں نے مردے پر حملہ کر دیا جو جھک کر سُملی کا خون پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک زبردست ٹھوکر لگنے پر مردہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اور سُملی اسی طرح اسٹریچر پر پڑی رو گئی ان ڈاکٹر ز نے اسے تھمھت لیا۔

اس کے بعد اس خوف کی وجہ سے وہ ہوش میں آتے ہی بے ہوش ہو جاتی تھی اس لئے اسے کئی دن تک اسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔ وہاں سے دو سہارا ج ہو کر وہ گھر آ گئی۔ لیکن خوف اس کے اندر پہنچے گاؤں کے بیٹہ گیا تھا۔ وہ پھر اسپتال نہ جا سکی۔

باہر شاید رات بھر آئی تھی کیونکہ اس کی ماں نے کمرے کی لائٹ جلا دی تھی۔ وہ خاموشی سے پھر بستر پر لیٹ گئی۔ اسی وقت اس کی ماں اندر آ گئی لوڈ شیڈنگ کا وقت ہونے والا تھا اس نے ایک طرف رکھے کینڈل اسٹینڈ میں لگی تینوں موم بتیاں روشن کر دیں۔ دوسرے بعد لائٹ چلی گئی۔ سُملی خاموشی سے لیٹی ان موم بتیوں کی طرف دیکھتی

رہی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی ماں اس کے پاس بیٹھ کر اصرار کر باتیں کرنے لگی مگر وہ دھیماں سے نہیں سن رہی تھی۔ اسی وقت ایک ذبردست ہوا کا جھوٹکا آیا اور تینوں موم بتیاں بجھ گئیں۔ اس کی ماں نے انہیں دوبارہ جلانے کے لئے اٹھنا چاہا مگر سُملی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میرے دور میں جاؤ۔“ اس نے بھر سے بیٹھ گئی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

سُملی نے سامنے والی دیوار کی طرف دیکھا وہاں دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ ان کی چمک اتنی تیز تھی کہ سُملی کا سانس سینے میں اٹکنے لگا وہ کوشش کے باوجود اپنی نگاہ وہاں سے ہٹا نہ سکی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں بڑی ہونے لگیں اور پھیلنے پھیلنے پوری دیوار پر محیط ہو گئیں۔

سُملی کا سارا جسم یوں لرز رہا تھا جیسے اسے جائزے کا بخار چڑھا ہو۔ اس کے لرزتے بدن کو محسوس کر کے اس کی ماں نے پوچھا ”کیا بات ہے“ مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس نے ٹانگیں جھپک کر دیکھا اس سامنے کا منظر تبدیل ہو چکا تھا اب سامنے اسی مردے کا منہ دکھائی دے رہا تھا۔ رنرہ رنرہ اندھیرے میں اس کا پورا وجود ظاہر ہو گیا وہ ایک سفید لبادے بلکہ کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے اکرے ہونے ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سُملی کی جان کر بے ہوش ہو گئی۔

اس کی ماں نے بڑی کوشش کر کے اسے بھر سے ہوش دلایا۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”بیٹی! آخر تجھے کیا دکھائی دیتا ہے مجھے بھی تو کچھ بتا۔“ سُملی رونے لگی اس نے ماں کے کندھے سے سر ٹکا کر کہا۔

”ایسی ایک مردہ ہے وہ میرا خون پیتا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت ڈاکٹر زوں نے مجھ سے بچالیا۔ مگر اب جب ابھی اندھیرا ہوتا ہے مجھے ڈرانے پہنچ جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ مجھے مار ڈالے گا۔“

اس کی ماں نے اسے تسلی دی۔

”تم حوصلہ رکھو بیٹی میں ایک ایسے بزرگ کو جانتی ہوں جو جن بھوتوں کے حال ہیں۔ کل میں تمہیں ان کے

پس لے جاؤں گی۔ دیکھنا وہ اس مردے کے بھوت کو ایک منٹ میں جلا کر رکھ کر دیں گے۔“

سُملی کو پانی ماں کی ایسی باتیں سن کر کافی حوصلہ ہو گیا۔ اور پھر کچل کچل آگئی تو وہ پرسکون ہو کر سو گئی۔

آدھی رات کے وقت اس کی بھر سے آنکھ کھٹی اس کی ہاتھ پائی زور زور سے مل رہی تھی اس نے چٹخنا چاہا مگر اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی چند لمحوں بعد چار پانی پلٹا بند ہو گیا سُملی نے دیکھا کہ اس کی ماں اس کی برابر والی چار پانی پرسکون سے گہری نیند سو رہی تھی چار پانی کے پلٹے پلٹے کڑوا ہوا سر جان کر سُملی نے آنکھیں پھر بند کر لیں چند لمحوں بعد چار پانی بھر سے چلی۔ سُملی نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

مگر کمرے میں گھب اندھیرا چھایا ہوا تھا سامنے کچھ فاصلے پر وہی آنکھیں روشن ہو گئیں ان میں غضب اور شیطانت صاف نظر آ رہی تھی۔ سُملی کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا۔ آنکھیں پھیلنے لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے کمرے میں پھیل گئیں۔ وہی وہ اس کے بالکل قریب آ جاتی اور کچھ پھیل کر وہ چلی جاتی سُملی کی آنکھیں دہشت سے پٹی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ اتنی بے بس تھی کہ اپنی آنکھیں بند ہی نہیں کر سکتی تھی۔

بیٹھ کی طرف وہ آنکھیں چند منٹ تک اسے دہشت زدہ کر کے غائب ہو گئیں پھر ایک بار اندھیرے میں اس مردے کا چہرہ واضح ہو گیا تھا اس کی کھال لگی ہوئی تھی۔ اور نہ کھلا ہوا تھا اس کے ڈر کیولا کی طرح کے لمبے دانت ہڈیوں سے باہر نظر آرہے تھے۔ اس کی خوف ناک انداز سے پھٹکی ہوئی آنکھیں دیووں میں گول گول گھوم رہی تھیں۔ سُملی کے سامنے پرہیز نہ کیا۔

کمرہ بند تھا مگر مردے کے جسم پر لپٹا کفن یوں ڈھنڈھارہا تھا جیسے تیز ہوا کی زد میں ہو۔ سُملی اس کی طرف دھمکتی رہی کیونکہ اس کی آنکھیں باوجود کوشش کے وہاں سے ہٹ نہیں رہی تھیں مردے نے وہاں ہاتھ یوں پھیلانے جیسے وہ کسی کو پکڑنا چاہتا ہو اور دھیرے دھیرے سُملی کی طرف بڑھنے لگا۔ سُملی کو موت سامنے نظر آنے لگی۔ جیسے ہی مردے نے اس کے قریب آ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی وہ حفاظت

خود اختیاری کے جذبے کے تحت بے اختیار چلی اور بستر سے نیچے جا کھڑی ہوئی کمرے کا دروازہ قریب ہی تھا سُملی نے زبردستی دروازہ کھولا اور باہر نکل کر بھاگنے لگی۔ اس کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا باہر نکلنے سے قبل اس نے مڑ کر دیکھا مردہ اسی طرح بازو پھیلائے بے ہنگم قہقہے لگاتا اس کے پیچھے تھا۔

وہ اندھا دھند گلیوں میں بھاگنے لگی اسے پہنچ نہیں تھا کہ وہ کس سمت جا رہی ہے۔ اس کے قدم لمبے بھر کس وقت جب اس نے خود کو ای اسپتال کے سامنے پایا جس میں وہ نوکری کرتی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مردہ اس کے تعاقب میں اپنے لبادے کو پکڑ پکڑا ہوا ڈرنا چلا آ رہا تھا۔ وہ پھر سے بھاگنے لگی اسپتال کی ریلداریاں سنسان پڑی ہوئی تھیں وہ بھاگتے بھاگتے منہ کے بل گری اس کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی کیونکہ وہ جس چیز سے گرا کر گری تھی وہ ایک مردہ جسم تھا جو جانے کیسے فرش پر پڑا تھا اس نے دیکھا وہ اناٹوئی والے ڈپارٹمنٹ میں آ گئی تھی۔

اسی وقت مردہ ایک دم اس کے سامنے آ گیا، اس نے اپنے سر دھاتوں میں سُملی کا گھلا دیو ج لیا۔ سُملی نے چیخ کر پوچھا۔

”آخر میرا قصور کیا ہے تم کیوں مجھے مار ڈالنے پر تے ہو؟“ مردے نے عجیب بھدھی بھٹی ہوئی آواز سن کر کہا۔

”تم یاد کرو۔ میں تم سے اپنے قتل کا بدلہ لے رہا ہوں۔ تم نے مجھے لا پرواہی سے ایسا انجکشن لگایا تھا جس سے میری موت واقع ہو گئی تھی۔ میں اس اسپتال میں زندگی لینے آیا تھا مگر تم نے مجھے موت کے حوالے کر دیا۔ اب میں تمہیں قتل کر کے اپنے قتل کا بدلہ لوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھوں کا دباؤ اتنا بڑھا کہ سُملی کی سانسیں رک گئیں۔

اگلے دن کے اخبارات میں مردے کے ہاتھوں میں ولی مردہ بیٹی سُملی کی تصویریں شہر کے ہر سرائل پر موجود تھیں اور شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔



خونی مردے

صفر شاہین - ملتان

پھر ہول قبرستان میں دل دھلا دینے والی قرب و جوار کا سینہ چیرتی ہوئی ایک چنگھاڑتی آواز سنائی دی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رونگٹے کھڑے کرتی بدخراش اور دل گلزار منظر رونما ہوا۔

رات کے گھٹاؤپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک عجیب و غریب حیرت ناک انوکھی کہانی

تیس چالیس افراد مقامی پولیس اسٹیشن کے باہر جمع تھے۔ سردیوں کا سورج کہر میں لپٹا طلوع ہوا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور قصبے کے لوگ ابھی گرم بستروں میں دبکے ہوئے تھے اتنی صبح پولیس اسٹیشن پر لوگوں کی موجودگی انسپکٹر نوازیش کے لئے حیرت کا باعث تھی۔ نوازیش وقت کا پابند آفیسر تھا اور ٹھیک آٹھ بجے تھانے پہنچنا اس کا معمول تھا۔ اس سلسلے میں وہ بحیثیت انچارج اپنے ماتحتوں کو بھی سختی سے ہدایت کرتا رہتا تھا کہ وہ لوگ وقت کی پابندی کریں۔

انسپکٹر نوازیش نے اپنی جیب تھانے کے باہر دیوار کے ساتھ روکی اور انجن بند کر کے جیب سے اتر اٹو گیٹ پر کھڑے سنتری نے جلدی سے اسے سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔ نوازیش نے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے مجمع کی طرف دیکھا سب لوگ دیہاتی تھے۔ ان میں چند اوجیز عمر خواتین بھی تھیں جو زمین پر رکھی ایک چارپائی کے گرد غڑہ بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔ چارپائی پر کوئی شخص تھا جس کے جسم پر مکمل پھیلا ہوا تھا۔ نوازیش کے آنے پر وہ سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا بات ہے۔ یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟“ نوازیش نے گیٹ پر پہنچ کر سپاہی سے پوچھا۔

”یہ قریبی گاؤں سے آئے ہیں سر۔ لاش کا معاملہ ہے۔“ سپاہی نے کہا اور تفصیل بیان کی۔

”اوہ.....؟“ نوازیش نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے لیک فرد کو مبرے کرے میں لے آؤ۔“

یہ کہہ کر نوازیش تھانے میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ اتنے میں اس کا ماتحت سب انسپکٹر ناصر بھی اندر آ گیا اور اس نے سلام کیا۔

”بیٹھو ناصر۔ باہر کون لوگ ہیں؟“ نوازیش نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”معلوم نہیں سر۔“ ناصر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ”میں ناشتا کر رہا تھا کہ مجھے سنتری نے اطلاع دی۔ اب میں ان کی طرف جا رہا تھا کہ آپ آ گئے۔ شاید کوئی قتل کا کیس ہے۔“

اسی لمحے سنتری دو افراد کے ساتھ اندر آیا۔ ان دونوں افراد نے نوازیش کو سلام کیا، حلیہ سے وہ اپنے لوگوں میں ممتاز معلوم ہوتے تھے۔

”سر۔ یہ گاؤں کا نمبر دار غلام نبی ہے۔“ سنتری نے اوجیز عمر دیہاتی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ لاش کا بھائی ہے۔“

”لاش کا یا مستول کا۔“ نوازیش نے سنتری کا گھول۔

”قیل کا کیس نہیں ہے سر۔“ سنتری نے تیزی سے کہا۔

”اچھا۔ تم باہر جاؤ۔“ نوازش نے چوکتے ہوئے کہا تو سنتری باہر چلا گیا اور نوازش نے دونوں افراد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں بائیں سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے، ادیب عمر نبردار کا سامنی تقریباً چالیس برس کا سمحت مندا دی گئی۔

”نمبردار صاحب۔ فرمائیں کیا معاملہ ہے؟“ نوازش نے تیزی سے نبردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”انپکٹر صاحب۔ گزشتہ رات ہمارے گاؤں میں عجیب معاملہ پیش آیا۔“ نبردار نے کہا اور دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا نام اللہ بخش ہے، برسوں اس کا جوان بھائی رحیم بخش بیٹے کا شکار ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ کل سر پہر ہم نے رحیم بخش کو گاؤں سے باہر قبرستان میں دفنایا تھا لیکن آج فجر کی اذان کے وقت جب لوگ نماز کے لئے گھروں سے باہر نکلے تو گاؤں سے باہر کتوں کا بے پناہ شور سنا دیا کہ قبرستان میں بھونک رہے تھے، گاؤں کے دو تین افراد صورت حال معلوم کرنے قبرستان پہنچے تو وہاں رحیم بخش کی لاش قبر کے باہر پڑی تھی اور وہاں چند کتے جمع تھے، ان افراد کی اطلاع پر ہم سب وہاں گئے تو رحیم بخش کی میت کا کفن خون آلود تھا، کفن کھول کر دیکھا گیا تو لاش کے سینے پر نائے لگے ہوئے تھے جیسے اسپتال والے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش کا سینہ سینے ہیں۔ پھر ہم نے رحیم بخش کی قبر دیکھی تو قبر کھلی ہوئی تھی یوں تو مردار خود جانور بھی تازہ قبروں کو کھود کر میت کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن رحیم بخش کی لاش بالکل سلامت تھی اس لئے ہم لاش یہاں لے آئے ہیں تاکہ پولیس حقائق معلوم کرے۔ ہمارے خیال میں یہ جانوروں کا کام نہیں ہے۔ ورنہ ہم آپ کو زحمت دینے کے بجائے لاش کو دوبارہ دفن کر دیتے۔“ اتنا کہہ کر نبردار خاموش ہو گیا۔

نوازش اور سب انپکٹر ناصر نے حیرت سے

نمبردار کا بیان سنا۔ معاملہ واقعی عجیب تھا۔ ایک مردہ جہم کو قبر سے نکالنا اور اس کا سینہ چاک کرنا پھر سینہ کو نائے لگا کر بند کرنا اور اسے قبر کے باہر پھینک دینا حیوانوں کا کام نہیں ہو سکتا تھا، مذہب اور قانون کی رو سے یہ ناقابل معافی جرم تھا۔ نوازش نے لاش کا معائنہ کرنا ضروری سمجھا۔

”ناصر۔ تم قلم کاغذ لے کر آؤ۔ میں لاش دیکھتا ہوں۔“ نوازش نے سب انپکٹر ناصر کو ہدایت کرتے ہوئے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ نبردار اور اللہ بخش کے ہمراہ تھانے سے باہر آیا جہاں رحیم بخش کی میت موجود تھی۔ قریب بیچ کراس نے وہاں پیشی تم زدہ عورتوں کو ہٹا دیا۔ پھر میت سے کھل بنایا۔ وہ پچیس پچیس برس کی سمحت مندو جوان کی لاش تھی۔ سفید کفن پر مٹی اور خون جما ہوا تھا، نوازش کے اشارے پر اللہ بخش نے کفن کو کھولا تو نوازش کو بے حد حیرت ہوئی۔ کیونکہ لاش کو گردن سے لے کر ناف تک چڑچھاڑ کے بعد بے دھڑکنے پر تھے۔ یہی دیکھا تھا اس کے علاوہ لاش کے جسم پر کہیں کسی ذمہ کا نشان نہ تھا۔ اتنے میں سب انپکٹر ناصر بھی آ گیا۔ اس نے بھی لاش دیکھی اور حیران رہ گیا۔

”سر۔ یہ تو کسی نے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔“ ناصر نے نوازش سے کہا۔

”ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے۔“ نوازش نے سر ہلایا۔ ”اب تم نبردار اور اللہ بخش کے علاوہ ان لوگوں کے بیان بھی جنہوں نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی اس کے بعد لاش اسپتال لے جاؤ۔“

یہ ہدایات دے کر نوازش نے نبردار اور اللہ بخش کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر آپ لوگ کیس درج کرنا چاہتے ہیں تو پھر میت کو اسپتال لے جانا پڑے گا اور لاش کے پوسٹ مارٹم سے پتہ چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نامعلوم افراد نے لاش کو قبر سے نکالا اور اس کا سینہ چاک کر کے نائے لگا دیے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

اس سوال کا جواب پوسٹ مارٹم کرانے سے ہی ملے گا۔“

”انپکٹر صاحب۔ ہم بھی جی چاہتے ہیں۔ کیونکہ آج میرے بھائی کی میت خراب کی گئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ کل کسی اور لاش کو بھی قبر سے نکالا جائے اور اس کی بے حرمتی کی جائے۔“ اللہ بخش نے مودبانہ لہجہ میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن ہیں، جن لوگوں نے یہ بھیاک جرم کیا ہے۔ میں انہیں پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ نوازش نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔ ”اب آپ اپنے بیان لکھوائیں اور سب لوگوں کو گاؤں بھیج دیں۔ صرف آپ دونوں یہاں رہیں۔ تعویذی ویر بعد آپ میرے ساتھ قبرستان جائیں گے۔“

یہ ہدایت کر کے وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اور حوالدار سلامت علی کو طلب کر لیا۔

”موبائل تیار کر آؤ۔ کانسٹیبل اور تم میرے ساتھ جاؤ گے۔“ اس نے سلامت سے کہا۔

”بہتر جنب کہیں دور جانا ہے تو موبائل میں بیڑول بھر دیا جائے۔“ سلامت نے مودبانہ لہجہ میں کہا۔

”شہر سے باہر گاؤں میں جانا ہے۔ ڈرائیور سے کوئیل پانی چیک کر لے۔“ نوازش نے کہا تو سلامت خوش ہو گیا۔

”سر۔“ گاؤں کی دیسی مرغیاں بڑی مزے دار ہوتی ہیں۔“ سلامت نے احمقانہ لہجہ میں۔

”مٹ اپ۔“ نوازش نے اسے ڈانٹا۔ ”ہم تحقیق کے لئے جا رہے ہیں، مرغیاں کھانے شش، قبرستان جانا ہے ہمیں۔“

”اچھا جی۔۔۔۔۔۔“ سلامت نے چونک کر کہا۔

”کیا کسی کا فائدہ پڑے۔“

نوازش نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا اور سلامت نے گھبرا کر جملہ احورا چھوڑ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد ناصر کمرے میں داخل ہوا تو نوازش نے سوالیہ

نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان لوگوں کے بیانات لے لئے ہیں سر۔“ ناصر نے کہا اور پھر جھڑپ لکھے بیانات پڑھ کر سنانے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم لاش اسپتال لے جاؤ۔ میں گاؤں جا رہا ہوں میرے آنے تک پوسٹ مارٹم رپورٹ مل جانی چاہئے۔“ نوازش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”رائٹ سر۔ کیا لاش کو پوسٹ مارٹم کے بعد اس کے ورثہ کے حوالے کرنا ہے؟“ ناصر نے پوچھا تو نوازش نے اثبات میں سر ہلایا اور کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

پولیس موبائل شہر سے نکل کر گاؤں کی طرف جانے والی کچی سڑک پر دوڑنے لگی نوازش فرنٹ سیٹ پر تھا۔ اس کے عقب میں حوالدار سلامت اور دو کانسٹیبل، نبردار غلام نبی اور مرحوم کا بھائی اللہ بخش بیٹھے تھے۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد موبائل نے چھوٹی سی نہر کا پل عبور کیا تو عقب میں بیٹھے اللہ بخش نے بلند آواز میں کہا۔

”تھانیدار صاحب۔ آگے جہاں موڑ ہے اس کے بائیں جانب قبرستان ہے۔“

نوازش نے بائیں جانب دیکھا۔ اسی جانب کچھ فاصلے پر ایک کچی چار دیواری نظر آ رہی تھی جو زمین سے تقریباً چار فٹ بلند تھی اور اس میں داخل ہونے کے لئے راستہ بنا ہوا تھا جو موڑ کی طرف سے جاتا تھا۔ نوازش کی ہدایت پر ڈرائیور نے موڑ پر پہنچ کر گاڑی روک دی۔ نوازش موبائل سے اترتا دوسرے لوگ بھی موبائل سے اتر گئے۔ قبرستان کی طرف جانے کا کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا اور اس پر گاڑی نہیں جاسکتی تھی چنانچہ ڈرائیور کے سوا سب لوگ قبرستان کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

نوازش سب سے آگے تھا اور وہ آس پاس کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ احاطے کے قریب پہنچ کر اس نے نبردار کی نشاندہی پر اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں رحیم بخش کی لاش پائی گئی تھی۔ وہی جگہ تھی اور وہاں متحدہ جوانوں اور بچروں کے نشانات موجود تھے اس لئے یہ اندازہ لگانا

کہ ان میں مجرموں کے قدموں کے نشانات کون سے ہیں؟ ممکن نہ تھا۔ البتہ لاش پڑے رہنے سے زمین پر اس کا نشان بن گیا تھا۔ قدموں کے نشانات اس کے آس پاس تھے۔

پھر وہ سب قبرستان میں داخل ہوئے وہ گاؤں والوں کا آبائی قبرستان تھا جس میں بڑے بڑے اور گھنے درختوں کے علاوہ خورد و پودوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔ اکثر قبروں کے سر ہانے درخت اور پودے نظر آرہے تھے۔ مرحوم رحیم بخش کی قبر تقریباً وسط میں تھی۔ قبر ابھی تک کھلی ہوئی تھی اور اس کے گرد مٹی کے ڈھیر نظر آرہے تھے نوازش نے قبر کا جائزہ لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اوزار سے قبر کے اوپر کی مٹی ہٹائی گئی تھی۔ مٹی کے ڈھیروں پر بھی جوٹوں کے نشانات موجود تھے جو ظاہر ہے گاؤں والوں کے ہی ہو سکتے تھے جنہوں نے لاش ملنے کے بعد یہاں آ کر قبر کا جائزہ لیا تھا۔

”کیا لاش ملنے کے بعد آپ لوگوں میں سے کوئی قبر میں داخل ہوا تھا۔“ نوازش نے نمر دار سے پوچھا۔

”نہیں جناب۔۔۔۔۔ سب لوگ باہر کھڑے تھے
کسی میں ہمت ہی نہ تھی کہ قبر میں اترتا۔“ نمبر دار نے
جواب دیا۔

”کیوں؟ اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔“ حوالدار سلامت علی نے تیزی سے کہا۔
 آخرا ایک دن تو سب کو ہی.....“

”سلامت۔ خاموش رہو۔“ نوازش نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا اور پھر چونک کر قبر کے اندر جھانکنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑا قبر کے اندر میں جنون کے نشانات نظر آ رہے تھے جو قبر کے سرہانے کی طرف اور وسط میں تھے۔ وہ نشانات کافی واضح تھے۔

”سلامت۔ ذرا دیکھنا، یہ نشانات کس قسم کے
جوتوں کے ہیں۔“ نوازش نے سیدھے ہو کر سلامت
سے کہا۔

”سرجی۔ دیکھئے کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں سے پوچھ لیں کہ انہوں نے رحیم بخش کی لاش کو کس قسم کے جوتے پہنائے۔“ سلامت نے اتفاقاً بھڑا میں کہا۔

”نہیں جناب۔“ نمبردار نے جلدی سے
 کہا۔ ”بھلا میت کو جوتے پہنانے کی کیا ضرورت تھی
 میں۔“

”سلامت۔۔۔۔۔“ نوازش نے سلامت کو
گھورتے ہوئے کہا۔ ”سجید رہو۔ یہ خاق کا وقت نہیں
ہے۔“

”سوری سر.....!“ سلامت نے بوکھلا کر کہا
 اور پھر آگے بڑھ کر قبر کے کنارے گھٹنے ٹیک کر جھک
 کر قبر میں جمائے گئے۔

”سرجی۔ یہ تو پشاور کی چہل کے نشانات معلوم ہوتے ہیں۔“ سلامت نے چند لمحوں بعد نوازش کی طرف دیکھ کر کہا۔

”پشاور کی چیل کا ٹکڑا اسی طرح کا رہا ہے۔“
 وائس نے چمکتے ہوئے پوچھا تو سلامت نے اشیات
 میں سر بلا دیا، تب نواز اس سیدھا کھڑا ہو کر کچھ سوچے
 گا۔ گا۔ کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا تو ہی دہر
 جہ وہ تھانے میں واپس آ گئے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ
 مٹی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دیکھ کر انیسٹرولوجسٹ کی
آنکھیں جھلکنے لگیں۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔
مردم جو حرم جنس کی لاش تیسرے نکالنے کے بعد اس کا سینہ
پاک کر کے اندر سے دل گردے اور کلیجہ نکال لیا گیا تھا
اس مقصد کے لئے یقیناً ڈاکٹر کی اوزار استعمال کئے گئے
تھے۔ اعضا نکالے ہوئے بڑی نفاست سے کام
لیا گیا تھا البتہ سینے کی سلاخی کرتے ہوئے جلد بازی
یا تجربہ کاری سے کام لیا گیا تھا اور بڑے بے ڈنکے
لہراتے سے ٹانگے لگائے تھے۔

اسپتال والوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ لاش کے
عضو کسی ایسے گروہ نے نکالے تھے جس نے اعضا

نور و دشت کرتا تھا چنانچہ پولیس کو اب اس گرد و کا سرانگ
 تھا۔ اور یہ آسان کام نہ تھا۔ لیکن نواز نے فیصلہ
 کر لیا کہ وہ شقی القلب مجرموں کو گرفتار کر کے انہیں
 پھر کر دے اور ایک پہنچائے بغیر چھین سے نہیں بیٹھے گا۔ اس
 نے رحیم بخش کی لاش واپس گاؤں بھجوا دی اور خود
 مجرموں کا سرانگ لگانے کے لئے وقتی طور پر پانک
 لے لے لگا۔ شام کے وقت اس نے اپنے چند ساتھیوں
 کو طلب کر لیا۔

”تم لوگ شہر میں پھیل جاؤ اور معلوم کرو کہ آج
کسی میت کو دفنایا گیا ہے یا نہیں۔“ اس نے ماتحتوں
کو ہدایت کی۔

”سب اس قسم کے واقعات شہروں میں
 جہیں گاؤں گھوٹوں میں ہوا کرتے ہیں۔“ سب انسپکٹر
 اصرار نہ کیا۔ ”کیونکہ وہاں قبرستان گاؤں کے باہر
 دروازہ بادی سے کچھ فاصلے پر بنائے جاتے ہیں تاکہ
 سب سے گاؤں والے بھی وہاں میت دفن کیں۔“

”تمہاری بات درست ہے ناصر۔ لیکن جب
علاء واراقوں کا آغاز ہو جائے تو پھر مجرم ہر جگہ ہاتھ
مارتے ہیں۔ اب ضروری تو نہیں کہ آج بھی کوئی فوت
ہو جائے۔ لیکن اس گردہ کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں یہ
قدام کرنا ہی پڑے گا کہ ہر حال چند سپاہیوں کو ارد گرد کی
ستیلوں اور گھنٹوں میں بھیج دو۔ سات آٹھ بجے تک
معلومات مل جانی چاہئیں مجھے۔“ نواز ش نے کہا۔

”ختم کے ساڑھے چوبیس حسبِ لوحِ نوازش
ایک بخت نے رپورت دی کہ قصے میں شیخِ عمر دین
والدہ کو جو کثرتِ رات فوت ہوئی تھی آج سہ پہر
مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ دوسری اطلاع دس
بارہ منٹ بعد ملی کہ وہی بستی نورپور میں ایک کسان
کو گھوڑی دیر پہلے دفن کیا ہے، نوازش کے حصول مقصد
کے لئے دوسری اطلاع پہلی سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔

کہا۔ ”ناصر۔“ اس نے سب انگریزوں سے
آج رات نورپور کے قبرستان کی نگرانی ہونی
چاہئے۔“

”سر۔ شیخ عمر کی والدہ بھی قوفت ہوئی
۔ اس کے قبر کی نگرانی.....“ ناصر نے کہا۔

”ہیں۔۔۔۔۔“ نوازش اس کا جملہ جملے ہونے پہلے ہی بول پڑا۔ ”بے کار ہے۔ اول تو مجرم شہر کے ہستان میں واردات کرنے سے گریز میں گئے۔ اور شرح عمر کی والدہ ساٹھ بائیس کی ایک خاتون تھی اور رپورٹ کے مطابق گزشتہ دو ماہ سے فی بی کے مرض میں مبتلا تھی اگر مجرم انسانی اعضاء کی ملک کرتے ہیں تو ان کے لئے بڑھیا کی لاش بیکار ہے جبکہ نور پور دہلی آبادی ہے اور وہاں کبھی بھی نہیں ہے۔ پھر وہاں مرنے والا کسان نوجوان تھا۔ یوں کے لئے اس کی لاش قبر سے نکلتا آسان رہے جبکہ شہر میں مجرموں کے لئے خطرات زیادہ ہیں۔“

”پھر بھی جناب۔ ہمیں کسی امکان کو نظر انداز کرنا چاہیے۔“ ناصر نے کہا۔ ”کیونکہ جرم بھی دہریہ کی طرف سے ہو سکتا ہو گا۔“ انہیں یقیناً یہ ہو گا پولیس رجیمیشن کے واقعہ کی تفتیش کر رہی ہے اس سلسلے میں دہریہ قبرستان کی عمرانی کرے گی۔“

”تمہاری بات درست ہے ناصر۔“ نوازش نے سکراتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو مجرموں نے رحیم بخش کی لاش سے اس کے نازک ہاتھ نکلے ہیں اور وہ جوان تھا۔ اگر بوڑھوں کے کمزور افراد کے اعضاء انہیں درکار ہوں تو انہیں قبر میں بود کر لاش نکلانے کی ضرورت نہیں۔ ایسے افراد کو تودہ مار کر بھی اپنا مقصد پورا کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ ناصر نے اس کی بات سے
 واق کرتے ہوئے کہا۔ ”نور پور کے بھیجوں۔؟“

”سلامت اور تم چلے جاؤ۔ زیادہ نفری کی رورت نہیں، ورنہ مجرم ہوشیار ہو جائیں گے۔ فی الحال میں ان کے ٹھکانے کا سراغ لگانا ہے گرفتاری کا مرحلہ میں آئے گا۔“ نواز ش نے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ”رات نو بجے صبح سچے بجے تک تم دونوں کو چھپنا۔ تازہ قبر کی نگرانی کرنی ہے۔ سادہ لباس میں

جانا۔ مگر اسلحہ ساتھ رکھنا۔“

نوازش نے مزید چند ہدایات دیں جو ناصر نے ذہن نشین کر لیں۔ پھر وہ نوازش کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناصر نے حوالدار سلامت کو اپنے کمرے میں طلب کر کے انپکڑ نوازش کا حکم سنایا تو سلامت گھبرا گیا۔

”اوہ سرجی۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ مجھ پر نہیں تو میرے بچوں پر ہی رحم کھائیں۔“ سلامت نے بولکھلا کر کہا۔

”تمہارے بچے۔“ ناصر نے اسے حیرت سے گھورا۔ ”مگر تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“

”آخر ہوئی تو ہے ناں۔ پھر بچے پیدا ہوتے کون ہی دیر لگتی ہے۔“ سلامت نے مذہبور کر کہا۔

”بکومت۔“ ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”فرض کی ادائیگی ضروری ہے۔“

”فرض تو میری جگر کی نماز میں روزانہ ادا کرتا ہوں سرجی۔“ سلامت تیزی سے بولا۔

”نال منول کرنے کی بجائے تم نوازش صاحب کے پاس چلے جاؤ اور ان سے بات کرو۔“ ناصر نے اسے گھومتے ہوئے کہا۔

”اچھا جناب چلے۔“ سلامت نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میرا معطل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

چند منٹ بعد ناصر کی موٹر سائیکل سڑک پر دوڑ رہی تھی اس کے عقب میں حوالدار سلامت بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ چائے کا تھرماس سلامت نے کندھے پر لٹکا رکھا تھا جبکہ رات کے کھانے کے طور پر پکٹ کے دو پکٹ اس نے کٹ کی جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے۔ ناصر کی جیبوں میں بھی دو پکٹ تھے سردیوں کی رات شرع ہو چکی تھی۔ بستی نور پور شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی وہ بستی میں روڈ سے تقریباً ایک میل دور تھی جبکہ بستی کا قبرستان بستی

سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر نہر کے قریب واقع تھوڑے موٹر سائیکل بستی کی طرف جانے والے راستے پر اتاری۔ یہ راستہ بستی کے باہر سے گزر کر نہر کی طرف جاتا تھا نہر کے پار بھی کئی بستیاں تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ قبرستان کے سامنے پہنچے۔ قبرستان اس راستے کے بائیں جانب چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ قبروں کو بالادوں سے پہانے کے لئے قبرستان کے گرد چارٹ بلندی چار دیواری بنائی گئی تھی جس میں داخلے کے اور راستے تھے ایک سڑک کی طرف سے اور دوسرا بستی کی جانب سے۔ قبرستان کی اندرونی

اطراف میں بڑے بڑے اور گھنے درخت تھے جو تاریکی میں بڑے ہولناک دکھائی دے رہے تھے۔ قبرستان کا چونی پھاٹک بندھا۔ وہاں پہنچ کر ناصر نے موٹر سائیکل روکی اور انجن بند کر دیا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے، قبرستان پر سکوت مرگ طاری تھا۔

دونوں موٹر سائیکل سے اترے اور ناصر کے اشارے پر سلامت نے بڑھ کر پھاٹک کھول دیا۔ ناصر موٹر سائیکل اندر لایا اور سلامت نے پھاٹک بند کر دیا۔

چاروں طرف بچی بچی قبریں پھیل ہوئی تھیں جن کے آس پاس قدرتی پودے اور گھٹی جھاڑیاں تھیں۔

ناصر نے پھاٹک کے بائیں جانب دیوار اور درختوں کے درمیان موٹر سائیکل کھڑی کی۔ پھر سلامت کے ساتھ قبرستان میں گھوم پھر کر بستی

قبر تلاش کرنے لگا۔ اس نے پھل مارچ کی عمدہ دھند میں جلد ہی ایک تازہ قبر تلاش کر لی۔ وہ قبر مٹی کا ڈھیر دکھائی دے رہی تھی اور اس کے سر ہانے ایک چھانڈا تھا جو کہ ہوا سے بچھ گیا تھا۔ پھر اس قبر سے دس بارہ فٹ

اور اونچے تھوڑی والی قبر کا رخ کیا جس کے سر ہانے ایک درخت تھا اور اس درخت کی شاخیں قبر پر چھکی ہوئی تھیں۔

وہ ان کے چھینے کے لئے بہتر سن جگہ تھی۔ چنانچہ دونوں اس قبر کے عقب میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں سے وہ تازہ قبر اور پھاٹک کو دیکھ سکتے تھے۔

”سرجی۔ میرا خیال ہے کہ کچھ پیٹ پوجا کر لے۔“

چاہئے۔“ سلامت نے ناصر سے کہا۔

”جستہ بولو۔۔۔۔۔؟“ ناصر نے ہدایت کی۔

”کیوں سرجی؟ کیا مردے سن لیں گے۔“

”یہاں مذاق کی گنجائش نہیں ہے احسن۔“

ناصر نے بے اعتبار مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی۔ چائے پینے کی گنجائش تو ہے۔“

”سلامت نے تھرماس کھولتے ہوئے کہا۔

ناصر خاموش رہا انہوں نے چائے کے ساٹھ بکٹ کھائے پھر ناصر نے سگریٹ سلگایا اور پھاٹک کی طرف دیکھنے لگا۔

قبرستان کی فضا پر ہولناک سانے کا راج تھی۔ اس ابدی سکوت میں ہوا سے کوئی خشک پتہ بھی کھڑکھڑاتا تو سلامت چونک کر خوف زدگانوں سے ادھر ادھر کیٹنے لگتا۔ جوں جوں رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سب

ایک دوسرے پر بے چینی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ قبرستان کا چونی پھاٹک اگرچہ بند تھا لیکن متعل نہیں تھا اور اسے کھولنے کے لئے زور لگانا پڑتا تھا اس کا کھیتوں کی طرف کیٹنے والا پھاٹک بھی بند تھا۔ مگر راستے میں حائل قبروں اور جھاڑیوں کے سبب ان کی نگاہوں سے اوچھل تھا۔

دس بج گئے لیکن کوئی غیر معمولی بات ظہور میں نہ آئی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور گرم لباسوں کے باوجود دونوں ٹھنڈے جا رہے تھے۔ وہ

دونوں قبر کے سر ہانے کی جانب بیٹھے تھے۔ ایک گھڑ پر ناصر اور دوسرے پر سلامت تھا سردی سے سلامت کے دانت بج رہے تھے گزشتہ ایک گھنٹے کے

دوران انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن اب سلامت اس طویل خاموشی سے تنگ آ چکا تھا۔

”سرجی۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں ناصر کو مخاطب کیا۔ ”چائے دوں آپ کو؟“

”نہیں۔“ ابھی طلب نہیں ہے۔“ ناصر نے آہستہ سے کہا۔

”مگر میری تو سردی سے قلفی جی جا رہی ہے۔“

”لیں۔“ سلامت نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں سرجی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جسم لے لیں۔“ سلامت نے آہستہ سے کہا۔

مجھے لگتا ہے ہم جھک مارے ہیں۔“ سلامت بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔؟“ ناصر نے اندھیرے میں اسے گھورا۔

”اور کیا۔۔۔۔۔ سلامت نے منہ بتایا۔“ جب شہر

میں مجرموں کے لئے ایک تازہ لاش موجود ہے تو انہیں اتنی دور آنے کی ضرورت ہے۔“

”بکواس نہ کر دو۔“ ناصر نے اکتا کر کہا۔ ”مجرم

آئیں نہ آئیں، ہمیں تو اپنی ڈیوٹی پوری کرنی ہے۔“

”اچھا جی۔ آپ کا مطلب تو یہ ہوا کہ۔ وہ

آئیں نہ آئیں، ابھی ہیں نگاہیں۔ چھپ چھپ کر دیکھیں ہم ان کی رائیں۔“ وہ گنگنا لے لگا تو

ناصر بے اختیار مسکراتے لگا۔

”بس۔ اب خاموش ہو جاؤ۔“ ناصر نے سخت لہجے میں کہا اور سلامت خاموش ہو کر تازہ قبر کی طرف دیکھنے لگا۔

”اوہ۔ سرجی۔ آپ نے کچھ سنا۔“ چند لمحوں بعد وہ ا یکدم سہم کر بولا۔

”کیا بات ہے۔“ ناصر نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”لگتا ہے کوئی مردہ دوسرے مردے سے ہاتھیں کر رہا ہے۔“ سلامت سرسید لہجے میں بولا۔ ان کی ہلکی ہلکی آواز سنی ہے میں نے۔“

ناصر نے غور سے سننے کی کوشش کی مگر اسے مطلق کوئی آواز نہ سنائی دی، اس نے سر جھک کر کہا۔ ”کچھ نہیں، تمہیں وہم ہوا ہے۔“

اسی لمحے ان کے عقب سے ہلکی سی آواز ابھری اور سلامت ایک دم ڈر کر ناصر کے قریب ہو گیا۔

”سرجی۔ کوئی ہمارے پیچھے چل رہا ہے۔“ سلامت نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”یہاں ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔“ ناصر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”خواہ خواہ پورمت کر دو۔“

”نہیں سرجی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جسم لے لیں۔“ سلامت نے آہستہ سے کہا۔

ٹھیک اسی لمحے ناصر کی سماعت سے ایک غیر معمولی آواز نکلائی اور وہ چونک کر قبرستان کے پھاٹک کی طرف دیکھنے لگا۔

قبرستان کا داخلی پھاٹک آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ ناصر نے سلامت کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو سلامت بھی پھاٹک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ستاروں کی مدد میں پھاٹک میں پھاٹک تھوڑا سا کھل گیا اور ایک کفن پوش اندر آیا۔ وہ سر تا پا سفید کفن میں لپٹا ہوا کوئی مرد تھا۔ اسے دیکھ کر سلامت ایک دم خوف زدہ ہو گیا۔ ناصر کی نگاہیں اس کفن پوش مرد سے ہرگز نہیں اندر آ کر اس مردے نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا پھر آہستہ آہستہ گے بڑھنے لگا۔

”سرسر جی۔“ سلامت نے خوف سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو۔۔۔ یقیناً۔۔۔“ کفن پوش مرد تازہ قبر کے سامنے پہنچا اور وہاں رک کر اس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے رخ بدلا اور تازہ قبر کے سر پائے پہنچ گیا۔ ناصر اور سلامت کی طرف اس کی پشت گئی۔ چند لمحوں بعد ایک دم شعل بھڑکا اور قبر پر رکھا چراغ جلنے لگا۔ ناصر دم سادھے اس مردے کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور سلامت خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کفن پوش نے سیدھے ہو کر پھاٹک کی طرف رخ کیا اور ایک ہاتھ لہرایا۔ ناصر اور سلامت نے تیزی سے پھاٹک کی طرف دیکھا تو وہاں تین اور کفن پوش کھڑے تھے۔ وہ تینوں بھی آگے بڑھنے لگے چراغ کی روشنی میں وہ بھی ہوئی رو میں معلوم ہو رہے تھے وہ اپنے سامنے مردے کے پاس پہنچے اور پہلا مردہ آہستہ آہستہ ان سے کچھ کہنے لگا۔

دفعتاً ان کفن پوش مردوں نے رخ بدل کر اس سمت دیکھا جس طرف ناصر اور سلامت پوشیدہ تھے اور پھر زور زور سے قہقہہ لگانے لگے، ناصر ان کی اس حرکت پر حیران ہوا لیکن سلامت دہشت زدہ ہو کر کانپنے لگا۔ ناصر کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر پھر ان کفن پوش مردوں کو اپنی طرف آتے دیکھ

کر اس کے بدن میں عجیب سنسنائی سی پھیلی جاتی تھی وہ چاروں کفن پوش مردے بے ڈھنگے پن سے بڑھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

”اچھا ہوا اب ہم پیٹ بھر کر گوشت کھا کر گے۔“ دفعتاً ایک مردے کی آواز بلند ہوئی۔ ”پولیس والوں کا گوشت تو مجھے بہت مرغز ہے۔“ دوسرے مردے نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ان کی باتیں سن کر سلامت خوف سے گھلایا لگا۔ ناصر نے ریوالور کے دستانے پر ہاتھ کی گرفت تھو کر لی تھی۔

”دس۔ سر جی۔“ نکل چلیں۔۔۔۔۔ سلامت نے بہ مشکل سر کٹھنی کی۔ لیکن ناصر نے کوئی جواب نہ دیا اسی لمحے چار بھر بھجھ گیا اور وہاں تاریکی پھیل گئی وہ چاروں کفن پوش مردے اس قبر سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر رک گئے۔ ”باہر نکل آؤ دوستو۔“ ایک مردے کی گرجاؤ آواز دی۔ ”ہم کھلی جگہ پر تمہارا خون پینا چاہتے ہیں۔“ جواب میں وہ دونوں خاموش رہے۔ الجھناؤاش کی ہدایت کے مطابق ناصر بڑی برواشت سے کام لے رہا تھا۔

”وہ ادھر نہیں ہیں۔ ورنہ ہمیں دیکھ کر غماخ خوف سے چیختے گتے۔“ ایک مردے کی آواز ابھری۔ ”تو پھر۔۔۔ وہ کہاں ہو سکتے ہیں۔“ دوسرے مردے نے کہا۔ ”ان کی موٹر سائیکل تو دیوار کے پاس موجود ہے۔“

”جلد ہی دیکھو۔“ تیسرے مردے کی آواز سنائی دی۔ ”ابھی بہت کام کرنا ہے میں۔“

”آؤ۔۔۔ ادھر دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے“ دوسرے پھاٹک کے قریب چھپے ہوئے ہوں۔“ پھر ان کے پیوٹل حرکت کرتے ہوئے دوسرے پھاٹک کی طرف جانے لگے۔ ناصر سوچنے لگا کہ اگر وہ اپنی موٹر سائیکل قبرستان سے باہر ہی کہیں

آ کر بیٹھا تو کفن پوش مردے ان کی موجودگی سے بے خبر رہتے جلدیادہ چاروں کفن پوش درختوں کی آڑ میں چلے گئے۔

”دس۔ سر جی۔ یہاں سے چلیں۔ یہ آدم خور مردے ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ سلامت نے ہاسرے سر کٹھنی کی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ناصر نے سخت لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ”چپ چاپ بیٹھو اور دیکھتے ہو۔“

”سلامت دوبارہ کچھ نہ بولا۔ چند لمحوں بعد اچانک کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی اور ناصر چونک پڑا۔

انجن کی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی چند لمحوں بعد وہ آواز بند ہو گئی جیسے انجن بند کر دیا گیا ہو۔ ناصر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب کے مطابق کوئی گاڑی قبرستان کے باہر آ کر رک گئی تھی۔ وہ پھاٹک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد پھاٹک کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کدال تھی۔

”سلامت۔۔۔۔۔ ہو شیار ہو جاؤ۔“ ناصر نے آہستہ سے سلامت کو مخاطب کر کے کہا۔

”کک۔۔۔ کیوں۔ سر جی؟“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”ادھر دیکھو۔ قبر کو دفنے والا آرہا ہے۔“ ناصر نے پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سلامت نے پھاٹک کی طرف سے آنے والے فانی کو دیکھا اور حیرت سے اچھل پڑا۔ ”اوہ۔ یہ تو زندہ انسان ہے سر؟“

”وہ کفن پوش بھی زندہ انسان ہیں۔“ ناصر نے کہا۔ ”نہم یہاں بیٹھے دیکھتے رہو میں ذرا باہر کا جائزہ لیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ناصر اپنی جگہ سے پیچھے کی طرف سر کٹا چلا گیا۔ سلامت حیرت سے کدال بردار کو دیکھ رہا تھا مگر ادھر ادھر دیکھا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ

آدی تازہ قبر کے پاس پہنچا اور رک کر جیسے کچھ نکالنے لگا پھر اس کے ہاتھ میں ایک نارنج روشن ہو گئی اس نے نارنج قبر کے سر پائے پر بیٹھ کر اس طرح رکھی کہ روشنی قبر کے پاؤں کی جانب پڑنے لگے۔ سلامت کو اس کے چہرے پر سیاہ نقاب دکھائی دیا۔ اس نقاب پوش نے چست لباس پہنا ہوا تھا جس کے اوپر اس نے گرم جزی پہن رکھی تھی۔ نارنج رکھنے کے بعد اس نے منہ سے الو کی کرخت آواز نکالی۔ ایک لمحہ بعد اس جانب سے بھی الو کی آواز ابھری جس طرف کفن پوش مردے گئے تھے۔

سلامت نے اس طرف دیکھا تو وہ کفن پوش دائیں آ رہے تھے لیکن اب ان کے سروں سے کفن اتر رہا تھا۔ جلد ہی وہ کفن پوش نقاب پوش آدمی کے قریب آ گئے۔

”تم لوگ ادھر کیا کر رہے تھے؟“ کدال بردار نقاب پوش نے سخت لہجے میں ان سے پوچھا۔

”پولیس والوں کو دیکھنے گئے تھے“ جناب۔۔۔ ایک کفن پوش نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

”پولیس۔۔۔؟“ نقاب پوش کی چونکتی ہوئی آواز ابھری۔

”میں کیپٹن۔۔۔۔۔ کفن پوش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں پہنچے تو ادھر پھاٹک سے زماہٹ کر موٹر سائیکل کے ٹائرز کے نشانات نظر آئے۔ وہ موٹر سائیکل درختوں کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑی ہے اور اس کی نمبر پلیٹ کارنگ مخصوص ہے لیکن وہ ہمیں نہیں ملے۔ شاید ہمیں دیکھتے ہی ڈر کر فرار ہو گئے تھے۔“

”اوہ۔ تم نے اچھی طرح چیک کر لیا ہے نا۔؟“ نقاب پوش نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا جسے کفن پوش نے کیپٹن کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

”میں سر۔“ دوسرے کفن پوش نے کہا۔ ”نمبر سکس اور فور اب انہیں باہر تلاش کرنے گئے ہیں۔“

”خیر تم کام شروع کر دو۔ موٹر سائیکل پر آنے والے دو سے زیادہ افراد نہیں ہوں گے اور ان سے بخوبی نمٹا جاسکتا ہے۔“ کیپٹن نامی شخص نے کہا۔

اس کی بات سن کر ایک کفن پوش نے اپنا کفن اتارا اور کدال اٹھائی۔ دوسرے کفن پوش نے تاریخ اٹھائی اور اس کی روشنی قبر پر ڈالنے لگا۔

نقاب پوش کپٹن نے اپنی جیب سے ریو اور نکالا اور ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کدال والا شخص قبر کی کھدائی کرنے لگا۔

”نمبر فور اور سکس کھیتوں کی طرف ہیں یا سرک کی جانب۔؟“ کپٹن نے سوال کیا۔

”جانتا نہیں۔ ہم تو پھاٹک سے واپس چلے آئے تھے آپ کی گاڑی کی آواز سن کر۔“ تاریخ بردار نے جواب میں کہا۔

”اچھا۔ تم جلدی کام ختم کرو۔ میں انہیں دیکھتا ہوں۔“ کپٹن نے کہا اور پلٹ کر پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔

سلامت خاموشی سے اسے دیکھتا رہا کپٹن پھاٹک سے باہر نکل گیا تو سلامت دوبارہ قبر کھودنے والے کفن پوش کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے ناصر کی فکر تھی کہ کہیں نمبر سکس اور فور کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ چند منٹ بعد اسے اچانک اپنے عقب میں خشک پتے چھرانے کی آواز سنائی دی۔ سلامت نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔

ادھر صبر انسپکٹر ناصر کوئی آواز پیدا کئے بغیر دیوار کے پاس پہنچا پھر ریو اور جیب میں رکھ کر وہ دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ اس طرف کھیت تھے اور وہ دیوار کے ساتھ چلتا ہوا چار دیواری کی طرف پہنچا اور آڑ میں رک کر سامنے کی جانب جھانکا تو اس طرف پھاٹک سے چند قدم دور ایک دین کھڑی تھی جس کی بتیاں بجھی ہوئی اور انجن بند تھا ساروں کی مدد میں روشنی میں دور سے یہ اندازہ کرنا سراسر تھا کہ دین کے اندر کوئی فرد موجود ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ دبے پاؤں دین کی طرف بڑھنے لگا اس جانب دین کا پہلو تھا۔ وہ ہاتھ میں ریو اور لئے کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر دین کے قریب پہنچا۔ کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکنے پر وہ ایبولینس

دین ثابت ہوئی جس میں اسٹرچر سمیت کئی چیزیں موجود تھیں۔

ناصر نے جیب سے نیشنل تاریخ نکالی اور اس کی روشنی دین کے اندرونی توبے اختیار چونک پلٹا اندر ایک ٹرے میں کئی آلات جراحی رکھے تھے۔ اس نے تاریخ بچھائی اور وہاں سے ہتھ کر واپس چل دیا کچھ پر پہنچ کر وہ جوں ہی قبرستان کے پہلو کی جانب ہڑا۔ ایک دم بوکھلا گیا۔ وہاں دو کفن پوش کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں ریو اور وہ بے ہوش تھے۔ ایک کفن پوش شخص نے فوراً ہی اپنے ریو اور کی نال ناصر کے بچے سے لگا دی۔

”نمبر وار۔ کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ سینے میں سوراخ کر دوں گا۔ ریو اور پھینک دو۔“ کفن پوش آہستہ سے غرایا۔

ناصر نے گہرا سانس لیا اور اپنے ہاتھ میں موجود ریو اور گرایا۔ دوسرے کفن پوش نے ریو اور اٹھا کر ناصر پر اتار لیا۔

”نمبر فور۔ یہ صبر انسپکٹر ناصر ہے۔ یقیناً اس کا کوئی ساتھی بھی ہوگا۔“ سامنے والے کفن پوش نے ناصر سے لگا ہوا ہتھ بٹائیے بغیر دوسرے سے کہا۔

”تمہارا ساتھی کہاں ہے انسپکٹر؟“ نمبر فور نامی دوسرے کفن پوش نے سخت لہجے میں ناصر سے پوچھا۔

”میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔“ ناصر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”نمبر سکس۔ اسے بے ہوش کرو۔ وقت کم ہے۔“ نمبر فور نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”دیکھیں خود ان کا فیصلہ کرے گا۔“

نمبر سکس نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً ریو اور کا دستہ ناصر کی کپٹنی پر سید کر دیا۔ ناصر لڑکھڑا اور ڈوبے ذہن کے ساتھ زمین پر گرنا چلا گیا۔

ہوش آیا تو وہ قبرستان کی بجائے اسپتال میں تھا پر پڑا تھا اور ایک ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر رہا تھا جبکہ انسپکٹر نواز شریف قریب کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل

بھی موجود تھا۔

”پہلو ناصر۔ کیسی طبیعت ہے۔؟“ نواز شریف نے اس پر جھپٹتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں سر۔“ ناصر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے یہاں کون لایا۔؟“

”میں لایا ہوں۔ تم قبرستان کے باہر کھیتوں میں بے ہوش پڑے تھے۔“ نواز شریف نے کہا۔ ”حوالدار سلامت کہاں ہے؟“

”وہ قبرستان کے اندر تھا۔ شاید وہ بھی وہاں بے ہوش پڑا ہو۔؟“ ناصر نے جواب میں کہا۔

”نہیں۔ ہم نے قبرستان کا ایک ایک گوشہ چھان مارا ہے۔ سلامت وہاں نہیں ملا۔“ نواز شریف نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

”اوہ۔ کہیں وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے گئے ہوں۔“ ناصر نے ایک دم چونکے ہوئے کہا۔

”وہ کون؟ تم ذرا اچھی طرح ہوش میں آ جاؤ تو پھر تفصیل رپورٹ دینا۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں۔“ نواز شریف نے نرمی سے کہا۔

”تھیک یوسر۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ناصر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا سر میں درد ہے ایک مجرم نے میری کپٹنی پر ریو اور کا دستہ مارا تھا۔“

پھر وہ تفصیل سے گزشتہ واقعات بتانے لگا۔ اس نے ایبولینس دین کا نمبر بتایا تو نواز شریف نے وہاں موجود کانسٹیبل کو دین کی تلاش کے سلسلے میں چند ہدایات دیں۔ پھر دوبارہ ناصر کی رپورٹ سننے لگا۔

”میں رات بھر تہاری کال کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بار بجے میں تمہاری طرف جانے کا فیصلہ کیا۔“ اور تب ”میں وہاں پہنچا تو تم قبرستان کے اندر باہر کہیں غمزدہ آئے پھر تلاش کرنے پر تم قریبی کھیت میں نہیں پڑے دکھائی دیے۔“ قبرستان کے اندر تازہ قبر کھدی ہوئی تھی اور اس میں سے لاش غائب تھی۔ اس قبر کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک قبر کے عقب میں پائے کا قمر باس اور حوالدار سلامت کا ریو اور بھی ملا۔

لیکن سلامت خود کہیں نہ ملا۔ یقیناً مجرم اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔“

”اوہ۔ کہیں وہ لوگ سلامت کو قتل کر کے اس کے اندر دینی اعضا بھی نہ نکال لیں۔“ ناصر نے چونکتے ہوئے اندیشہ ظاہر کیا۔

”اگر تم خود کو کفٹ محسوس کرتے ہو تو آؤ چلتے ہیں۔“ نواز شریف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اٹنے میں کانسٹیبل واپس آ گیا۔

”سر میں نے تھانے فون کر دیا ہے عذر نے دین کی تلاش میں آؤی بھیج دیے ہیں۔“ اس نے نواز شریف سے کہا۔

چند منٹ بعد ناصر اور نواز شریف اسپتال سے پولیس اسٹیشن پہنچے تو ایک نئی اطلاع ان کی منتظر تھی کسی نامعلوم شخص نے فون پر تھانہ عذر کو اطلاع دی تھی کہ حوالدار سلامت علی اس کی قید میں ہے۔ اگر اس کی زندگی درکار ہے تو لاشوں کی چوری کے سلسلے میں کسی قسم کی کارروائی نہ کی جائے اور جس لمحے بھی ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا یا ہمیں خطرہ محسوس ہوا تو ہم حوالدار سلامت کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اگر پولیس نے تعاون کیا تو ایک ماہ بعد سلامت کو آزاد کر دیا جائے گا۔

چونکہ مجرموں نے موبائل فون سے کال کی تھی اس لئے ان کا فون نمبر ٹریس نہیں کیا جاسکا۔ بہر حال نواز شریف اور ناصر مجرموں کی اس کال سے پریشان ہو گئے تھے اگر وہ مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرتے تو پورے محکمہ کی بدنامی ہوتی اگر وہ کوئی قدم اٹھاتے تو سلامت کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ کافی سوچ بچار کے بعد نواز شریف نے حتمی فیصلہ کیا کہ مجرموں کو وہ کھلی چھوٹ نہیں دے گا اگر مجرم مسلسل اپنے خوفناک اور غیر انسانی فعل کو دہراتے رہے تو پورے علاقے میں کھرام مچ جائے گا اور لوگ پولیس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

”لیکن سر۔۔۔۔۔ سلامت کا کیا بنے گا؟“ ناصر نے نواز شریف کا فیصلہ سن کر کہا۔

”ایک آدمی کی جان بچانے کے لئے ہم پورے شہر کو بھرموں کے رحم و کرم پر نہیں جھوڑ سکتے۔“ نواز نے سخت لہجے میں کہا۔

ناصر بھی یہی چاہتا تھا۔ لیکن حوالدار سلامت علی ان کے لئے اہم تھا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے وہ پہر تک بھرموں کی دین کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ نور پور کے قبرستان سے چوری کی جانے والی لاش کا بھی کوئی کھوج نہ لگایا جاسکا۔ پہلی واردات میں بھرموں نے نہ بولیں دین کے اندر ہی اپنا کام مکمل کر کے لاش وہیں پھینک دی تھی لیکن وہ دوسری لاش اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

دوپہر کے بعد نواز نے بے دلی سے سوچ کیا۔ پھر چائے پینے کے دوران ایک سپاہی نے آن کر اطلاع دی کہ محلہ بھادڑا باد میں صبح سویرے ایک نوجوان لڑکی فوت ہوئی تھی جسے عید گاہ کے قبرستان میں شام کے وقت دفن کیا جائے گا لڑکی کی موت کی وجہ معلوم نہ تھی۔ میں تین دن جتلا رہے کے بعد وہ مر گئی تھی نواز نے اطلاع لانے والے سپاہی کو ہدایت کی کہ وہ سادہ لباس میں لڑکی کے جنازے کے ساتھ جائے اور دفن کے دوران جنازے کے شرکاء پر نگاہ رکھے کوئی شخص مشتبہ محسوس ہو تو اس کی نگرانی کی جائے پھر رات کے وقت اس لڑکی کی قبر کی نگرانی کی جائے۔

شام سے ذرا پہلے ایک اور اطلاع موصول ہوئی کہ نواحی گاؤں بلوچ نگر میں ایک نوجوان زمیندار کو پیر دھاک کیا گیا ہے وہ نوجوان گزشتہ روز کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے فورٹ عباس گیا تھا۔ وہاں دعوت دہندہ میں اس نے اتنا زیادہ کھالیا تھا کہ شدید پیٹ درد میں مبتلا ہو کر وہیں فوت ہو گیا تھا اور آج اس کی میت وہاں سے گاؤں لائی گئی تھی جہاں اسے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ نواز کے لئے یہ اطلاع پہلے سے زیادہ اہم تھی کیونکہ گزشتہ واردات میں بھی وہی علاقوں میں کی گئی تھی چنانچہ رات آٹھ بجے وہ سب انسپکٹر ناصر اور دو سپاہیوں کے ساتھ بلوچ نگر روانہ ہو گیا جو شہر سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔

وہاں جانے کے لئے نواز اس کے ہاتھوں نے سادہ لباس پہنے تھے اور بس سے سڑکی کنارے پھر وہ میں روڈ پر بس سے اترے اور پیدل ہی گاؤں بلوچ نگر جانے والے راستے پر چلے گئے۔ اس راستے پر نواز کا ایک ماتحت اے ایس آئی تاجر پہلے سے ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ بھی سادہ لباس میں تھا اور شہر کے ساتھ بچے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کوئی گاڑی یا شہری آدمی گاؤں کی طرف جاتا ہوا نہیں دکھائی دیا۔ نواز نے تاجر کو ہدایت کی کہ جب بھی کوئی گاڑی گاؤں کی طرف جائے وہ فوری طور پر موبائل فون سے اسے کال کرے اس کے بعد نواز اپنے ہاتھوں کے ساتھ آگے بڑھ چلا گیا۔

حوالدار سلامت کا انخوا پولیس کی بدنامی تھی اس لئے اس واقعہ کی نواز اور اس کے ہاتھوں کے سوا کسی کو خبر نہ تھی نواز نے اپنے عمل کو کتنی سے منع کر دیا تھا کہ وہ تھانے سے باہر سلامت کے انخوا کا ذکر نہ کریں لیکن اب بلوچ نگر کی طرف بڑھتے ہوئے نواز سوچ رہا تھا کہ اگر بھرموں نے اپنی دھمکی پر عمل کر ڈالا تو پورے شہر میں یہ خبر پھیل جائے گی اور نہ صرف لوگوں کا پولیس پر سے اعتماد اٹھ جائے گا بلکہ محکمے کے افسران بالا میں اس سے جواب طلب کریں گے کہ انہیں سلامت کے انخوا کی خبر کیوں نہیں دی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بلوچ نگر کے قبرستان کے قریب پہنچ گئے۔ قبرستان گاؤں کی آبادی سے تقریباً تین سو گز پیچھے اور سڑک سے چالیس پیچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ قبرستان کے گرد حفاظتی چار دیواری نہیں تھی البتہ اس کے چاروں طرف پرانے گئے درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی اس میں داخل ہونے کے دوران سے تھے یعنی ایک سڑک کی جانب اور دوسرا کھیتوں کی طرف تھا۔ گاؤں والے ادھر سے ہی جنازہ وہاں لایا کرتے تھے کیونکہ اس طرف سے آبادی قریب تھی۔

نواز اور ناصر دونوں سپاہیوں کے ہمراہ

خاموشی سے قبرستان میں داخل ہوئے۔ ستاروں کی روشنی میں دو تک قبریں دکھائی دے رہی تھیں۔ نوجوان زمیندار ہاشم خان کی تازہ قبر پر چراغ جل رہا تھا۔ اکثر قبروں کے پاس جھاڑیاں یا پھول دار پودے لگے ہوتے تھے۔ نواز نے ہاشم خان کی قبر کے پاس رک کر اس پاس کا جنازہ لیا پھر دونوں سپاہیوں میں سے ایک کو ہاشم کی قبر سے چند قدم دُور ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھایا اور دوسرے سپاہی کو کھیتوں کی طرف سے آنے والے راستے کے پاس ایک درخت پر چڑھنے کی ہدایت کی جو ہاشم کی قبر کے بائیں جانب واقع تھا۔ پھر اس نے ناصر کو قبرستان کے داخلی راستے کے قریب ایک گئے درخت کے پیچھے پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا جبکہ وہ خود ہاشم کی قبر کے سر ہانے ایک جھاڑی میں گھس گیا اور خود کو جھاڑی میں چھپا کر انتظار کرنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے گزر گئے لیکن کچھ نہ ہوا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر بے چینی سے کسی واقعہ کے رونما ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ رات کے بارہ بجے ناصر کشادہ تھے والے درخت کی آڑ میں بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں قبرستان کے داخلی راستے پر مرکوز تھیں۔ تقریباً سوا بارہ بجے اچانک ہی قبرستان میں دو کفن پوش نکلا انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہاشم خان کی قبر کی طرف بڑھ رہے تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ میں ہرج راج روشن تھی۔

اچانک ایک شخص نے رک کر جیب سے کوئی خنجر نکالی۔ پھر چند لمحوں بعد اس کی آواز قبرستان کی بھیانک سانسوں میں گونجنے لگی۔ غائبانہ موبائل فون پر کسی کو کال کر رہا تھا۔

”میں سر۔ یہاں ہمارے سوا کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ جی ہاں۔ چراغ جل رہا ہے۔ رات گری۔ آپ بے فکر رہیں، میں اور آصف دونوں نے اچھی طرح جنازہ لیا ہے۔ بہر حال میں حریص چیک کرتا ہوں اور پھر آپ کو کال کرتا ہوں۔“

دونوں کفن پوش خاموش ہو گیا۔ آصف یقیناً دوسرا

کفن پوش تھا۔ جس نے تاجر سنبھال رکھی تھی۔

”تم بہت جھوٹے ہو طارق۔“ تاجر برادری ہنسی ہوئی آواز ابھری۔ ”جنازہ لئے بغیر ہی رپورٹ دے دی۔“

”آصف۔ تم جانتے ہو کہ باس خود کتنا جھوٹا عیار ہے۔ بایاں دکھاتا ہے اور دایاں راتا ہے۔“ طارق ناکی کفن پوش بولا۔ ”ہمیں ایک قبرستان میں بھیجتا ہے لیکن خود دوسرے میں چلا جاتا ہے۔ پرسوں بھی اس نے مجھے اور اسلم کو شہر کے قبرستان میں بھیجا تھا لیکن خود نور پور کے قبرستان سے لاش لینے چلا گیا تھا۔“

”مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ اب بھی وہ ادھر آنے کی بجائے عید گاہ کے قبرستان میں جائے گا۔“ آصف نے کہا۔

”میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے بہر حال آؤ۔ کارروائی پوری کر لیں۔“ طارق نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ دونوں ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ ناصر اور نواز نے ان کی باتیں سنی تھیں اور فکر مند ہو گئے تھے طارق اور آصف پندرہ منٹ تک تاجر کی روشنی میں قبرستان کے مختلف حصوں کا جنازہ لینے کے بعد ہاشم خان کی قبر پر واپس آ گئے۔

نواز مرحوم ہاشم خان کی قبر کے سر ہانے کی جانب واقع جھاڑی میں چھپا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ آصف نے تاجر بجھا دی تھی۔ مگر چراغ کی روشنی میں نواز کو ان کی ٹپکلیں واضح دکھائی دے رہی تھیں طارق ناکی کفن پوش کے ہاتھ میں موبائل فون تھا جس پر وہ نمبر مارتا تھا۔

”طارق بول رہا ہوں باس۔“ چند لمحوں بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ”جی ہاں۔ ہم نے دوبارہ چیک کیا ہے۔ لیکن کوئی غیر معمولی چیز نہیں دکھائی دی۔ ادھر تو کیا ہم واپس آ جائیں؟ بہت بھتر۔ ٹھیک ہے سر۔ ہمیں ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔“ اس نے خاموش ہو کر موبائل آف کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ آصف نے تیزی سے پوچھا۔

”آج کا پروگرام کنسل کر دیا گیا ہے۔“ طارق

نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ عید کا وہاں قبرستان میں پولیس مگرانی کر رہی ہے اور وہاں خطرہ ہے جبکہ تمہارے اسٹیکر نواز سب اسٹیکر ناصر اور اے ایس آئی تاور عائب ہیں۔ ہاس کو اندیشہ ہے کہ وہ تینوں اس طرف موجود ہیں لیکن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں اس نے ہمیں داپس پہنچنے کا حکم دیا ہے۔“

”تو آؤ پھر لیں۔“ آصف نے کہا۔ ”ہاس کے اندازے غلط نہیں ہوا کرتے۔“

وہ دونوں قبرستان سے باہر کوچل دیئے۔ نواز سب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ وہ کوئی آہستہ پیدائش کے بغیر جھڑی سے نکلا اور ناکری سمت دیکھ کر مخصوص انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ناصر نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور ایکشن کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر جوں ہی آصف اور طارق اس سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچے۔ وہ اچانک درخت کی آڑ سے نکل کر ان دونوں کے سامنے آیا اور اس نے ان پر ریو اور تان لیا۔

اور ایک کمرے میں سلامت کے ہاتھ پشت پر بندھے پڑے تھے اور وہ کمرے کے فرش پر پڑا سوچ رہا تھا کہ اس قید خانے سے کیسے نکلے۔ قبرستان میں کسی نے اچانک اس کے سر پر ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر نہ جانے کئی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ اس کمرے میں بند تھا۔ کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی واحد دروازہ بند تھا بے ہوشی کے دوران اس کی جیبیں خالی کر دی گئی تھیں اور اس کی کلانی سے گھڑی بھی اتار لی گئی تھی۔ اس لئے وہ یہ اندازہ لگانے سے بھی محذور تھا کہ باہر وہاں ہے یا رات دو گھنٹے پہلے دروازہ کھول کر دو نقاب پوش ریو اور بردار اندر آئے تھے ایک نے اس کے ہاتھ کھولے تھے اور دوسرا اس پر ریو اور تان کر کھڑا رہا۔ پھر ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی اندر آئی اور کھانے کی ٹرے سلامت کے آگے رکھ کر چلی گئی تھی۔ نقاب پوشوں کے حکم پر اس نے کھانا کھایا اور وہ دونوں اسے دوبارہ باندھ کر کمرے سے باہر نکال گئے

تھے۔ سلامت نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ایک آدمی نے اسے اشارے سے بتایا تھا کہ وہ دونوں گونگے ہیں۔

سلامت سمجھ گیا کہ وہ دونوں اس سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ پھر نوجوان لڑکی اس کے لئے ایک کبل لائی تھی لیکن اس کے دوسرے ہاتھ میں ریو اور تھا۔ اس نے کبل سلامت پر ڈالا تو سلامت نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

”کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔“ سلامت نے کہا تو لڑکی نے سلامت کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”میرا نام کوئی نہیں ہے۔“ میں گونگی اور بہری ہوں۔ لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

اس کی ادھر سلامت نے ٹھنڈا سانس لیا اور وہ لڑکی کمرے سے نکل گئی۔ جاتے وقت اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا کبل سے سلامت نے اندازہ لگا لیا تھا کہ باہر رات کا وقت ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ناصر اور نواز اس کی آزادی کے لئے کوشش کر رہے ہیں یا نہیں؟ مجرم کیا چاہتے ہیں اور اسے کیوں تیار کر رہا ہے؟ یہی کچھ سوچتے ہوئے اسے نیند آگئی پھر اچانک کسی نے اس کے پیلو میں ٹھوک کر سید کی اور اس نے در سے بلبل کر آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو ایک نقاب پوش اور دی لڑکی کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریو اور تھے۔ ٹھوک بقیہ نقاب پوش نے ہی رسید کی تھی کیونکہ وہ سلامت کے قریب کھڑا تھا اور لڑکی دروازے کے پاس موجود تھی۔

”اشو حوالدار تمہاری آزادی کا وقت آگیا ہے۔“ نقاب پوش نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”جگانے کے لئے ٹھوک مارنا ضروری تو نہیں تھا۔“ سلامت نے فرش سے اٹھ کر اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”زیادہ بات کی تو دانت توڑ دوں گا۔“ نقاب پوش نے غراتے ہوئے کہا۔

”میرے ہاتھ کھول دو۔ پھر دیکھتا ہوں تم کسے دانت توڑتے ہو۔“ سلامت نے غصے سے کہا۔

”بکومت..... باہر چلو۔“ لڑکی نے سلامت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... کس کوئی..... میں نے تمہیں تو کچھ نہیں بولا۔“ سلامت نے حیرت سے کہا۔

”میرا نام کوئی نہیں ہے۔“ لڑکی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”تم نے خود تو بتایا تھا پچھلی ملاقات میں۔“ سلامت نے مسکرا کر کہا۔

”اس سے بات مت کرو۔“ نقاب پوش نے سلامت کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... کیا یہ تمہاری سسٹر ہے۔“ سلامت نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اس پر نقاب پوش نے فوراً ہی سلامت کی کمر میں لات رسید کر دی اور سلامت لڑکھا کر منہ کے بل لڑکی کے قدموں میں جا گرا۔

”کھڑے ہو جاؤ۔“ لڑکی نے جھک کر ریو اور سلامت کے سر سے لگاتے ہوئے ٹھکانہ لہجے میں کہا۔

وہ کمرے سے باہر آئے۔ باہر راداری تھی جس میں لڑکی کمرے تھے۔ چھت میں نصب بلب روشن تھا۔ لڑکی نے اس کے آگے چلتے ہوئے کہا۔ ”میرے پچھلے چلے آؤ۔“

”سلامت اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کے نقاب میں نقاب پوش چل رہا تھا۔ لڑکی دائیں ہاتھ کے تیرے کمرے میں داخل ہوئی تو سلامت بھی اندر داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں شاندار صوفی سیٹ، ٹی وی اور دوسرا فرنیچر موجود تھا۔ سامنے والے صوفے پر ایک اور نقاب پوش بیٹھا سلامت کو گھور رہا تھا اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا، بائیں دیوار کے پاس ایک لمبی آہنی میز تھی جس کے برابر میں ایک چھوٹی میز پر چند آلات جراحی پڑے تھے۔

”آئی دیر لگا دی اسے لانے میں۔“ صوفے پر بیٹھے شخص نے ریو اور بردار نقاب پوش سے سخت لہجے میں پوچھا۔

”ہاس..... یہ نمبر سیون سے مذاق کر رہا تھا۔“ لڑکی نے تیزی سے مودبانہ لہجے میں کہا۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ سلامت نے غصے سے کہا۔

اس نے مجھے بے بس دیکھ کر میری کم میں لات رسید کی تھی؟“

”اس نے تو صرف لات رسید کی تھی جبکہ میں تمہیں ذبح کرنے والا ہوں حوالدار سلامت علی۔“ نقاب پوش ہاس نے غراتے ہوئے کہا۔

”کک..... کیوں؟“ سلامت نے بوکھلا کر کہا۔ ”میں نے کیا جرم کیا ہے؟“

”جرم تمہارے افسردے کیا ہے۔“ ہاس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انہیں وارننگ دی تھی کہ اگر پولیس نے ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو سلامت کو کھل کر دیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اس وارننگ کی پروا نہیں کی۔“

”تو سرجی..... اس میں میری کیا خطا ہے۔“ سلامت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”آج ذرا انصاف سے کام لیں۔“

”کیا کتنا چاہتے ہو تم؟“ ہاس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”صرف یہ کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ کمرے داڑھی والا اور پکڑا جائے موچوں والا۔ یہ انصاف اور قانون کے خلاف ہے۔“ سلامت نے منہ بنا کر کہا۔

”بکومت.....“ ہاس نے اسے ڈانٹا۔ ”یہاں صرف میرا قانون چلتا ہے۔ وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔“

لڑکی سلامت کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ ہاس کی ڈانٹ سن کر سلامت خوف زدہ ہو گیا مگر خاموش رہا۔

”نمبر سیون۔ سلامت کے آپریشن کی تیاری کرو۔“ ہاس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے ہا۔ اسے ٹھیل پر لٹا دو۔“

اس کا حکم سن کر سلامت کا چہرہ خوف سے ایک دم زرد پڑ گیا اور موت کے خوف سے اس کے بدن میں

سنسٹاٹمنٹ پھیل چکی تھی، نمبر سیون نے ریوالور جیب میں رکھا اور لڑکی سے بولا۔ ”روٹی۔ نمبر تھری کو بلاؤ۔“

لڑکی جس کا نام روٹی تھا، پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ ہاس ٹلٹے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

ایک منٹ بعد روٹی وہیں آئی تو اس کے ساتھ ایک صحت مند اور میسر عمر شخص تھا۔ شاید اسی کا نام نمبر تھری تھا۔ لیکن سلامت اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کی شکل اسے کچھ جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ سلامت نے اپنے ذہن پر زور دیا اور اسے فوراً ہی یاد آ گیا۔ اس آدمی کا نام دلاور تھا اور گزشتہ سال اسے نشیات پیچنے کے جرم میں پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ مگر عدالت نے اسے صرف چھ ماہ کی سزا دی تھی۔

”نمبر تھری۔“ حوالدار سلامت کو آپریشن ٹیبل پر لٹانے میں میری مدد کرو۔“ نمبر سیون نے دلاور سے کہا۔

دلاور نے آگے بڑھ کر سلامت کو شانے سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے دیوار کے ساتھ موجود آپریشن ٹیبل کے پاس لے آیا۔

”چھوڑ دو مجھے۔ ورنہ تم پچھتاوے گے۔“ سلامت نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”لیکن دلاور نے سلامت کے منہ پر گھونسا رسید کر دیا اور غرایا۔ ”چلو۔ میز پر لیٹ جاؤ۔ ورنہ حلیہ بگاڑ دوں گا۔“

نمبر سیون بھی قریب آ گیا۔ پھر ان دونوں نے سلامت کو اٹھا کر میز پر لٹا دیا، نمبر سیون نے میز سے فسلک پڑی ٹیبلوں سے سلامت کے دونوں پاؤں کس دیئے جب دلاور نے سلامت کے پشت پر بندھے ہاتھ کھولے اور میز کے ساتھ باندھ دیئے۔ اب سلامت اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے سے محذور تھا۔ موت کے خوف سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ روٹی نے ایک الماری سے اسپرن نکالے اور ایک اسپرن نمبر سیون کے حوالے کر کے دوسرا خود اپنے جسم پر باندھ لیا۔ نمبر سیون نے بھی اسپرن باندھا۔

”ہاس۔ کیا اسے بے ہوش کر دوں؟“

نمبر سیون نے ہاس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

سلامت نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”تمہارا آپریشن۔“ نمبر سیون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا سینہ چاک کیا جائے گا اور پھر۔۔۔۔۔“

”نہیں۔“ سلامت نے دہشت سے چیخ کر کہا۔ ”ارے ظالمو! کم از کم مجھے بے ہوش تو کر دو تاکہ میں اپنی چیز چھانڈ دیکھ سکوں۔“

”بے فکر ہو۔“ ہاس نے میز کی طرف سے آتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تمہاری شرگ کاٹی جائے گی بعد میں سینہ چر جائے گا اور۔۔۔۔۔“

ٹھیک اسی لمحے فائر کے دھماکے سے کمرہ گونج اٹھا۔ ان لوگوں نے تیزی سے دروازے کی طرف دیکھا تو ایک آدمی ہاتھ میں ریوالور لئے وہاں کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاس بے اختیار اچھل پڑا۔ سلامت بھی خوش ہو گیا کیونکہ ریوالور برادر انسپکٹر نواز ش تھا۔ اس نے تجھمانے لہجے میں کہا۔

”خبردار کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔ پولیس نے پورے گرجا گھر کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

”تم کون ہو۔۔۔۔۔؟“ ہاس نے سخت لہجے میں کہا۔

”تم مجھے اچھی طرح پہچانتے ہو ڈاکٹر۔“ نواز ش نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے نمبر سیون نے تیزی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ریوالور نکالے۔ روشن دان کی طرف سے ایک فائر ہوا اور نمبر سیون نے چیخ کر اپنے شانے پر ہاتھ رکھ لیا جہاں سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ سلامت نے بے اختیار چہرہ گھما کر روشن دان کی طرف دیکھا تو وہاں سب انسپکٹر ناصر بیٹا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ریوالور باندھا ہوا تھا۔

روٹی کا خوبصورت سفید چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا تھا جبکہ دلاور نے ہاتھ بلند کر رکھے تھے۔ اسی لمحے اے ایس آئی نادر چند سپاہیوں کے ہمراہ تیزی سے

کمرے میں داخل ہوا۔

”سر۔۔۔۔۔ ان لوگوں کے علاوہ صرف دو افراد لے ہیں اس عمارت میں۔“ نادر نے نواز ش سے کہا۔ ”نہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

سپاہیوں نے ہاس اور اس کے ساتھیوں پر راتیلی تان لیں جبکہ نادر نے ریوالور سے دلاور کو کبڑ کر لیا تھا۔ نواز ش نے آگے بڑھ کر اپنے ریوالور کی آل ہاس کے سینے سے لگا دی جو آہستہ آہستہ ایک ہاتھ کوٹ کی جیب کی طرف بڑھا رہا تھا۔

”نہیں۔ اب تم کچھ نہیں کر سکتے ڈاکٹر۔“ نواز ش نے سخت لہجے میں کہا اور دوسرا ہاتھ ہاس کی جیب میں ڈال کر اس کا ریوالور نکال لیا۔ تب ہاس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

پولیس اسٹیشن میں چند صحافیوں کے علاوہ میڈیا کے ڈوکرانفرز بھی موجود تھے۔ وہ حوالات میں بند مجرموں کی تصویریں بنا رہے تھے۔ انسپکٹر نواز ش، سب انسپکٹر ناصر، اے ایس آئی نادر اور حوالدار سلامت علی بھی وہاں موجود تھے۔ انسپکٹر نواز ش صحافیوں کو کیس کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ اس نے آخر میں کہا۔

”بلوچ نگر کے قبرستان میں کفن پوش طارق اور آصف کی تشنگو سننے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان دونوں کو گرفتار کر کے ان کے ذریعے ان کے سرغنہ تک پہنچا جا سکتا ہے چنانچہ میں انہیں پکڑ لیا اور وہیں ان پر تشدد کر کے ان کی زبان کھلوائی۔ پھر ان کی تشاندی ہر فوراً وہیں شہر آیا اور گرجا گھر پر چھا۔ مارا اس وقت یہ سلامت کو بے ہوش کئے بغیر آپریشن ٹیبل پر باندھ کر اس کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے تیار تھے۔ اگر میں ایک منٹ بھی تاخیر سے اندر جاتا تو ڈاکٹر حوالدار سلامت کو زخم کر چکا ہوتا۔“

نواز ش خاموش ہوا تو صحافی حیرت سے ادھیڑ عمر ڈاکٹر کو دیکھنے لگے جو کہ سفید قام غیر ملکی تھا۔

”انسپکٹر صاحب۔ آپ کو کیا پہلے اس پر شک نہیں ہوا تھا؟“ ایک صحافی نے نواز ش سے سوال کیا۔

”نہیں۔ میرے فرشتوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر مجرم ہو سکتا ہے۔ آپ سب بھی ڈاکٹر رابرٹ کو فادر رابرٹ فورڈ کے نام سے پہچانتے ہیں یہ ایک سال پہلے گرجا کی ایک جگہ سے یہاں آیا تھا۔ یہ لڑکی روٹی اس کی داشتہ ہے لیکن بظاہر باپ بیٹی بنے ہوئے تھے۔ یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد ایک غیر ملکی گروہ نے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کر کے اسے بھاری معاوضے پر اپنے لئے کام کرنے پر آمادہ کیا۔“ نواز ش نے جواب میں کہا۔

”کون سا کام۔۔۔۔۔؟“ صحافی نے پوچھا۔

”یہی۔ تازہ لاشوں کو قبر سے نکالنا اور ان کے بدن کو چیر پھاڑ کر کے نازک اعضا نکالنا پھر ان اعضا کو بڑھیر اور جنٹیل پارسل کرنا۔ شروع میں ڈاکٹر نے اپنا ایک گروہ ترتیب دیا جس میں جرائم پیشہ افراد کو شامل کیا گیا۔ پہلے ڈاکٹر لاش کا پوسٹ مارٹم دیتے قبرستان میں ہی کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان وارداتوں کا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش قبر میں دوبارہ دفن کر دی جاتی تھی۔ لیکن ایک گاؤں میں ان لوگوں نے جلد بازی میں لاش قبرستان کے باہر ہی پھینک دی تھی اور صبح گاؤں والے لاش اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ نے اعتراف کیا ہے کہ گزشتہ چار ماہ میں یہ کم از کم تیس لاشوں کے اعضا نکال کر فروخت کر چکا ہے۔ اسے ایک لاش کے اعضا کا معاوضہ اچھا خاصا ڈالر کی شکل میں ملتا ہے اور یہ رقم لندن کے ایک بینک میں اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی جاتی ہے۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ چار پانچ لاکھ ڈالر جمع کر کے لندن میں بزنس کرے گا۔“ نواز ش نے تفصیل سے بتایا۔

”اب بے چارہ جیل میں ساری عمر بزنس کرتا رہے گا۔“ سلامت نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”اس کے جرم کی سزا پچاسی کا سخت ہے، اب یہ جہنم میں بزنس کر سکے گا۔“ نواز ش نے ہنس کر کہا تو تمام لوگ بے اختیار مسکرانے لگے۔



خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے ستلاشی لوگوں کے لئے اجنبی میں ذاتی حیرت انگیز اور حیران کن کہانی

دماغ پر شدید بحران وار ہو گیا۔ ہر شے سے وحشت چمکنے لگی۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور اضطراری طور پر کسی سنان گوشے کی تلاش میں چل پڑی۔ آس پاس ابھی تک کسی درندے کی موجودگی کے نشان نہیں ملے تھے اس لئے مارشل کے مسافر کی خوف کے بغیر دور تک نکل جاتے تھے۔ اس وقت بھی دور دور تک لوگ بکھرے نظر آ رہے تھے میں کسی سنان اور پرسکون گوشے کی تلاش میں تھی چنانچہ کافی دور نکل آئی۔ ہر طرف مجبوروں کے درخت بکھرے ہوئے تھے اس کے علاوہ سرسبز چٹانیں نظر آ رہی تھیں میں بے خیالی میں بہت دور نکل آئی۔ ماحول تاریک ہوتا جا رہا تھا ایک چٹان کے دوسری طرف پیچھی تو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ کوئی عورت ہے ایک لمحے کے لئے دل خوف سے دھڑک اٹھا۔ بہت سے دوسرے دل میں جاگے بھوت، پریت، چڑیل، کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

ایک لمحے کے لئے سوچا کہ واپس دوڑ جاؤں۔ لیکن پھر ایک اور خیال آیا ممکن ہے کوئی تسم رسیدہ عورت ہو جہاز پر ایسے بہت سے مرد عورتیں تھیں جن کے پیارے طوفان کی نذر ہو گئے تھے اور وہ تہارہ گئے تھے ایسے لوگ اکثر روتے نظر آتے تھے۔ ممکن ہے وہ بھی

کوئی ایسی ہی عورت ہو، جو میری طرح تنہائی کی تلاش میں اس طرف آ گئی ہو چنانچہ میں چند قدم آگے بڑھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر عورت نے گردن ہٹھا کر میری طرف دیکھا اور میری جان بگل گئی۔ برف جیسا سفید چہرہ، چمکدار آگ برساتی آنکھیں، شناسا نقوش، یہ وہی عورت تھی جو مجھے پراسرار طور پر اس مکان میں لٹی تھی اور اس نے مجھ سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ میرے قدم جیسے جم کر رہ گئے۔ میں واپس پلٹ کر بھاگنے کی کوشش بھی کرنی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میرے اعصاب خوف سے شل ہو گئے تھے حالانکہ ماحول تاریک ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے کے نقوش میں ایک انوکھی چمک تھی۔ اچانک اس کے نقوش تبدیل ہونے لگے اور اس کے چہرے پر نفرت ابھر آئی۔ اسکے سفید دانت چمکے اور وہ ہونٹ سکڑ کر چٹان کے دوسری طرف کود گئی۔ چٹان خالی ہو گئی۔

میں کہتے کے عالم میں کھڑی تھی اچانک مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی تو میں نے سہم کر گردن ہٹائی میں نے ایک اور حیران کن منظر دیکھا وہ روشنائی تھا جس نے ایک عجیب و غریب حلیہ بنا رکھا تھا وہ قدم دور کے راہبوں اور کاہنوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھا۔

ہاتھ میں ایک اڑو سے کی شکل کا عصا تھا۔ اور سر پر ایک لکڑی کی رنگین ٹوپی جس میں چمکدار پتھر لگے ہوئے تھے۔
تب ہی اس کی جستجائی آواز سنائی دی۔
”سمونا دوختہ وارو سانا عائبہ، تقدیس ہو تیری۔
تقدیس ہو تیری۔ اشواتیہ اشونی کی سب سے مقدس روح، تقدیس ہو تیری۔ تقدیس ہو تیری، تقدیس ہو تیری اور کورے کے انداز میں جھک گیا۔
مجھے نہ جانے کیا سوچی، میں اسے نظر انداز کر کے اس چٹان کی طرف دوڑی جس پر مجھے وہ مخصوص عورت نظر آئی تھی اب تک میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ عورت روشاق ہی کا دوسرا روپ تھا۔ لیکن اس وقت وہ دونوں ہی نظر آ گئے تھے اور میرے تجسس نے ہی میرے اعصاب و رست کرو پینے تھے میں چٹان کے دوسری طرف پہنچ گئی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ میں وہیں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
ایک بار پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی، آنے والا روشاق ہی تھا وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔
”مشکل ہے!“ اس نے پراسرار انداز میں کہا۔
اور میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ بھر بولا۔ ”وہ جا چکی ہے۔“
”کون ہے وہ؟“ میں نے سوال کیا۔
”اس“ وہ جیسے چوک کر بولا۔ لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا یہ چونکا مصنوعی ہے میں نے اسے محسوس کر لیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے کہا۔
”ایک سوال کروں مسٹر روشاق۔“
”جی عزائمیت۔“
”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“
”معصوم سوال ہے کیا جواب دوں۔“
”آپ میرا پچھا کر رہے ہیں۔“
”ہاں۔“ وہ سکون سے بولا۔
”آخر کیوں؟“
”اس سوال کا جواب پہلے بھی دے

چکا ہوں، دوبارہ سن لوئے“ میں اکثر تمہارا تقاب کرتا ہوں۔ خصوصاً ان اوقات میں جب تم تنہا ہوتی ہو اور دوسروں سے الگ تھلک، اس اوقات میں تم سے دور نہیں ہوتا۔
”آخر کیوں؟“
”اس خیال سے کہ شاید تنہائی میں ہارون دانش تمہارے پاس آنے کی کوشش کرے اور میں ایک بار صرف اسے بتا سکوں کہ میں اس کا دشمن نہیں، دوست ہوں۔“
”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ میرے آس پاس ہوتے ہیں۔“
”تمہیں یقین نہیں ہے؟“
”مجھے۔۔۔۔۔ میں چوک کر بولی۔
”ہاں بے بی، تم نے مجھ سے جو فاصلے اختیار کر رکھے ہیں ان میں تمہارا تصور نہیں ہے۔ ہارون دانش نے جو راستے اختیار کئے ہیں وہ غیر دانش مندانہ ہیں۔ اور دقت بتائے گا کہ ان فیصلوں نے اسے کیا نقصان پہنچایا۔ اور تم، تم بھی بہت سی حقیقتوں سے آگاہ ہو لیکن ہارون کی طرح تم بھی مجھ سے تعاون نہیں کر رہی۔“
”میں کوئی حقیقتوں سے آگاہ ہوں۔“
”کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ ایردوئس کی تحویل میں موجود تانویوں میں ہارون دانش اور تمہاری ماں کے تصوراتی اجسام موجود ہیں۔“
”میری ماں۔“ میرے منہ سے جیسے حسرت بھری سسکی نکل گئی۔
”میں نے تصوراتی کا لفظ استعمال کیا ہے۔“
”وضاحت بھی کرو۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔
”ممکن نہیں ہے بی بی۔ یہ کہانی تاریخ میں کم ہوگئی ہے۔ ہم سب ہی تاریخ کی کھوج میں ہیں۔“ روشاق کی پراسرار آواز ابھری۔
”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”تمہیں معلوم ہے۔“ وہ بولا۔
”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ میں نے چیخ کر کہا۔
”جھوٹ بول رہی ہو تم۔ میں نے تہہ خانے میں تمہارے الفاظ سنے تھے تم اپنے باپ کو مخاطب کر رہی تھیں۔ وہ بھی کرخت لہجے میں بولا۔ اور میں گہری گہری سانس لینے لگی۔ میں نے ذہن کو سنبھالا اور کہا۔
”مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا۔ ایردوئس کی زندگی میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا وکیل ڈیزل سے کوئی تعلق ہے۔“
”وکیل ڈیزل۔“ روشاق کی آواز میں بھڑبھڑانے والی غراہٹ پیدا ہو گئی۔ ”اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو۔۔۔ تو اس بات کے امکانات ہیں کہ وکیل ڈیزل۔۔۔ روشاق نے جملہ امور چھوڑ دیا اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔
اس دقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ممکن ہے وکیل ڈیزل کو ہارون دانش نے کوئی ہدایت کی اور مجھے اس کے پاس بھیج دیا۔ لیکن اب۔۔۔۔۔ وہ بے بس ہو چکا ہے اور اس کا اظہار بھی کر چکا ہے۔ سرسوفیہ بھی بری طرح بدول ہو کر مجھے چھوڑ چکی ہے اور عسکری نے بھی منہ موڑ لیا ہے۔ ہارون دانش کی طرف سے بھی مجھے کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ بالکل نہیں اور بے بارود دگر ہوں حالات ہولناک اور غیر یقینی ہیں ایسی مشکل میں اگر روشاق سے تعاون کر لوں تو برا تو نہیں ہوگا۔ کون ہے میرا، نہ ماں باپ کا پتہ نہ کسی اور کا۔ اسی دقت روشاق کی آواز ابھری۔
”اب مجھے ایک اور شبہ ہو رہا ہے۔“
”کیا مسٹر روشاق؟“ میں نے کہا اور وہ چوک کر مجھے دیکھنے لگا جیسے میری موجودگی بھول گیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔
”وکیل ڈیزل کوئی ہی کھیل کھیل رہا ہے۔“
”سب کے اپنے اپنے کھیل ہیں مسٹر روشاق۔ ہر ایک کی صورت بدلی ہوئی ہے، سب فریقا، جھوٹ، اپنے مقصد کے لئے سرگرداں، کتنے

کر دار میرے گرد کھڑے ہوئے ہیں احمد جیدی، عدنان شانی، وکیل ڈیزل اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“
”تم گمشدہ وجود ہو بے بی، تمہیں نئی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔
جن باتوں کو تم سچ کا نام دیتی ہو وہ صرف کہانیاں ہیں، زندگی صرف ایک حسین مجبوری ہے ہر انسان اس مجبوری کو پرورش کرنے کے عین کرتا ہے تم بھی یہی کرو، اپنے بارے میں سوچو صرف اپنے بارے میں جہاں سچ بولنا پڑے وہاں سچ بولو، جہاں جھوٹ ضروری ہے اس سے روکنے نہ کرو۔ اسی طرح یہ مجبوری ٹاپی جاسکتی ہے ورنہ مشکلوں کے سوا کچھ حاصل نہیں۔“
”میں جس مشکل کا فکار ہوں مسٹر روشاق، اس کا کوئی حل ہے۔“ میں نے سوال کیا۔
”ان مشکلات کا آغاز کہاں سے ہوا؟“ وہ بولا۔
”اس وقت سے جب آپ لوگ یعنی امیر احسانات، مانیکل جون اور آپ ہارون دانش کے پاس آئے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔
”اس سے پہلے۔“
”میری زندگی پر سکون تھی۔ ہارون دانش ایک شفیق باپ تھے مائے کے بارے میں مجھے صرف اتنا علم تھا کہ وہ یہ دنیا چھوڑ چکی ہیں۔“
”تمہاری مصروفیات کیا تھیں۔“
”ہارون دانش کے ساتھ پر عیش زندگی گزار رہی تھی۔ پھر آپ لوگ آئے تو اس کا پرود گرام بنا کارچوک کی پہاڑیوں میں ایک تہذیب کی تلاش کا منصوبہ طے ہوا۔ اور وہیں سے ہماری بلکہ میری بد نصیبی کا آغاز ہوا۔“
”کارچوک تک کا سفر کرتے ہوئے تمہیں کسی عجیب بات کا احساس نہیں ہوا۔“
”کیسی عجیب بات۔“
”جیسے تم کسی ایسی جگہ جا رہی ہو جہاں سے تمہارے ماضی کا کوئی واسطہ ہے۔“

”میرا ماضی۔“ میرے دلی کو دکھا ساگا۔

”میرا مطلب ہے کوئی ایسا احساس جو اجنبی اجنبی سا ہو، لیکن خود سے منسلک لگے۔ میں سوچ میں ڈوب گئی روشتاں کے ساتھ اب اپنا رویہ بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ اب مناسب بھی لگ رہا تھا کیونکہ یہ شخص سب سے کارزار تھا، کسی اور سے تو اب کوئی امید ہی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”نہیں مسٹر روشتاں، اس وقت تک کوئی احساس نہیں تھا لیکن وہاں جو کچھ ہوا اس نے میرے دماغ کی چولیس ہلا دی۔“

”مثلاً؟“ اس نے سوال کیا اور میرے ذہن میں کابلہٹ ہونے لگی۔ وہ باتیں میرے ذہن پر ٹوک مارنے لگیں۔ سب کچھ یاد آنے لگا اور میں کھوٹی کھوٹی آواز میں بولی۔

کارچوک کے غار، وہاں ملنے والا تابوت، اس میں میری لاش، وہ کون بھی مسٹر روشتاں، وہ میں تو نہیں تھی۔ وہ تو نرسلہ بھی میرا اس سے کیا تعلق تھا اور مندر کی وہ پجاریں اس کے لئے ہونے والی جنگ وہ تو ایک طلسم تھا۔

”وہ طلسم نہیں تھا بے بی، وہ تاریخ کی سب سے بڑی سچائی تھی۔“ روشتاں نے کہا اور میں جیسے خواب سے چونک پڑی۔

”وہ طلسم نہیں تھا۔“ میں نے کہا اور روشتاں چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مسٹر ہارون نے بعد میں تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ وہ تابوت آپ لے گئے تھے، وہ لاش آپ نے چرائی تھی؟“

”تم سب کا یہی خیال ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں تھا، وہاں کچھ اور ہی ہوا تھا۔“ وہ پر خیال لہجے میں بولا۔

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے کہا اور وہ چونک پڑا۔

پھر بولا۔

”یہ وقت کی امانت ہے جس میں خیانت ممکن نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”یہ رویہ ہے حسب کابات کافی حد تک مجھ سے متعلق ہے لیکن میں ہی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہارون دانش نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور روپوش ہو گئے۔“

”ایک سوال کروں؟“ روشتاں بولا۔

”ہوں۔“

”تم ہارون دانش کا نام اجنبیوں کی طرح لیتی ہو، انہیں ڈیڑی، یا یا پانچ نہیں کہتیں۔“

”ہاں۔ اب سب کچھ اجنبی ہو گیا ہے۔ ماں بھی نامعلوم ہے اور باپ بھی۔“ میری آواز سسکی میں بدل گئی۔

”کافی حد تک ٹھیک کہتی ہو۔ ویسے اگر دل قبول کرے تو یقین کر لو، جو کھیل اس جہاز پر ہوا ہے یا اس جزیرے پر جاری ہے وہ بس ایک وفد ہے حالانکہ یہ سب کچھ تمہاری کوئی تمہارے شہر میں بھی ہو سکتا تھا۔ اس جہاز پر، یا اس جزیرے پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ تم ان سب سے الگ ہو۔ تمہارا اپنا مقام ہے جسے کوئی زوال نہیں ہے۔ سارے زوال تم پر سے گزر چکے ہیں، تم تاریخ ہو، ایک ٹھوس اور مستحکم تاریخ جو اپنا سفر گزار چکی ہے۔ اور وقت کی کتاب میں درج ہے تمہیں بدلنا نہیں جاسکتا۔“

”تاریخ؟“ میں نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں، جو کچھ نہیں بدلتی۔“

”کیسے مسٹر روشتاں؟“

”کاش ایسے تفصیل تمہیں ہارون دانش بتاتا۔“

”آپ نہیں بتا سکتے؟“

”نہیں۔ لیکن تمہیں کچھ اعتراضات کرنے ہوں گے۔“

”کیا۔۔۔؟“

”جہیں ہارون دانش کے وجود پر یقین ہے۔“

”پاپا۔“ میرے حلق سے سسکی نکل گئی۔ میں نے ٹھیکیر لہجے میں کہا۔ ہاں مجھے یقین ہے۔ ان کی لائبریری میں مجھے ان کے سگار کی خوشبو سی می میں نے ان کے قدموں کی چاپ، ان کے وجود کی خوشبو محسوس کی ہے۔ اور اب میں ان کے کس کو ترستی ہوں، ابھی میں ان سے انحراف کرتی ہوں، اے کے ہدائی نے ایک عمارت تک میری رہنمائی کی تھی اور میں نے۔۔۔۔۔؟“

”عمارت؟ اچانک روشتاں چونک پڑا۔

”ہاں۔ میں نے اسے عمارت میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتا دیا۔“ اور وہ ہاتھ ملنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

”اوہ۔ اوہ، کاش مجھے یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی۔ وہ بے وقوف بلاوجہ میرے ہاتھوں زندگی سے محروم ہو گیا۔“

”کون۔۔۔؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ابروفوس۔“ روشتاں نے ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ اور میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کچھ پانی آواز میں کہا۔

”اسے تم نے قتل کیا تھا۔“

”مجھ پر ہی بے بی، وہ میرے راستے روک رہا تھا اور اس نے مجھے ایک نقصان سے دوچار کیا تھا۔ خیر اس کا تذکرہ چھوڑو۔ مجھے بتاؤ۔ اس کے بعد تم نے کچھ ہارون دانش کو اپنے نزدیک پایا۔“

”نہیں؟“

”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“

”لیکن روشتاں؟ تم قائل ہو۔ تم نے اتنی آسانی سے ایک زندگی لے لی۔ اور۔ اور اے کے ہدائی کے بارے میں تم کہتے ہو کہ اسے احمد جیندی نے زخمی کیا تھا۔“

”میں اپنے اور تمہارے درمیان سچ کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، بے بی کوئی جھوٹ ہاتھ آجائے تو تمہاری سوچیں آزاد ہوں گی۔ ابھی میرے

خلوص کو زخمی کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

”مشکل تو یہ ہے مسٹر روشتاں کہ ہر شخص نے مجھے تاریکی میں رکھا ہے کوئی مجھے یہ نہیں بتاتا کہ میری ابتدا کیا گئی۔ میری ابتدا کیا ہے۔ کوئی ایسا ہے جو مجھے انسان سمجھے مجھے میرے تاریک ماضی سے روشناس کرائے۔“

”میں ہوں۔ صرف میں ہوں، میرے سوا اور کوئی نہیں بتا سکتا۔“

”اگر تم مجھے یہ بتا دو روشتاں، تو تم سے اچھا دوست میرے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”ضرورتاً توں گا بے بی، جتنا مجھے معلوم ہے ضرورتاً توں گا۔ لیکن ایک مشکل ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

”جو لوگ تمہارے ہمدرد بن گئے ہیں وہ میرے دشمن ہیں، جب تک وہ تم سے منسلک ہیں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”میں ان سے قطع تعلق کر لوں گی۔“

”لیکن وہ تم سے قطع تعلق نہیں کریں گے۔“

”میں انہیں منہ نہیں لگاؤں گی۔“

”نہیں بے بی، وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے، کبھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”مجھے بتاؤ۔ وہ مجھے کیسے مجبور کر سکتے ہیں؟“

”جیندی نے تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ دسکن ڈیزل کو یہ خدشہ ہوا ہے کہ تم اس سے دور ہو رہی ہو تو وہ بھی کچھ نہ کچھ کرے گا۔“

”تو آخر، میں کیا کروں؟“

”کچھ کر سکو گی؟“

”ہاں، سب کچھ، جو تم کہو گے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ روشتاں ٹھیکھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

”تب تمہیں میں افراد کو قتل کرنا ہوگا، احمد جیندی، عدنان شاکی اور دسکن ڈیزل! تمہیں ان تینوں کو زہر دے کر ہلاک کرنا ہوگا۔“

میرے ملحق سے خوف کی آواز نکل گئی۔ مشکل تمام میرے ملحق سے نکلا۔ "زہر۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ وہ زہر، جس نے ابروؤں کو ہلاک کیا تھا۔"

"نہیں نہیں۔ یہ میں کیسے کر سکتی ہوں، میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔" میں وحشت زدہ لہجے میں بولی۔

"میں جانتا ہوں اسی لئے کہتا ہوں کہ وقت کا انتظار زیادہ بہتر ہے، جب تمہیں دوسروں کے تسلط سے آزاد پاؤں گا تو بہت کچھ بتا دوں گا، ان حالات میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر جلدی آزاد ہو اور جہاز کا سربراہ ایک غر انسان ہے۔ وہ اپنے خطرناک دشمنوں کو بھی عامی نگاہوں سے دیکھتا ہے، جہاز پر اس نے اگر جلدی کو جو سزا دی تھی اگر سفر جاری رہتا تو اگر جلدی وہی کام کرتا رہتا جو اسے سونپا گیا تھا۔ اب وہ اس جزیرے پر دوسروں کی طرح آزاد ہے اور ممکن ہے کہ اس طرح تمہارے آس پاس بھی موجود ہو اور ہماری باتیں سن رہا ہو۔"

میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اوپر ادھر دیکھا تو روشنائی آہستہ سے فہم دیا پھر بولا۔

"اسے اہمیت نہ دو، نہ تمہیں اس سے کوئی خطرہ ہے اور نہ مجھے۔"

"اوہ! مسز روشنائی! کاش آپ میری مشکل حل کر سکتے؟"

"یقین کرو بے بی، تمہاری مشکل کا حل نہ میرے پاس ہے نہ اگر جلدی، عدنان شانی اور وکسن ڈیزل کے پاس صرف وقت تمہارا رہتا ہے، وہی تمام فیصلے کرے گا۔"

"لیکن آپ مجھے کچھ تو بتا سکتے ہیں کہ جس طرح میرے باپ کا ایک ٹوٹا پھوٹا وجود ہے اسی طرح کیا میری ماں بھی موجود ہے؟"

"ہاں وہ ہے۔"

"زندہ ہے؟" میں نے بے قراری سے سوال کیا۔ روشنائی تجویزی وریک سوچتا رہا پھر بولا۔

"میری سمجھ لو۔"

"کیا وہ نراناٹل ہے یا کوئی اور ایسا نام جو تاریخ میں چھپا ہوا ہو، نراناٹل اس لڑکی کو کہا گیا جو کارچوک کی پہاڑیوں میں بنے ہوئے غاروں میں ایک تابوت میں موجود تھی اور سو فیصدی میری ہمشکل تھی، یہی سوچا جاسکتا ہے کہ وہ اگر میں نہیں تھی تو شاید میری ماں تھی۔"

ایک بار پھر روشنائی گہری سوچوں میں ڈوب گیا پھر بولا۔ "نہیں وہ نراناٹل نہیں تھی اور نہ ہی وہ تمہاری ماں ہے۔"

"تو پھر وہ کون تھی؟"

"تاریخ کا ایک اٹو کھا باب، شاید آشوانی مندر کی سب سے بڑی پجاریں جو بہت بڑا درجہ رکھتی تھی۔"

"لیکن۔۔۔۔۔؟"

"ہاں جس طرح وہ روپ دھار سکتی ہے، جیسے اس گھر میں جہاں تم نے اسے دیکھا تھا، میرا مطلب ہے وہ جسے ابھی ابھی تم نے ایک الگ حیثیت سے دیکھا۔"

"میرے خدا، میرے خدا! تو کیا وہ؟"

"ہاں میں نے کہا ناں کہ وہ بے شمار روپ دھار سکتی ہے، لیکن بے بی پھر راز اس میں گہرے ہیں اور مستقبل کی گرد میں دھندلائے ہوئے ہیں اس لئے میں بھی ان کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"ایک بات بتائیے مسز روشنائی، جیسا کہ میں نے آپ کو تفصیل بتائی کہ وہاں ایک شخص ہارون دانش کے سامنے میں ملا۔ کپڑے کی بنیوں کا ایک ڈھیر کیا وہ بے جسم ہو چکا ہے، یعنی مسٹر ہارون دانش جو میرے نام نہاد باپ ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ بے حس ہو چکے ہیں تو کیا دوبارہ بھی انہیں ان کا جسم واپس نہیں ملے گا۔"

"میں نے کہا ناں بہت سے راز ایسے ہیں جن سے میں بھی ناواقف ہوں۔"

"آپ ایک بات بتائیے مجھے مسز روشنائی، آپ جسے میرا تعاون کہتے ہیں اس کے

لئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"مگر غلطی دل سے یہ وعدہ کرو تو میں تمہارے لئے صرف ایک بات کہوں گا جو تمہارے لئے مشکل نہ ہوگی، میں تمہیں بتاؤں ہارون دانش تم سے زیادہ درنہیں ہے، جس طرح تم نے نراناٹل کو دیکھا وہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انہوں نے اپنے تابوت چھوڑ دیئے ہیں، لیکن اسی جہاز میں سفر کیا ہے انہوں نے، اگر کسی وقت ہارون دانش تم سے مخاطب ہو تو اس سے کہنا کہ اس نے کمزور سہارے تلاش کئے ہیں، اس سے کہنا کہ احمق مورخ، ایٹلا ستارہ نیچے اتر چکا ہے، اس سے کہنا کہ تو نے اپنے گناہ کا پھل پالیا، لیکن اب بھی باز نہیں آیا اس سے کہنا کہ مزید حقائق سن کرے، جو بن چکا ہے اور جو حقیقت میں چلا گیا ہے اسے نہیں بھلایا جاسکتا اس سے کہنا کہ راقوس سے بہتر رہو اور کوئی نہ ہوگا۔ اس کا جھول جا ہے کرے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا، کبھی تاریخ سے کبھی کوئی جنگ ہو چکی ہے۔ اس سے کہنا کہ راقوس سے ملے وہی اس کی رہنمائی کرے گا۔ تاریخ گزرے ہوئے دور کا نام ہے اور جو دور گزر جاتا ہے وہ گزر رہی جاتا ہے، اسے واپس نہیں لایا جاسکتا۔"

"راقوس کون ہے؟" میں نے سوال کیا اور روشنائی کوئی جواب دیئے بغیر واپس کے لئے مڑ گیا، میں اسے آوازیں دیتی رہی مگر وہ نہیں رکا، کچھ دیر کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا مات خوب گہری ہو گئی تھی اس لئے مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا اور میں تیز قدموں سے واپس چل پڑی۔ کھلے آسمان کے نیچے بھرا کرنے کے لئے کوئی جگہ مخصوص نہیں تھی جہاں جا ہو پڑو، مجھے سب سے زیادہ دکھ صوفی کے رہنے کا تھا اور اس سے میں بہت دلبرداشتہ ہو گئی تھی۔ رات میں اسے تلاش نہیں کر سکی اور ایک بجے کمرہ در زمین پر لٹ گئی۔

دوسری صبح کوئی خاص نہیں تھی، ہاں گیارہ بجے سکے قریب میں نے مسز صوفی کو دیکھا جو ایک ڈاکٹر کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ جب ہم مارشل کے اسپتال میں کام کر رہے تھے تو ڈاکٹر عارف سے

ہماری ملاقات ہوئی تھی تقریباً پچیس سال کے پروکار لو جو ان تھے اور ہم سے نہایت نری اور محبت سے پیش آئے تھے۔ لیکن اس وقت ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے مسز صوفی خوش ہوں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کافی سکون محسوس کر رہی ہے۔ میرے قدم نہر کے اوپر اس آگے بڑھ کر ان کے قریب پہنچ گئی، ایک لمحے میں میں نے محسوس کر لیا کہ سسر کے چہرے کے تاثرات خوشگوار نہیں ہیں، انہوں نے مجھے ہزاری سے دیکھا۔

"ہیلو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہیلو کس کیسی ہیں آپ، آپ تو بس صوفی کی دوست ہیں۔" ڈاکٹر عارف نے کہا۔

"آپ دوست نہ کہیں، صرف شناسا۔" صوفی نے بے زنجی سے کہا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"شناسائی تو دوستی کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے، اسپتال میں آپ دونوں کو یکجا دیکھا تھا۔"

"جی جی بالکل، آئیے بیٹھے۔" ڈاکٹر عارف نے کہا۔

"شکریہ ڈاکٹر ادھر سے گزر رہی تھی رک گئی، مداخلت کے لئے معذرت۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گئی، صوفی بری طرح ہلکی تھی، جو کچھ بھی تھا میں اسے برا نہیں کہہ سکتی تھی۔ کہاں تک میرے ساتھ لگی رہتی بے چاری حالات کا شکار ہو کر بھجھلا گئی تھی۔

بہر حال اچھا ہے اگر اس کی کچھ دل بستگی ہو جائے، وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا، اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی مگر کب تک، گارساں اور اس کے ساتھی چند دوسرے افراد کے ساتھ زیادہ تر مارشل پر رہتے تھے، انہوں نے مخصوص علاقے کو منومہ علاقہ بنادیا تھا، خوراک پر بدستور پابندی تھی، ہاں جنگل میں جو کچھ مل سکتا تھا کھایا جاسکتا تھا، چائے اور دوسری چیزیں پر زبردست کنٹرول تھا اب لوگوں میں کچھ بے چینی سی پیدا ہونے لگی تھی، پھر اس سلسلے میں ایک اجتماع

ہوا، میں بھی وہیں موجود تھی، مسافروں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص جس کا تعلق شاید برطانیہ سے تھا اس اجتماع کی صدارت کر رہا تھا اس نے کہا۔

”آپ لوگوں سے میں مسٹر گارساں کے رویے کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، بے شک مسٹر گارساں جہاز کے کپتان ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہماری زندگیوں کے محافظ بھی بنے، لیکن یہاں آنے کے بعد دو تشریف ناک صورتیں سامنے آئی ہیں، نمبر ایک یہ کہ ان کا رویہ ایک حکمران جیسا ہے، دوئم یہ کہ وہ یہاں بے رودی کی کوئی بات نہیں کرتے، یوں لگتا ہے جیسے وہ یہاں آکر مطمئن ہو گئے ہوں، لیکن کیا ہم لوگوں کو بقیہ زندگی یہی گزارنی ہوگی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ چند لوگوں نے بے چینی سے کہا۔

”تو مجھ اب کیا کریں، کیا ہونا چاہئے۔؟“

”مسٹر گارساں سے سوال کیا جائے کہ اب یہاں سے آگے کا سفر کیسے شروع ہوگا وہ کب تک جزیرے کو چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور آگے کے لئے ان کا کیا منصوبہ ہے؟“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں، بے شک گارساں ہمارا احسن ہے، لیکن اب آگے کے بارے میں اس کا ارادہ بھی تو پتہ چلے۔ خیر میں آپ لوگوں کے تعاون سے مسٹر گارساں سے اس سوال کے لئے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“

سب نے آمادگی کا اظہار کیا، ان سب کے تعاون کے ساتھ مسٹر جین گارساں سے ملے اور گارساں نے نہایت نرم روی سے ان کی باتیں سنیں، پھر کہا کہ کل ان باتوں کا جواب دیا جائے گا، اس نے جواب کے لئے کہہ بھی منتخب کر دی۔ سلاطین چٹانوں کے درمیان وسیع میدان میں اس نے جہاز کے ہر ایک ایک مسافر کو طلب کر لیا تھا اور پھر مقررہ وقت پر وہ ایک میگ فون پر آواز دے کر خود بھی ایک چٹان پر جا کھڑا ہوا، وہ بہت

خوش نظر آ رہا تھا اس نے کہا۔

”معزز دوستوں کو میں خود بھی مخاطب کرنا چاہتا تھا، تاکہ اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں تفصیل بتا دوں۔ آج وہ وقت آ گیا ہے جب میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی، میں آپ لوگوں کا تعلق مختلف ممالک سے ہے۔ لیکن جو دوسرے ممالک سے اور خصوصاً ایتھین سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے ایتھین کے عظیم خاندان گارساں کے بارے میں سنا ہوگا۔ میرا دادا ایمن مارگٹ ایتھین کا بادشاہ رہ چکا ہے، مگر میرے باپ جوزان ایمن کو بادشاہت نہیں ملی اور وہاں سے اس خاندان کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ ایتھین میں جب میرے باپ کو سزائے موت دی گئی تو میں جنوبی امریکہ میں زیر تعلیم تھا، باپ کے قاتلوں کے خلاف میرے دل میں نفرت بیدار ہو گئی اور میں خفیہ طور سے ایتھین واپس آ گیا، میں نے اپنے باپ کے قاتلوں کے خاندان تباہ کر دیے اور پھر جرم میری زندگی بن گیا، اس کے بعد میں نے نجات کیا کیا کچھ کیا، وہ ایک لمبی کہانی ہے، لیکن میرے اندر بادشاہت کے جراثیم ہیں، میرے دل میں بادشاہت کے خواب چمکیاں لیتے رہتے تھے، میں فطرتاً ہی بادشاہ ہی ہوں اور میں نے بادشاہ بننے کی آرزو کو ہمیشہ دل میں زندہ رکھا اور سنبھالنے کیون مجھے یقین تھا کہ ایک دن میرا یہ خواب پورا ہوگا، میں نے لاتعداد بحری جہاز لوٹے اور خزانہ جمع کیا، لیکن میری آرزو پوری نہ ہوئی اور میں گرفتار ہو گیا۔ گارساں کا خواب ادھورا رہ گیا، لیکن تقدیر اس کے بعد بھی مجھے میرے خوابوں کی تعبیر دینا چاہتی ہے، ایک دلچسپ حادثے نے میری آرزو پوری کر دی، مارشل سمندری طوفان کی نذر ہوا، بعد کے حالات کا تذکرہ فضول ہے کیونکہ آپ سب انہیں جانتے ہیں، ہم اس جزیرے تک آ گئے۔ یہ جزیرہ جہاں تک میں نے دیکھا ہے سرسبز و شاداب ہے، یہاں کی زمین زرخیز ہے اور صدیوں انسانی زندگی کی کفالت کر سکتی ہے، یہاں کے نوآباد ایک حسین زندگی

عمر کر سکتے ہیں، اس دوران میں مکمل جائزہ لیتا رہا ہوں میرے دوستو، مارشل ایک مکمل جہاز ہے لیکن ہم عام سمندری راستوں سے اتنے دور ہٹ گئے ہیں کہ اب انہیں پانا ممکن نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو میں اس طرح جانا پسند نہ کرتا، پیارے دوستو! میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے اور یہاں آنے کے بعد اس پر کام کرنا رہا ہوں، میری ضروری کارروائیاں مکمل ہو گئی ہیں اور اب آج جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ مستقبل میں میرا کیا ارادہ ہے تو اس وقت میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے پروگرام کا اعلان کر دوں، دوستو! گارساں کا دادا ایتھین کا بادشاہ تھا، اٹلیس بادشاہت کا مزاج نہیں بھولتیں، بے شک میں بحری فزاقوں رہا ایک دہشت گرد قاتل رہا لیکن میرے ذہن میں بھی ایک بادشاہ پروان چڑھ رہا تھا، ایک مطلق الشان حکمران مجھ میں جی رہا تھا۔ جسے کسی بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا تھا۔ اظہار یہ منصوبہ مکمل ہی لگتا تھا، لیکن ہر مکمل کی تکمیل کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتی ہے، اب یہ جزیرہ میں نے اپنی مملکت قرار دیا ہے اور آپ لوگ میری فکر و کے معزز باشندے قرار پائے ہیں، میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے آپ لوگوں کے لئے یہ حکم صادر کرتا ہوں کہ ایک بادشاہ کو غلوں دل سے قبول کریں، میں اور میرے ساتھی آپ کے لئے منصوبہ بندی کریں گے، آپ کو ایک جزیرہ زندگی دی جائے گی، آپ نے دیکھا کہ مارشل میں آپ کے ساتھ میرا وجود یہ بارہ دور حقیقت ایک بادشاہ تھا، اب یہ ہے، میں رحم اور انصاف کرنا جانتا ہوں، مجھے حکمرانی کرنا آتی ہے اور میری فکر و میں رہنے والے معزز باشندوں کو بہت سے مشکل مسائل سے پناہیں ہونا پڑے گا۔ لیکن شرط وفاداری ہے، آپ میری اس نئی مملکت کو غلوں دل سے اپنی زمین سمجھ کر لیں اور مجھے اپنا بادشاہ، باقی منصوبے اس کے بعد حکمران پر لاؤں گا، آپ لوگوں نے میرا موقف سن لیا تو اب میں پہلا سوال آپ سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ

میرے اس منصوبے پر یا میری بادشاہت پر کسی کو اعتراض ہے۔“

ایک لمحے کے لئے تو خاموشی طاری رہی، پھر کسی سمت سے ایک بیچانی آواز سنائی دی۔

”اس کا مطلب ہے مسٹر گارساں کہ تم مکمل طور پر پاگل ہو، افسوس اور دیوانہ ہو، ہم اپنے گھر واپس جانا چاہتے ہیں، ہم نے تمہیں ایک کپتان کی حیثیت دی تھی کیونکہ تم جہاز چلاتا جانتے ہو اور اس کے بعد ہم نے تم سے صرف اس لئے تعاون کیا کہ سمندری دستوں میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی تھی، لیکن تم نے جو بیوقوفی کا اعلان کیا ہے وہ تمہارے پاگل پن کی دلیل ہے، فضول باتوں سے گریز کرو اور اب جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے نکلنے کی منصوبہ بندی کرو، اگر تم دیوانہ ہو تو بے فکر رہو، ہم تمہاری دیوانگی کو درست کر دیں گے تم سمجھتے کیا ہوا ہے آپ کو۔“

تمام نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں، بولنے والا کوئی پر جوش و جوان تھا، گارساں کے چہرے پر کسی قسم کا غصہ نمودار نہیں ہوا جبکہ لوگ سنسنی خیز نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے، تمام ہی دلوں میں تشویش کے آثار نمودار ہو گئے تھے، گارساں پر تو وہ بے حد بھروسہ کرنے لگے تھے اور اتنے دن کے قیام اور انتظامی امور کو انہوں نے ایک کپتان کی دانش مندی اور ضروری کارروائی ہی سمجھا تھا، لیکن گارساں کے ذہن میں واقعی کوئی دیوانگی ہی مل رہی ہے اس کا کسی کو احساس نہیں تھا، کبھی ابتدائی جھٹکے سے نکلنے کے عالم میں رہ گئے تھے، چند لمحات کے بعد گارساں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور بولا۔

”ہاں میں جانتا ہوں کہ جہاز کے مسافروں میں سے کوئی ایسا نہیں ہوگا جس نے زندگی میں کبھی کسی کی فکر و میں آباد ہونے کے بارے میں سوچا ہوگا، آپ لوگوں کے گھر ہوں گے، عزیز واقارب ہوں گے، زمینیں جائیدادیں ہوں گی، کاروبار ہوں گے، لیکن مارشل کا سمندری سفر آپ میں سے کسی نے میرے ایمان

پر میری کسی سازش کے تحت نہیں کیا تھا۔“

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ ایک اور گوسھے سے آواز آئی۔

”آپ سب سمندری طوفان کی نذر ہو گئے ہیں، آپ سب مر چکے ہیں، مارشل ٹاکارہ انجنوں والا لوہے اور گڑی کا ایک گھر ہے جو سمندر پر پھیل رہا ہے، اس پر آہستہ آہستہ غذائی ذخیرے ختم ہو چکے ہیں، پانی موجود نہیں ہے، دھوپ اور نمی اسے زنگ آؤ کر رہی ہے اور مسافر مارتا شروع ہو چکے ہیں، آپ ان کی لاشیں سمندر میں پھینک رہے ہیں اور پھر آپ بھی مر جاتے ہیں بتائیے آپ میں سے کوئی زندہ ہے؟“

”کیا تم یہ ہوش مندانہ باتیں کر رہے ہو؟“ یہ ساری حقیقتیں ہیں جو آپ کو تسلیم کر لینی چاہتے ہیں، یہ زندگی میں نے آپ کو دی ہے اور یہ سمندر کا قانون ہے، میں نے اس قانون کا تذکرہ پہلے ہی کر دیا تھا، سمندری جہاز جب تباہ شدہ تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اسے بچانے والا اس کا مالک ہوتا ہے، میں آپ سب کا مالک ہوں، سمجھو آپ لوگ، میں آپ سب کا مالک ہوں، میں آپ کا آقا ہوں۔“

”یہ قانون انسانوں پر لاگو نہیں ہوتا۔“ کسی نے کہا۔

”لیکن اس کا ساز و سامان تو میرا ہے۔“ گارساں مسکرا کر بولا۔

”ہاں بے شک۔“

”اور یہ بحری قانون ہے۔“

”اس کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔“

”تھوڑی سی ترمیم میں بھی تو کر سکتا ہوں، اس

قانون میں یہ اضافہ میں نے کر لیا ہے، میرے پاس آئندہ زندگی کا مکمل منصوبہ موجود ہے، ہمارے اعداد و شمار میں جہاز پر چھ سو چالیس مرد ہیں، جن میں پانچ سو اٹھارہ نوجوان ہیں، باقی بوڑھے چار سو تیس خواتین ہیں، جن لوگوں کی نیگمات ان کے ساتھ سفر کر رہی ہیں وہ ان کے سنبالنے شہر ہیں، اس کے علاوہ کسی کا کوئی

رشتہ قبول نہیں، ہر بالغ لڑکی کسی سے منسوب کر دی جائے گی، اس طرح میری مملکت میں سطوں کا اضافہ ہوگا، ہم اس جزیرے کو دنیا کی ہر برائی سے پاک ایک مثالی مملکت بنائیں گے، یہاں زندگی کی ہر آسائش موجود کی جائے گی آپ اور آپ کی ٹیلیں یہاں ایک حسین زندگی گزاریں گی۔“

”تم بالکل گدھے کے بچے ہوگا رساں۔“ ایک بوڑھے شخص نے شدید غصے سے کہا وہ اپنی چاروں جوان بیٹیوں کے ساتھ جہاز میں سفر کر رہا تھا۔

”آنے والے وقت میں، میں یہ ثابت کر دوں گا کہ میں کیا ہوں، مجھ سے تعاون کریں۔ دوستو! میرے پاس اس نئی مملکت کا مکمل منصوبہ موجود ہے۔ آپ لوگ یہاں اپنے گھروں میں رہیں گے، ہمارے پاس کھانا سمندر ہے جو چھلیوں سے لبریز ہے، سمجھو! جنگلی شہر آباد ہیں اور یہ نہایت کارآمد شے ہے، بے شمار جنگلی پھل ہیں جن کی افزائش کی جا سکتی ہے، آپ خود سوچیں یہاں ہمیں کیسی حسین زندگی حاصل ہوگی ایک ٹکسی آئیڈیل جیسی زندگی۔“

”اغت ہے تمہاری اس بکواس پر۔“

”جیہاڑے دوستو! یہی تمہاری تقدیر ہے اسے قبول کرلو، اسی میں بہتری ہے یا پھر فرض کرو کہ تم لوگوں نے میری اس گزارش کو قبول نہ کر کے مجھے ہلاک کر دیا پھر کیا کرو گے؟“

”انتظار کریں گے ہم تقدیر کے فیصلے کا۔“

”تقدیر کا فیصلہ تو ہو چکا ہے، اب میں خصوصاً اپنے نوجوان دوستوں سے مخاطب ہوں، دوستو! کیا آپ کو یہ دلکش زندگی قبول نہیں ہے؟“

چاروں طرف سکوت طاری رہا تھا پھر مخالفت کرنے والوں نے کہا۔

”تمہاری اس بکواس کو کوئی بھی قبول نہیں کر سکتا۔“

”نہیں میرے بزرگو! نوجوانوں نے ابھی اس دلکش منصوبے پر غور نہیں کیا ہے، اچھا یوں کہیں

جو میرے شدید مخالف ہیں وہ اس طرف آ کر جمع ہو جائیں اس طرف اس سیاہ چٹان کے سائے میں جو مجھے سمجھانا چاہتا ہے وہ اس جگہ جہاں نمبر دو ہندسہ لکھا ہوا ہے، جو سوچنا چاہتے ہیں وہ اس تیسرے پوائنٹ پر اور جنہوں نے مجھ سے اتفاق کر لیا ہے وہ چوتھی جگہ، ہاں ٹیل چاہتا ہوں میں اپنے ان الفاظ کی ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔“

کوئی تیس بیٹیس آدی شدید مخالفوں کے پوائنٹ پر جا کھڑے ہوئے، باقی سب اپنی جگہ کھڑے رہے تو گارساں نے پھر کڑخت لہجے میں کہا۔
”میں نے کہا تھا میں ٹیل چاہتا ہوں۔“

ایک جگہ ہی روشاق میرے پاس پہنچا اس نے میرا بازو پکڑا اور پوائنٹ نمبر چار پر ٹھیک کر لے گیا اور دیکھی بہت سے لوگ وہاں آچکے تھے، جن میں عسکری، احمد جیدی سسر صوفیہ وغیرہ تھے۔ گارساں نے محبت بھری نگاہوں سے پوائنٹ نمبر چار پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، پھر باقی لوگوں کو اس کے بعد ان لوگوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو اس کے مخالفین کے طور پر کھڑے ہوئے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور نرم لہجے میں بولا۔
”جو منصوبہ میں نے بنایا ہے دوستو، آپ لوگ یقین کریں کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے، اصل میں جو فاصلہ طے کر کے ہم یہاں پہنچے ہیں اول تو اس کی واپسی ہی ممکن نہیں ہے، سکتے ہیں تو آپ میں سے ہر ایک شخص جانتا ہے کہ سمندر کی وسعتیں زمین سے تین گنا زیادہ ہیں، کتنے عرصے تک جہاں ہم، کتنا خطرہ سون لے سکتے ہیں، آخر کار ایک دن بے کسی کی موت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمارے پاس راستوں کا تعین نہیں ہے۔ یہ وہ بات ہے جو ایک ٹھوس حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں آپ کو احمق بنانے کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم سمندر میں ایک ایک کر کے بے کسی کی موت کا شکار ہو جائیں کیا میرا منصوبہ زیادہ موثر نہیں ہے، آپ لوگ مخالفت

برائے مخالفت کر رہے ہیں، ایسا نہ کریں میں آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گا۔“

”گارساں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہارے بارے میں فرانسیسی افسر نے جو کچھ کہا تھا بالکل ٹھیک تھا، اس سفر میں تم نے بہتر اخلاق کا مظاہرہ کر کے ہمیں احمق بنایا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت بھی تمہارے ذہن میں دیوانگی پل رہی تھی۔ تم سمندری ڈاکو ہو، جان بوجھ کر تم نے ایسے دیران سمندروں کا رخ کیا جہاں زندگی نہ ہو، لیکن ہم تمہاری اس بے ایمانی کو قبول نہیں کرتے، کیا کر لو گے تم ہمارا، کتنے ہوشیار لوگ، اگر ہم سب تم پر یلغار کر دیں تو تم اور تمہارے ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے جائیں گے، ہمیں اس کے لئے مجبور نہ کر، بس ایک بہتر جہاز داں کی حیثیت سے یہاں سے نکلنے کی منصوبہ بندی کرو۔“

”میرے بہت ہی پیارے بزرگو! میری دلی آرزو ہے کہ آپ ہمارے درمیان زندہ رہیں، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اب ممکن نہیں رہا، اپنے ساتھیوں کو بھی سمجھائیں، میں یہاں زندگی چاہتا ہوں موت نہیں۔“

”اور اگر تم دومنٹ کے اندر اندر اپنے منصوبے کو ترک نہیں کر دیتے تو پھر بات ہمارے ہاتھ سے بھی نکل جائے گی۔“

”دومنٹ ٹھیک ہے، معزز بزرگ کا ش آپ اور آپ کے ساتھی مجھ سے تعاون کر لیتے مجھے دلی خوشی ہوئی، لیکن افسوس افسوس.....“ گارساں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور جزیرے کی خاموش فضا میں مٹین گلوں کی آوازیں ابھریں اور اس کے ساتھ ہی بے شمار دلخراش چیخیں جو افراد پوائنٹ نمبر ایک پر کھڑے ہوئے تھے ان کے جسم مٹین گلوں سے چمکی ہو گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاک و خون مٹا لوٹنے لگے۔ بے شمار چیخیں بلند ہوئیں اور لوگ دہشت سے کانپ اٹھے، بہت سے زمین پر گر پڑے، بہت سوں نے راہ فرار اختیار کی، لیکن مٹین گلوں کی گرجا

رچ رساں کی میکان فون سے ابھرنے والی آواز حاوی ہوئی اس نے کہا۔

”نہیں جس نے راہ فرار اختیار کی وہ بھی مولیوں کا نشانہ بن جائے گا، ایک بھی فرد یہاں سے فرار نہ ہو، ایک بھی فرد یہاں سے آگے نہ بڑھے، مخالفین کو بغاوت کرنے والوں کو موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ سزا خود ہی اپنے لئے تجویز کی تھی، میرا قصور نہیں ہے۔“

دوڑنے والے رک گئے، چاروں طرف سے رونے پینے کی آوازیں ابھرنے لگیں، مخالفت کرنے والوں میں سے بہت سے عزیز و اقارب بھی شامل تھے، ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ میں بہت دلبرداشتہ تھا، بہت افسوس تھا مجھے کہ گارساں اپنی فطرت سے ہٹ گیا ہے، سب نے میری مخالفت کی تھی سب نے اس کا ساتھ دیا تھا، آہ اس وقت میں سب سے زیادہ خوش ہوں کہ ان لوگوں کو اپنے کئے کی سزا سنائی پڑی۔“ یہ الفاظ فرانسیسی افسر کے تھے، مرنے والے مر گئے ان کے جسم بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے، گارساں نے کہا۔

”میرے پیارے دوستو! میں چاہتا ہوں کہ اب وہ پوائنٹ نمبروں پر آجائیں جنہیں اپنے ساتھیوں کی موت پر افسوس ہوا ہے اور وہ جوش و غضب میں ڈوب کر میرے خلاف عمل کرنا چاہتے ہیں، میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور مجھ سے اپنے مسائل کا انتقام لیں۔ کیا خیال ہے آپ لوگوں کا، اصل میں جب میں نے مارشل کا نظام سنبھالا تھا سب سے پہلا عمل یہی کیا تھا کہ اسلحہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا، اسلحہ اگر مختلف ہاتھوں میں ہوتا تو مقابلہ کیا جاتا۔ پہلے تو میں نے اپنے ہر مقابل کو شکست دے دی، اس کے بعد میں نے دوسرے معاملات پر توجہ دی، یہی جان فرانسیسی افسر اس وقت ہمیں سب سے زیادہ لائق کا سامنا کرنا پڑا ہوگا تم اس بات کی توقع رکھتے

ہو گئے کہ میں کہیں غلطی کروں گا اور تم حالات کا پانسہ پلٹ دو گے، لیکن غلطیاں ایک دو ہی ہوا کرتی ہیں زندگی میں، میں کسی بھی ایسے شخص کو ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کروں گا جس سے میری ذاتی مخالفت ہو، لیکن اس نظام سے مخالفت کرنے والے کسی بھی شخص کو زندہ چھوڑنا میرے لئے بھی ممکن نہیں ہوگا، ہر شخص کو میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ جب میری یہ جنت مکمل ہو جائے گی تو آپ لوگ دنیا کے محفوظ ترین انسان ہوں گے، کچھ عرصے کے بعد میں مارشل کے وجود کو مکمل طور پر فنا کروں گا اس کا لوہا اور لکڑی اور دیگر اشیاء ہمارے مستقبل کی تعمیر میں کام آئیں گی، میں ایک مکمل حکمران ہوں، اب آخری بات سنیں، کوئی سازش نہ کی جائے کوئی مخالفت نہ کی جائے، کوئی تنظیم نہ بنائی جائے، ورنہ آپ زندگی کھونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر س گے، میں یہ کام مرحلے وار کروں گا، آپ لوگوں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا ان لاشوں کو سمندر میں پھینک دیا جائے اور تمام نوجوان دوست یہ کام کریں اور سنیں، مناسب جگہ چٹانوں پر مشین گنیں دو رینوں کے ساتھ نصب ہیں، ہر شخص کو دور دور تک نشانہ بنایا جاسکتا ہے، بس اب آپ لوگ منتشر ہو سکتے ہیں۔“

لوگ بادل ناخواستہ منتشر ہو گئے۔ ہاں وہ لوگ جن کے عزیز و اقارب مارے گئے تھے اپنے عزیزوں کی لاشوں سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ روشاق نے آہستہ سے کہا۔

”آؤ بے بی۔ درندوں سے احتیاط رکھنا ضروری ہے۔“

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی میرے قدم لڑکھڑاہے تھے درندگی کا جو مظاہرہ میں دیکھ چکی تھی اس نے میرے اعصاب پر بہت برا اثر کیا تھا۔ ”اب کیا ہوگا مسٹر روشاق؟“ میرے منہ سے سستی آوازیں نکلی۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے

ہمارے لئے صرف ایک تماشے کی حیثیت رکھتا ہے تمہیں اس سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔

”آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”اس سے قبل بھی بہت سی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں بے بی، بس تمہارا وقت بہت تمہارا۔“

میں غصہ میں سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

ہر طرف دلدوز مناظر بکھرے پڑے تھے۔ ہر شخص سہا ہوا تھا لوگ ٹولیاں بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر شخص سست اور سحر زدہ تھا۔ رات کو معمول کے مطابق کھانا تقسیم ہوا پھر دوسرے دن گارساں کی تانچوشی کا اہتمام ہوا ہر شخص کو حکم دیا کہ وہ سنے لباس پہنے۔ انہیں ان کا سامان دے دیا گیا تھا چاروں طرف مصنوعی خوشیاں پھیل گئیں سب زندگی بچانے کا سامان کر رہے تھے۔

فرانسیسی افسر نے غلط نہیں کیا تھا گارساں کے چہرے سے خول اتر گیا تھا گارساں کے اس جریزے کو گارساں کو کھم ڈم کا نام دیا گیا تھا اس شام مارشل کے تمام مسافروں کو کھانا پیش کیا گیا تھا۔

اس رات جشن کا اہتمام کیا گیا اور ہر طرح کی بیہودگیوں کی اجازت دیدی گئی۔ نو جوان جوڑوں کو اپنی پسند سے ایک دوسرے سے منسلک ہونے کا اختیار دیدیا گیا تھا یہ مرحلہ نہایت تکلیف دہ تھا اور میرے لئے یہ اس وقت بے حد تکلیف دہ ہو گیا جب عسکری میرے پاس آیا۔

”سنو نشاء۔ میں تمہیں اپنانے کا خواہش مند ہوں۔“

”میں تمہاری آنکھوں میں انگلیاں چسبوں کہیں اندھا کر دوں گی۔ میں نے شدید طیش کے عالم میں کہا۔

”پاگل پن مت کرو۔ تم اس کا اعلان سن چکی ہو۔ کوئی بھی تمہارے قرب کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ نشاء؟ غور کر لو۔“

”میں تمہاری جگہ کسی خارش زدہ کتے کو قبول کر لوں گی۔ مجھے تمہارے وجود سے بے پناہ نفرت ہے عسکری۔“

”نہیں بے بی تم واقعی غلط بات کر رہی ہو۔“

مجھے سے آواز سنائی دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ روشاق تھا۔ وہ پھر یولا۔ ”یہ شخص خارش زدہ کتے سے بہتر ہے۔ میرے خیال میں تم آدمی کا اظہار کر دو۔“

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے خونی نظروں سے روشاق کو دیکھا پھر یولی۔

”میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ نہ ہی تم میرے لئے کوئی ایسی حیثیت رکھتے ہو کہ میں تمہاری بات مان لوں۔“

”لیکن یہ بے حد ضروری ہے بے بی۔ یہ شخص خود تمہارے پاس نہیں آیا بلکہ میں نے اسے بھیجا ہے۔“

”غالباً آپ اسے اس کی وفاداریوں کا صلہ دینا چاہتے ہوں گے۔ لیکن آپ ہوتے کون ہیں بتائیں گے۔“

”تم وعدہ خلافی کر رہی ہے۔“

”کیسی وعدہ خلافی۔“

”تم نے مجھ سے تمناؤں کا وعدہ کیا تھا۔“

”آپ اپنی..... میں نے کہا چاہا لیکن روشاق نے میری بات نہ پوری ہونے دی اور درمیان سے جملہ کاٹ کر یولا۔

”جملہ سے کام لو۔ پوری بات سن لو۔ عسکری ٹھیک کہتا ہے کوئی بھی بے قابو نو جوان تمہیں حاصل کرنے کے لئے گارساں کی مدد لے سکتا ہے جبکہ عسکری کا ساتھ مصنوعی ہوگا۔“

”مصنوعی..... میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں۔ عسکری سے قربت بس تمہارے تنہا کے لئے ہو گیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس طرح تم محفوظ ہو جاؤ گی۔“

میں نے عسکری کی طرف دیکھا تو وہ مضحل لہجے میں بولا۔ ”ہاں نشاء یہ عمل صرف تمہیں دوسروں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہوگا۔ میری ذات سے تمہیں کوئی الجھن کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

بات واقعی بڑی سنسنی خیز تھی اور مجھ میں آری

نہی۔ بدست اور بے لگام نو جوان چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ست لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے عسکری۔ لیکن خیال رکھنا میرے ساتھ اگر کوئی بدتمیزی ہوئی تو میں صرف خودکشی نہیں کروں گی بلکہ تمہیں بھی قتل کر دوں گی۔“

”میں تمہارے ساتھ کسی بدتمیزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا نشاء۔“ عسکری نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے اب تمہارے درمیان میرے رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ روشاق نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں خاموشی سے اسے جاتے دیکھتی رہی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عسکری بولا۔

”میں نے خود یہ جرأت نہیں کی تھی نشاء۔ بلکہ روشاق نے میرے پاس آ کر کہا تھا کہ تمہارے لئے فخر ہے، میں تم سے تمہارے ساتھ رہنے کی فرمائش کروں، میں خود بھی تمہیں یہ تکلیف نہیں دیتا کیونکہ میں تم سے وعدہ کر چکا تھا۔“

”عسکری۔ میں نے مان لیا ہے۔“

”ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں۔ یولو۔“

”میرے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر لو۔ ابھی یہ دہانے بھٹکتے پھر رہے ہیں کوئی بھی تمہارے لئے الجھن بن سکتا ہے۔“

میں خاموش رہی۔ پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔ ہر طرف کوئی نہ کوئی ہنگامہ تھا۔ نو جوان بے لگام ہو گئے تھے۔ ابھی کسی نے والے وقت کا کوئی احساس نہیں عسکری سے شہساز نے اپنا رویہ تبدیل کر لیا تھا۔ یہ وقت کی ضرورت تھی سسز صوفیہ کو اب زیادہ تر ڈاکٹر عارف کے ساتھ لکھ جاتا تھا۔ وہ مجھے جب بھی دیکھتی اس کی آنکھوں میں نفرت ہوتی تھی میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

گارساں اپنی بادشاہی کے شوق پورے زور پاتا تھا۔ نئے نئے احکامات صادر کرتا رہتا تھا۔ اس

لئے کسی پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ اس دن میرا سؤ خود بخود کچھ بہتر تھا۔ میں نے عسکری سے کہا۔

”آج ہم دور و دریک چلیں گے۔ لوگ نہ جانے کہاں کہاں تک چلے جاتے ہیں۔“

”مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“ وہ بولا۔

”تفصیل کچھ نہیں اس جزیرے کو دور دور تک دیکھیں گے، جہاں بات جاسکتے ہیں جائیں گے چاہے کئی دن لگ جائیں۔“

”اوہ۔ یہی تو پوچھ رہا تھا۔ اگر کوئی دن کا پروگرام ہے تو کچھ چیزوں کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔ میں انتظام کے لیتا ہوں۔“

وہ انتظام میں مصروف ہو گیا۔ اسے جوتیار بیاں کرنی تھیں اس نے کیس پھرزم وہاں سے چل پڑے۔ یہ سزا چھ لگ رہا تھا ہر طرف مجوروں کے درخت اور دوسرے چیز نظر آرہے تھے قدرتی حسن کی یہاں کمی نہیں تھی۔ ہماری طرح دوسرے لوگ بھی دور دور تک نظر آرہے تھے۔ گارساں کی مملکت میں اس کی رعایا عیش کر رہی تھی۔ یہ نہیں مستقبل کے ہمارے میں عام لوگوں کے کیا خیالات تھے لیکن زیادہ تر لوگ خوش نظر آرہے تھے ان میں نو جوان زیادہ تھے۔

اب ہم بہت دور نکل آئے تھے۔ اتنی دور کہ اب ہمیں جزیرے کے دوسرے انسان نہیں نظر آرہے تھے۔ اب تک خاموشی ہی رہی تھی عسکری میرے لئے صرف ایک الجھی تھا اب میرا اس سے کوئی ذہنی تعلق نہیں تھا ابھی وجہ تھی کہ ہم نے اس دوران کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔

”نشاء۔“ عسکری کی آواز پر میں رک گئی۔

”ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اور آگے جانا ہے۔“

”مطلب۔“

”جھکی نہیں ہو۔“

”تم ٹھک گئے۔“

”نہیں۔ میں تمہاری وجہ سے کھد ہا ہوں۔“

”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ واپسی جلدی نہیں ہوگی۔ بلکہ میرا دل تو چاہتا ہے کہ اب اس ماحول میں رہتی رہوں۔“

”بس دل چاہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے تم پسند کردہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”تم! میری آواز طرہ ہوگی۔“

”ہاں نشاء۔ میں.....“ اس نے آگے بھی کچھ کہا تھا لیکن میں نے قدم آگے بڑھا دیے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر میں اس وقت تک چلتی رہی جب تک بیروں نے ساتھ دیا۔ عسکری پامردی سے میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اچانک لہروں کے شور نے احساس دلایا کہ ہم ساحل تک آگئے ہیں کچھ اور آگے بڑھے تو سمندر نظر آ گیا۔ لیکن یہ ابھی ساحل تھا۔ یہاں انتہائی بلند و بالا بد صورت چٹانیں سینے تانے لکڑی تھیں جن کے درمیانی رخنوں سے پانی کی پھواریں فوراً کی شکل میں بلند ہو رہی تھیں اور اندرونی سمت جھیل بن گئی تھی اس کے کنارے بے شمار درخت بکھرے ہوئے تھے۔ ان سے پہلے نرم ریت سلی سلی۔

یہ بے حد دلکش جگہ تھی۔ میرے قدم ایک طرف بڑھ گئے۔ یہ جگہ کچھ اس طرح سن کو بھائی کہ میں نرم ریت پر لپٹ گئی۔ عسکری مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ چٹانوں سے ٹکرانے والی موجوں کا شور اور پھر چٹانوں کی بلندی سے اڑتی ہوئی پانی کی پھواریں بڑی فرحت بخش لگ رہی تھیں۔

”یہ ابھی ساحل ہے۔“ اچانک عسکری کی آواز ابھری۔

”ہاں۔ اب تک یہاں کوئی نہیں آیا۔“

”اس طرف سے کہیں زیادہ یہ جگہ خوبصورت ہے۔ وہ لوگ جب اسے دیکھیں گے تو یہاں آ پاد ہونے کی کوشش کریں گے۔“

”ممکن ہے۔“

”کس قدر پر اسرار ماحول ہے۔“

”اس جزیرے کی وسعتیں کتنی ہوں گی عسکری۔“

”خدا جانے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں نشاء۔“

”وہی پرانی باتیں کر دو گے تم، لیکن میں وہ دروازہ بند کر چکی ہوں۔“ کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔

”ہاں۔ کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ وہ بولا۔“

”بولو۔“

”میں روشاق کا غلام یا ملازم نہیں ہوں کہ اس کے ایما پر تمہاری رکھوائی کرتا ہوں۔ کون مجھے میری مرضی کے خلاف آمادہ کر سکتا ہے۔ میں نے صرف تنہا کے خیال سے یہ عمل قبول کیا ہے۔ آخری بار۔ آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں نشاء۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں محبت کی شدت کسی انسان کے قابو میں نہیں آتی۔ اگر تم مشکل کے بارے میں کہنا ہو تو وہ صرف میرا فرض تھی جس کی تفصیل تم جانتی ہو۔ تم میری محبت ہو۔ فرض اور محبت میں فرق ہوتا ہے نشاء۔ میں اب بھی تمہاری محبت چاہتا ہوں۔“

”ڈھمکی دے رہے ہو مجھے۔“ میں نے کرخت لہجہ میں کہا۔

”میں تمہیں چاہتا ہوں نشاء تمہاری حاجت میں در بدر ہوں۔ میری زندگی کس قدر بے مقصد ہو گئی ہے۔ بالکل بے معنی۔ زندگی کا پتہ ہے ناموس کا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیوں جی رہا ہوں۔ اس سے بہتر ہے خودکشی کر لوں۔“

میں ہنس پڑی پھر میں نے کہا۔ ”تم خودکشی کر سکتے ہو۔“

”ہاں۔ جینا بے معنی ہو گیا ہے۔“

”تو خودکشی کرو، طریقہ میں بتاؤں۔“ میں نے کہا اور وہ جنونی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”بتاؤ۔“

”وہ سامنے والی چٹان دیکھ رہے ہو۔ اوپر پہنچنا

مطلوب نہیں ہوگا۔ وہاں سے ان پتھروں پر کود پڑو۔ مجھے ہنس پانی ہو جائے گا۔ کھیل ختم۔“

”ہاں؟“

”ٹھیک..... خدا تمہیں خوش رکھے۔ لیکن۔۔“

خبر اس کے بعد۔ اذکے۔ نشاء تم اس قدر حسین اور برکش ہو کہ تم پر جان دی جاسکتی ہے۔ خوشی سے دی جاسکتی ہے اذکے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس چٹان کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے تھے کہ مجھے خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ سچ سچ ایسا نہ کر ڈالے۔ اس خدشے میں اس کی محبت کا کوئی احساس نہیں تھا، صرف یہ خوف تھا کہ میں تمہارا جاؤں گی۔ واپسی کا راستہ بھی بھول سکتی تھی اور دوسرے خدشے بھی تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک دلچسپ احساس بھی تھا۔ وہی عورت والا احساس۔ کیا وہ واقعی میرے لئے خودکشی کرے گا۔ کیا واقعی کوئی کسی کے لئے مر سکتا ہے۔ وہ چٹان پر چڑھنے لگا۔ چڑھائی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ جوں جوں وہ اوپر جا رہا تھا میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اب لبا کر دل اسے روکا تو سمجھے گا کہ میں اس کی محبت کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔

بڑی کشمکش میں پڑ گئی۔ وہ بلندی پر پہنچ گیا اور میں بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اب وہ زبان کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہنچنے کو کہنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ اذکے کا ارادہ سیکھنے کی سی کیفیت میں دوسری طرف الجھ رہا تھا۔

دس سیکنڈ میں سیکنڈ پچاس سیکنڈ۔ میرا چڑھا ہوا سانس اٹھتا ہوا آنے لگا۔ دفعتاً وہ میری طرف گھوما۔ میرا پتہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ وہ مجھے اوپر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اور میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ ”زندگی بہت پیاری ہوتی ہے۔“ اوپر پہنچ کر اس کی ساری بہادری ہوا ہو گئی تھی۔ ”کیا مجھے بھی ساتھ لے کر مرنا چاہتے ہو۔“

میں نے تسخیرانہ انداز میں چیخ کر کہا۔ ”پتہ نہیں میری آواز اس تک پہنچی یا نہیں مگر وہ منہ سے کچھ بولے بغیر مسلسل مجھے اوپر آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ اس کا انداز عجیب تھا۔ مجھے تجسس ہوا دیکھوں تو سہی وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں احتیاط سے چٹان پر پہنچ گئی۔۔“

”کیا بات ہے فرمائیے۔“

اس نے طنز یہ کہا۔ ”وہ دیکھو نشاء وہ دیکھو وہ کیا ہے؟“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور میری نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ واقعی حیران کن منظر تھا۔ وہ ایک اجنبی سمندری جہاز تھا جو عظیم الشان پہاڑی دیواروں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ اس جگہ سے اس کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ یہاں سے ہی اس کی بوسیدہ حال دیکھی جاسکتی تھی۔ بری طرح شکستہ ہو رہا تھا۔ ڈیک پر کاہنی نظر آ رہی تھی ہر شے ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی تھی۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کسی خوفناک سمندری طوفان کا شکار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا۔ سمندر کی سمت سے اس کی ڈائرکشن کچھ ایسی تھی کہ اسے کھلے سمندر سے نہیں دیکھا جاسکتا ایک طرح سے وہ پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔

”بتاؤ شدہ جہاز۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں بری طرح تباہ۔“

”کیا اس پر زندگی کا وجود ہوگا۔“

”مشکل ہے۔ پتہ نہیں کب سے یہاں پھنسا ہوا ہے۔“

”جزیرے پر اب تک کسی اجنبی کا وجود نہیں، اگر اس کا کوئی مسافر زندہ ہوتا تو کس نہ کسی شکل میں ضرور نظر آتا۔“

”ہاں یقیناً۔“ قریب سے دیکھو گی اسے؟

”ممکن ہوگا۔“ میں نے سوال کیا۔

”میرے خیال میں مشکل نہیں ہے۔“

”کیسے۔ کافی گہرے سمندر ہیں۔ میں سمندر میں نہیں تیر سکتی۔“

”ہم سمندری راستے سے وہاں نہیں جائیں گے۔“
”تو.....“

”یہ چٹانی سلسلہ وہاں تک گیا ہے۔ یہاں سے اتر کر ہم ان چوٹی چٹانوں سے محو کر اس تک بہا سانی پہنچ سکتے ہیں۔ وہ بڑے..... نظر آرہے ہیں جو چٹانوں سے نکلے ہوئے ہیں۔ ان سے گزر کر عرش پر چڑھنا مشکل نہیں ہوگا۔“

میں نے پوری طرح اس طرف کا جائزہ لیا عسکری ٹھیک کہہ رہا تھا۔ خود میرے ذہن میں شدید تجسس بیدار ہو گیا تھا چنانچہ میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ اور ہم دونوں اس بلند بالا چٹان سے نیچے اترنے لگے۔

”تم سوچ رہی ہو گی کہ میں نے موت سے نیچے کے لئے خوب بہانہ تلاش کیا ہے۔“

میں خاموشی سے آگے بڑھتی رہی پھر میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہاری موت نہیں چاہتی عسکری۔ ہم بن حالات سے گزر رہے ہیں ان میں کسی جذبات کی منجانبش نہیں ہے۔ میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔“

”کہو۔“ وہ بولا۔
”ہو سکے تو ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میرا ساتھ دو۔“ مسر صوفی نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے، وسکن ڈیزل بھی اکتا ہے۔ روضائق اپنا ٹھیک ٹھیک رہا ہے میں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ نہ ماضی کے بارے میں نہ مستقبل کے بارے میں مجھے ایک سانس کی ضرورت ہے۔ لیکن بے لوث سانس کی اگر مجھ سے جبری محبت طلب کی جائے تو وہ مجھے قبول نہیں چاہے میرا کچھ بھی حال ہو۔“

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم جہاز تک پہنچ گئے تھے۔ زبردست جہاز تھا بیشک مارشل سے چھوٹا تھا لیکن بہت عمدہ تھا۔ کارگو شپ تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ حادثے کا شکار ہونے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس پر کابھی

آہستہ آہستہ جم رہی تھی۔ جو شہر پر رکھے گئے تھے۔ یقیناً اوپر جانے کا راستہ بنانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ ان پر ابھی تک کابھی نہیں جی تھی اور ان پر قدم نہ کر جہاز پر پہنچا جاسکتا تھا۔

”نشاء۔ جہاز پر چلیں۔“
”ہاں چلو.....“ میں نے کہا۔ اور ہم آگے بڑھ گئے۔ آخر کار ہم نے شہر پر قدم رکھ دیا۔ توڑا سا خوف محسوس ہوا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ جہاز کا ایک حصہ ٹیڑھا ہو کر زمین میں دھنس گیا تھا عرش ویران پڑا تھا۔ ہر شے ٹوٹی پھوٹی نظر آرہی تھی ہم پر تجسس نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک عسکری نے مجھے پکارا اور میں اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔“

”کیا؟“
”کیا کوئی ذی روح یہاں موجود ہے۔“
”کیوں؟ یہ سوال کیوں کیا؟“
”لگ رہا ہے۔“
”کیسے۔“

”بل اسے چھنی جس ہی کہو۔“ وہ بولا پھر آگے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”نیچے چلیں۔“

”چلو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر نے جانے کا راستہ تلاش کر کے نیچے اترنے لگے۔ آگے جا کر پھرہ شہہ ہونے لگا کہ جہاز پر زندگی موجود ہے۔ جگہ جگہ صفائی ستھرائی کا احساس ہوتا تھا دفعتاً ہم دونوں چونک پڑے ہلکی سی کھانسی کی آواز سنائی دی۔ ہاں! جیسے کھانسی روکی گئی ہو۔

”سننا۔“ عسکری سرگوشی کے انداز میں بولا۔
”واپس چلو عسکری۔“ میں نے لرزتی آواز میں کہا۔
”کیوں۔ دیکھتے ہیں کیا اسرار ہے؟“
”کوئی نظر نہیں آ رہا۔ لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں زندہ انسان موجود ہیں۔“

”آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔“ ایک طرف سے آواز آئی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آٹھ افراد ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے طبع زیادہ خراب نہیں تھے۔ ان میں جو سب سے آگے تھا اس نے زور بولنے میں کہا۔

”اگر ہمیں شبہ ہو تا کہ آپ کے پاس اسلحہ ہے تو ہمارا رویہ آپ کے ساتھ مختلف ہوتا۔ کیا آپ دشمنوں کی طرح ہمیں وقت دیں گے۔“
”عسکری بہر حال مرد تھا۔ باہمت تھا اس نے فوراً جواب دیا۔

”تمہارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے اور ہم کسی بھی طرح آپ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔“
”شکریہ۔ آپ مارشل ہی کے مسافر ہیں نا۔“
”ہاں! آپ مارشل کے بارے میں کیسے جانتے ہیں؟“

”ہم نے دور سے اسے دیکھا ہے۔ اس پر اس کا نام لکھا ہے آپ ہمارے ساتھ آنا پسند کریں گے۔“ اسی شخص نے کہا اور ایک طرف مڑ گیا۔ میں نے عسکری کی طرف دیکھا۔ عسکری نے بھی اس طرف قدم نہ دوا۔ چنانچہ میں بھی آگے بڑھ گئی باقی لوگ اس سے پیچھے آگے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ ایک کورڈ دور سے پور کر رہے تھے۔ عسکری کی طرف سے ایک پتھر اس نے ایک کیمین کا دروازہ کھولا کیمین بر حال میں تھا۔ آگے بڑھ کر پتھر پڑا تھا لیکن دوسرے لمحے ہم نے ایک عجیب غریب دیکھا۔ آگے والے شخص نے ایک بوسیدہ لکڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے عقب سے تیز روشنی برکت پڑی۔ ہماری آنکھیں حیرت سے پھل گئیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”آئیے۔“ اسی شخص نے کہا، اور اس الماری سے زور کر دوسری طرف داخل ہو گیا۔ یہ سب ناقابلِ رہا تھا۔ ”تاہم ہمیں دوسری طرف جانا پڑا۔ پھر جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے تھے۔ جو کچھ یہاں

کہا گیا تھا وہ انسانی عقل کا بے مثال مظاہرہ تھا۔ جہاز کے کیمین کے اس خفیہ دروازے کو اس بلند بالا پہاڑ کے ایک عمار میں کھولا گیا تھا یہ عمار قدرتی تھا لیکن اسے زبردست قیام گاہ بنایا گیا تھا جہاز کے سامان کو اس وسیع ترین عمار میں سجایا گیا تھا اور ہر شے یہاں منتقل کر دی گئی تھی۔ عمار کے اندر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن سے روشنی اندر آتی تھی ایک طرف کھلتا تھا۔ اس کے اوپر جا کر ایک اور وہاں کھلتا تھا جس کا رخ جزیرہ کی طرف کھلتا تھا اور یہاں سے جزیرے بہت دور تک نظر آتا تھا۔ اس جگہ کرسیاں بڑی ہوتی تھیں۔

”بیمو۔“ اس شخص نے کہا۔ اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔

”آپ لوگ۔ کون ہیں، یہ تو معلوم ہے کہ آپ اس تباہ شدہ جہاز کے مسافر ہیں لیکن کون ہیں آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”یہ میں تمہیں بتاؤں گا معزز مہمانوں۔ عمار کے دوسرے دروازے سے آواز آئی اور ایک دروازہ شخص جو بہترین پر سنائی رکھا تھا آنا نظر آیا وہ ہمارے قریب آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”میرا نام ڈگر ہے ایم ڈگر۔ نقشہ پرنگی ہوں۔ آپ لوگ کون ہیں؟“

”میرا نام عسکری ہے اور یہ نشاء ہارون وانل۔“
”مارشل کے مسافر یا عمدہ دار۔“
”مسافر۔ آپ مارشل کے بارے میں جانتے ہیں۔“

”صرف نام کی حد تک۔ اور یہ نام ہمیں دور سے نظر آتا ہے۔“
”اور آپ مسز ڈگر ہیں۔“
”اس بد نصیب جہاز کا کپتان ہوں۔“
”یہ کیسے تباہ ہوا۔“

”طوفان کی نذر ہو گیا۔ طوفان نے اسے لا کر ان پہاڑوں سے دے مارا۔“
”بڑی ہلاکتیں ہوئی ہوں گی۔“

"اس پر زیادہ لوگ نہیں تھے کیونکہ یہ کارگو شپ تھا۔"

"آپ کو کتنا عرصہ ہو گیا۔"

"ذریعہ سال کے قریب۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"اس وقت آپ کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔"

"انہیں افراد ہیں۔"

"جہاز کی کیا پوزیشن ہے۔"

"اب صرف لکڑی اور لوہے کا گھر ہے۔ اور کچھ نہیں ہے اس میں۔"

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے۔"

"آئر لینڈ سے۔ یہ برٹش نیوٹیشن کا شپ تھا۔ ہم لوگ ایک پرسکون سفر کرتے ہوئے مصر جا رہے تھے لیکن۔ زنگریک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

"بہت طویل عرصے سے آپ یہاں زندگی گزار رہے ہیں۔"

"ہاں۔ مجبوری اور بے کسی کی زندگی۔ ہمارے پاس خوراک نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ دوائیں ایکسپائر ہو چکی ہیں۔ لباس نہ ہونے کے برابر ہیں بس سانس باقی ہیں جنہیں گزار رہے ہیں۔"

"لیکن یہ سب تو آپ نے بہت شاندار اور حیرت انگیز بنایا ہے۔"

"بس۔ زندگی ایسی ہی ظالم چیز ہے۔ انسان ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ یہ سب زندگی کے لئے۔"

"ایک سوال کر سکتی ہوں مسز زنگر۔"

"جی۔ فرمائیے۔" وہ بڑی تہذیب سے بولا۔

"یہاں کوئی خاتون نہیں نظر آئیں۔"

"میں نے کہا تا کہ یہ کارگو شپ ہے لیکن اس کے باوجود جہاز پر میری بیٹی جولین اور نو اسی میلنا موجود ہے۔ جولین میرے ساتھ مصر جا رہی تھی وہاں اس کا شوہر ہے جو مصر میں ملازمت کرتا ہے۔"

"اور وہی خواتین ہیں یہاں۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ اور کوئی نہیں ہے۔"

"مارشل کو آپ نے کب دیکھا۔"

"وہ اس جے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرے دل میں شدید خواہش تھی کہ کسی طرح مجھے آپ لوگوں کے بارے میں معلوم ہو سکے۔"

"آپ نے خود مارشل تک آنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"احتیاط بے بی دہم بے بس ہیں کون جانے کون کیا ہو۔"

"یہ عار قدرتی ہے۔"

"سو فیصد یہاں بہت کچھ ہے۔ اب تم لوگ مجھے مارشل کے بارے میں بتاؤ۔" زنگر نے کہا۔

"مارشل اسپین سے روانہ ہوا تھا۔ اسے الجوزا، ماریطانیہ سے ہوتے ہوئے نہ جانے کہاں جانا تھا۔ سمندری طوفان نے اسے جاہ کر دیا۔" میں نے زنگر کو سنا تا شروع کیا اور اسے گارمیاں کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اب وہ اس جزیرے کا بادشاہ ہے۔ "اومائی گارڈ۔ کئی عجیب کہانی ہے۔"

"وہ بے حد ظالم ہے۔ اس نے اپنے خاتونوں کو گولیوں سے بھون ڈالا ہے۔"

"زنگر سوچ میں ڈوب گیا۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "جہاز کے لوگ اس سے نفرت کرتے ہوں گے۔"

"ظاہر ہے۔"

"کچھ اس سے متعلق بھی ہوں گے۔"

"سو فیصدی مجبوراً۔"

"ایک بات بتاؤ تم دونوں۔ کیا تم ایک ایسا گرو تیار کر سکتے ہو جو گارمیاں کے خلاف ایکشن کے لئے تیار ہو جائے۔"

"جہاز پر سفر کرنے والے عام لوگ ہیں جوڑائی بھڑائی سے واقف نہیں ہیں۔ اور پھر تمام ہتھیار گارمیاں کے قبضے میں ہیں ان کا ایکشن موت کے سوا کچھ نہیں

"ہے۔۔۔۔۔ بات سب جانتے ہیں۔"

"مارشل پر ایندھن کتنا ہے۔"

"میرے خیال میں کافی ہے۔ مگر گارمیاں بہت حد تک تیار کر دینے کا منصوبہ رکھتا ہے تا کہ اس کی رعایا کہیں جانے کا تصور بھی ختم کر دے۔"

"یہاں کسی بے ہودہ مددگار زندگی کے بارے میں کوئی دم سے پوچھے۔" میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہت جلد یہاں رہنے والا۔" ف۔ موت کی آرزو کرے گا۔ صرف موت کی۔ بس تم سے اس مختصر وقت میں بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں تم ان کی اجازت دو گی۔"

"جی مسز زنگر۔"

"تم دونوں۔ صرف تم دونوں یہاں سے نکلنے کی جدوجہد کرنا چاہتے ہو۔"

"زندگی کی قیمت پر بھی مسز زنگر۔" عسکری نے کہا۔

"آگرم کچھ دن عام لوگوں کے درمیان رہ کر تیار ہو سکی کوشش تو نہیں ہوگا۔ خود گارمیاں کسی پر گہری نکتہ نہیں رکھتا۔"

"تصویر اس کے قبضے میں ہیں اس لئے وہ مطمئن ہے۔ اس کے علاوہ اسے آپ کے جہاز کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"مگر تو بتاؤ۔ کیا میں تمہیں اپنا ساتھی بنا سکتا ہوں۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مسز زنگر۔"

"سنو۔ میں اپنے جاہ شدہ جہازوں کا کپتان تھا۔ تم زندگی کی یہاں سے نکل جانے کی آس کھو بیٹھے۔" میں نے دل میں جینے کی ایک کرن آج بھی ردش ہے کہ کاش ہمیں یہاں سے نکل جانے کا موقع مل جائے۔" میں نے بتایا مسز عسکری کہ جہاز کے یعنی مارشل کے جہاز کے کپاس ٹوٹ چکے ہیں لیکن ہمارے اس جاہ شدہ

"نکل گئی۔" تو کیا۔"

"ہاں۔ زندگی کے لئے جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ کاش جہاز پر ہمارا قبضہ ہو جائے۔ اور ہم بے لے کر روانہ ہو سکیں۔ ہم کپاس اور بچا ہوا ایندھن مارشل کے سفر کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہوگا مسز زنگر۔"

"جب زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے تو زندگی کی بازی لگائی پڑتی ہے۔" میں ہر خطرہ مول لیتا پڑے گا۔"

"لیکن مسز زنگر۔"

"میرے ذہن میں کچھ ہے۔"

"کیا؟"

"تم نے مجھے پوری کہانی سنائی ہے۔ میں نے اس سے ہی سے ایک کروڑ انتخاب کیا ہے جو ہمارے کام آسکتا ہے۔"

"کون۔"

"وہ فرانسیسی افسر۔" زنگر نے کہا اور دم دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف ہماری کہانی سن کر زنگر نے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا تھا جو سب سے زیادہ گارمیاں سے نفرت کرتی تھی اور جو سب سے زیادہ کارآمد تھی۔ یعنی ایک چھوٹے سے گروپ کے ساتھ اسلحہ چلانے کی ماہر۔

"عسکری نے پر جوش لہجے میں کہا۔ "زبردست انتخاب۔" مسز زنگر۔

"وہ مان بھی جائے گا کیونکہ ایک فرض شناس افسر ہے۔"

"سو فیصدی امکانات ہیں۔"

"مگر مجھے خوشی ہے کہ تم لوگ مجھ سے متفق ہو۔"

"اب تمہیں دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ فرانسیسی افسر کو یہاں لے آؤ۔ میں اس سے ملاقات کر کے منصوبہ بندی کروں گا۔"

"میرے خیال میں یہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"تمہیں علم ہے کہ مارشل کون سے راستے سے

”اوه پہلام کی موت کتنی ناگہانی اور پراسرار تھی! میں اسے زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔“ کپتان غم زدہ لہجے میں بولا اور خلاء میں گھورتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں پھر یکایک سنبھل کر بیٹھ گیا اور جھرجھری لے کر بولا۔

”کیا آپ پہلام کی پراسرار موت کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ سننا پسند کریں گے؟“

”کیوں نہیں؟ مجھے اسی لئے تو تمہارا انتظار تھا۔ تم جانتے ہو پہلام میرا اکلوتا بیٹا تھا، میں نے اس کے مستقبل کے متعلق کئی منصوبے بنائے تھے، مگر اس کی موت کے بعد میرے سارے خواب کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئے۔ اب صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اس کی موت کے صحیح اسباب معلوم ہو جائیں تاکہ یہ وہم نہ رہے کہ میرا نحت جگر کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔“

کپتان نے آنسو پونچھے ہوئے کہا۔

”تو سنئے! سرجون ہم تنہا گوش ہو کر سننے لگا۔ کپتان گویا ہوا! پہلام کی موت سے تین دن پہلے کا ذکر ہے کہ میں پہلام اور ہمارے چند ساتھی جرمن سپاہیوں کا اندھا دھند تقاب کرتے ہوئے اتحادی مورچوں سے بہت دور نکل گئے اور جب ہمیں اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو اس وقت شام ہو چکی تھی اور ہم ایک ایسے گھنے جنگل میں کھڑے تھے جہاں سرشام ہی اندھیرا پھیل چکا تھا اور درندوں کی پراسرار نقل و حرکت جاری تھی۔ فضا کچھ ایسی متعفن اور غم آلود تھی کہ سانس تک لینا محال تھا۔ ہم نے جنگل سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے، کیونکہ راستے دشوار گزار ہونے کے علاوہ اتنے پر پیچ اور غیر انوس تھے کہ ہمارے لئے ان پر چلنا بڑا دشوار تھا۔

رات ہوتے ہی درندوں کی تدم مزاحی میں اضافہ ہو گیا اور وہ مردم آزادی پر کمر بستہ ہو گئے۔ ہمیں مجبوراً کئی بار گولی چلانا پڑی۔ سب سے پہلی گولی کا نشانہ ایک بھیڑ یا نا جھواڑوں کی آڑ میں نہ جانے کب سے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہمیں کئی بار شک بھی ہوا کہ کوئی درندہ گھات لگائے ہمارے ساتھ ساتھ حرکت

کر رہا ہے، لیکن وہ ہر بار ہماری نظروں سے بچ نکلا۔ ایک بار میں اپنے ساتھیوں سے پچھڑ گیا۔ اس نے جھاڑیوں پر سے جست لگائی اور میری راہ میں جا کر ہو کر گرنا لگا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اسے ابھی تک دیکھ نہیں سکا تھا۔ میں نے اسے نازیوں کا جاسوس ہی سمجھ کر گولی مار دی گولی نکلنے ہی وہ سات آٹھ فٹ اور پراچھلا اور جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس اثناء میں میرے ساتھی مجھ سے آگے بڑھے، ہم نے نازیوں کی روشنی میں اسے دیکھا، تو لرزہ کر رہ گئے۔ وہ سیاہ رنگ کا انسانی خونخوار مجرب یا تھا جس کی لمبائی چوٹ اور بلندی چار فٹ سے کسی طرح کم نہ تھی۔“

کپتان کا رن سانس لینے کے لئے رکا، تو سرجون نے عالم اشتعال میں پوچھا۔

”بھڑکیے کو دیکھ کر پہلام نے کیا کہا تھا؟“

”اس وقت خیال آرائی کی فرصت کسے تھی؟ ہم تو جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لینا چاہتے تھے۔“

”اچھا، پھر کیا ہوا؟“

”اس واقعہ کے بعد ہم نے وہ راستہ چھوڑ دیا اور انہیں سست گھوم گئے۔ اب ہم نسبتاً چوڑے راستے، چل رہے تھے۔ اس طرف جنگل کم گھٹان اور اظہار خوف نظر آتا تھا۔ ابھی ہم نے مشکل سے نصف میل کا سفر طے کیا ہوگا کہ اچانک پہلام ٹھٹھکا اور سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ دیکھئے وہاں کوئی خطرہ ہے۔“

ہماری نگاہیں سامنے کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر سرخ رنگ کے درندوں نقطے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ میں نے راتقل سیدی کی، لیکن فائر کرنے سے پہلے ہی وہ نقطے غائب ہو گئے اور اس کے فوراً بعد ہی ہمارے بائیں جانب جھاڑیوں میں نامعلوم ہی سرسراہٹ سنائی دی۔ ہم ادھر متوجہ ہوئے تو پہلام تڑپ کر چیخے مڑا اور دوسرے اس کی راتقل کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔ ہم حیرت زدہ ہو کر پلٹے اور یہ دیکھ کر وہک

میں کہ ہم سے چند قدم دور ایک خوفناک چیتا خاک زخون میں لوٹ رہا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کی طرح بجتی ہوئی آنکھیں زندگی سے محروم ہوتی جا رہی تھیں۔“

سرجون نے عالم حیرت سے چوکتے ہوئے کہا۔

”مجھے پہلام سے یہی امید تھی۔“

”جی ہاں، آپ کا بیٹا واقعی نڈر، بہادر اور بے خوف نوجوان تھا۔“

”پھر کیا ہوا کپتان؟“

”کپتان نے بھڑکی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”رات گئے گئے ہمارے حوصلے جواب دے گئے اور ہم درختوں پر پناہ لینے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن جیسے ہی ہم درختوں کی طرف بڑھے، اوپر بیٹھے ہوئے بندروں کی چیخ و پکار نے آسمان سر پر اٹھالیا اور ہم دہشت زدہ ہو کر جہاں تھے وہیں رک گئے۔“

اچانک دو تین بندر درختوں پر سے گرے اور ٹوٹ پوٹ کر ختم ہو گئے۔ موت کی یہ ناگہانی صورت ہمارے لئے بالکل نئی اور غیر متوقع تھی۔ ہم نے گھبرا کر تار بھیں رہیں کر لیں۔ درختوں کے تنوں پر بندروں کی آواز زیادہ تھی۔ ان پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے اڑھٹے بل کھارہے تھے اور جو بھی کوئی بندر کسی اڑدھٹے کی لپیٹ میں آ جاتا، بندر کی ہڈیاں جھج جاتی تھیں اور اڑدھٹے کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ نیم جان ہو کر نیچے گر پڑتا۔ زندگی اور موت کا یہ عجیب کھیل اتنا روح فرسا اور خوف ناک تھا کہ ہم اس کی تاب نہ لا سکے اور ہم گھٹنے کی طرف پڑنے لگے۔“

”میں کا زب کے وقت ہم جنگل کے وسط سے نڈر رہے تھے کہ ہمیں ایک دو منزلہ مکان نظر آیا۔ ہم کچھ سوچے بغیر اس میں داخل ہو گئے۔ مکان بالکل خالی تھا۔ ہم سب جنگل منزل میں لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد پہلام اندر ایک شکستہ میز کی طرف دو اور دوسری منزل پہنچ گیا۔ ہمیں اس کے چلنے بھرنے کی آواز صاف سنائی۔ ہم نے اس کی آواز سے حیرت زدہ ہو کر کوئی چیز تلاش کر رہا ہے، میں نے میز کی طرف

جا کر دیکھا، وہ بار بار دیا سلائی جلا رہا تھا، میں نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟ پہلام!“

”کچھ نہیں، صرف ایک پرائیوٹ ہے۔“

وہ یہ کہہ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا اور پھر خود بخود بولا۔ ”کپتان! صندوق میں ایک نہایت ہی خوبصورت سانپ بند ہے، اگر دیکھنا چاہتے ہو تو حاضر کروں۔“ سانپ کا نام سننے ہی میرا ہاتھ ٹھکا اور میں نے ڈانٹ پلاتے ہوئے پہلام کو پیچھے آنے کا حکم دیا، لیکن وہ بدستور ہستار ہا اور میری پریشانی بڑھتی گئی۔

جب پہلام دروازے سے نمودار ہوا تو وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی کمر کے گرد بھور بھور گنگ کا ایک چمکدار سانپ لیٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میری کھٹی بندھ گئی اور باقی تمام ساتھی میری آواز سن کر بیدار ہو گئے اور میز کی طرف آگئے پھر کسی نے میرا ہاتھ اڑاتے ہوئے کہا۔ ”کپتان! ذرا غور سے دیکھو۔“

میں نے غور سے دیکھا، وہ سانپ نہیں تھا، بلکہ چوڑے کی نہایت خوبصورت چینی تھی۔ پہلام نے ہمیں یوں گھورتے دیکھ کر اپنے سر کو اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور درندے کی طرح غرا کر ہم پر کچھ ایسی نفرت انگیز اور پراسرار نظر ڈالی کہ ہم کانپ کر پچھے ہٹ گئے۔

”کیا اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی؟“ سرجون نے چونک کر پوچھا۔

”جی ہاں! غضب کی قہر آلود نظریں تھیں اس کی۔“ کپتان نے جھرجھری لیتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں۔۔۔ کپتان! کیا تم اس کی نقل اتار سکتے ہو۔؟“

”جی۔۔۔ جی کیوں نہیں، دیکھئے۔“

کپتان لپک کر میز پر بیٹھ گیا اور اس نے اتنی خوفناک شکل بنا کر سرجون کو گھورا کہ سرجون کے سینے چھوٹ گئے، اس نے ڈرتے ڈرتے دیکھا، شدت جذبات سے کپتان کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کے لئے میز کے کنارے کو تھام رکھا تھا۔

کپتان نے میز سے اتر کر کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”بس یہی سمجھئے کہ پہلام کی حالت اس دیوانے کتے کی سی تھی جو کسی پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو۔ لیکن فطری کمزوری کے زیر اثر ٹیل کھا کر رہ جائے۔“

”سمجھا..... دیوانے کتے کی مثال خوب رہی، اچھا، پھر کیا ہوا؟“ سرجون نے پوچھا۔

کپتان نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پہلام کو بلانے کی کوشش کی، لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چند منٹ کے بعد وہ اٹلے پاؤں نیچے اترنے لگا۔ اس کا چہرہ ہماری طرف تھا اور ہم یوں محسوس کر رہے تھے جیسے پہلام انسان نہیں، کوئی درندہ ہے جو نہایت محتاط انداز میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے اور موقع ملے ہی ہم میں سے کسی پر ضرور چھٹ پڑے گا۔ یقین کیجئے اس میں انسانوں جیسی ہمیں کوئی بات نظر نہ آتی تھی۔“

ہم اسے خاموشی سے دیکھتے رہے، وہ نیچے پہنچنے ہی اچھلا اور ہماری طرف دیکھا ہوا اس طرح دروازے کی جانب بڑھنے لگا کہ اس کا منہ ہماری طرف تھا اور پشت دروازے کی طرف۔ اب آپ خود اندازہ کیجئے، کبھی انسان بھی ایسے چلتا ہے۔ جونہی اس کی پشت دروازے سے ٹکرائی، اس نے پیٹنی کو ہاتھوں سے چھوڑے بغیر چلتی کھولنے کی کوشش کی اور جب کامیاب نہ ہوا تو کواڑوں پر ایسی لات ماری کہ کواڑ چرچر کر کھل گئے۔ وہ دروازے میں ٹھہر کر ہمیں دیکھا رہا اور جب ہم نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے برسنے لگے۔ باجیس پھیل کر تینوں تک آگئیں، تنھے پھول کر خورخی آواز پیدا کرنے لگے اور وہ غرا کر ہماری طرف بڑھا۔ ہم سب سمٹ کر ایک طرف ہو گئے۔ وہ چیخے ہٹا اور ایک دلوراش چیخ مار کر باہر نکل گیا۔ ہم اس کے پیچھے بھاگے لیکن وہ چھاڑیوں کو پھلانگتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔“

کپتان خاموش ہو گیا اور اس نے آتشہا کی طرف دیکھا۔ شعلے ابھی تک رقصاں تھے۔ اس نے جب سے سگریٹ نکالا اور سلگنے لگا تو ہم اسے ہونٹوں میں دبا کر سر جھکا لیا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ سرجون نے

اسے خاموش دیکھا تو تپ کر کہا۔

”کپتان! میں اپنے تخت جگر کا انجام سننے کے لئے بے تاب ہوں۔“

”میں نے جو کچھ دیکھا، آپ شاید اس پر یقین نہ کریں۔“ کپتان نے کسمساتے ہوئے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ سرجون کی جذبات سے مغلوب آواز ابھری۔

کپتان نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلام کو غائب ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ کافوق تھا۔ اتحادی فوجیں، نازی کمپ پر حملے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ میں بہت مصروف تھا۔ سارجون ہاروے نے میرے قریب آ کر آہستہ سے کہا۔ ”پہلام وہاں ہے۔“

”کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں ہے؟“ سارجون نے رکتے رکتے جواب دیا۔ ”وہ..... وہ..... وہاں جنگل کے بالکل نزدیک، وہ ایک درخت سے ٹیک لگے بیٹھا ہے۔ آئیے آئیے جلدی چلیے۔“

جب ہم وہاں پہنچے پہلام گھنٹوں پر سر رکے ہل بیٹھا تھا جیسے کوئی درندہ گھات میں بیٹھا ہو۔ اس کے سامنے جرمن سپاہیوں کی پانچ لاشیں نیم دائرے کی شکل میں پڑی تھیں اور وہ انہیں مسلسل گھور رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پہلام کے شانے پر ہاتھ رکھا، وہ بالکل بے جان تھا۔ میں نے اس کے جسم کو بغور دیکھا، اس کے جسم پر ہر جگہ نشان تک نہ تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ دشمن کی گولیاں اس کی موت کا باعث نہیں بنیں۔ بلا ارادہ میں نے جرمن سپاہیوں کی لاشوں کی طرف دیکھا، تمام لاشیں گردوں پر سے اس بری طرح چمکی ہوئی تھیں اور ایسے لگتا تھا جیسے کوئی درندہ انہیں بیدردی سے بھنبھورتا رہا ہے۔ میں وہشت زدہ ہو کر پہلام کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ اس کے ہاتھ اور منہ گاڑھے خون سے لٹ پٹ تھے۔ میں سمجھ گیا کہ جرمن سپاہیوں کو اس نے شکار کیا۔

اودہ مائی گاڈ! کتنا بھیاںک تھا وہ منظر میرا دل

اندھری اندر بیٹھے لگا، میں نے پہلام پر آخری نظر ڈالی۔ اس کی چمکدار آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں، وہ سچ کچھ درندہ نظر آتا تھا۔ مجھ پر کچھ طاری ہو گئی اور..... اور.....“

پہر کپتان کی آواز ڈوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے تپا ہٹے ہوئے ہی سرجون نے سوال کیا۔

”کپتان! اس پر اسرار پٹنی کا کیا ہوا؟ کچھ اس نے متعلق بھی تو بتاؤ۔“

”کیا کہا؟ پیٹنی..... جی، ہاں، وہ میرے کٹ بک میں موجود ہے۔ وہ پہلام کی لاش کے قریب پڑی تھی اور نہ جانے کس خیال کے تحت میں نے اٹھایا تھا۔“

”خوب تم نے بہت اچھا کیا۔ ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔“ سرجون نے مضطرب ہو کر کہا۔

کپتان نے ہچکچاتے ہوئے کٹ بیک کھولا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی پیٹنی نکال کر سرجون کے سامنے رکھ دی۔ سرجون نے کاغذ کو چپے ہوئے پیٹنی کو غور سے دیکھا۔ اس کی اوپر ولی سطح پر کسی نامعلوم زبان کے الفاظ نقش تھے۔ سرجون نے میز پر پڑا ہوا محجب شیشہ اٹھایا اور اس کی مدد سے پیٹنی کے معائنہ میں منہمک ہو گیا اور جونہی اس کا منہمک ختم ہوا، وہ پیٹنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”کپتان! جانتے ہو یہ کیا ہے؟“

”جی، یہ چمڑے کی پیٹنی ہے۔“

”نہیں، تم کچھ نہیں جانتے کاش۔“ سرجون غمرہ مکمل نہ کر سکا۔

”پھر آپ ہی کچھ بتائیے۔“ کپتان نے اندر مائی گاڈ کی آواز دہرائی۔

”بتا ہوں، لیکن پہلے اس پیٹنی کو اٹھا کر آتش سے ذرا دلو۔“

کپتان پیٹنی اٹھانے کے لئے جھکا تو سرجون نے بلندی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ روک لئے اور آٹھوں کو کھینچتے ہوئے انتہائی رازداری سے کہا۔

”دونوں ہاتھوں سے نہیں، صرف ایک ہاتھ

سے اٹھاؤ اور وہاں پیٹنی کو ایک ہی سرے سے اس طرح پکڑو کہ اس کا دوسرا سر اٹھارے بدن کے کسی حصے سے مٹس نہ ہو، ورنہ نتائج اتنے سنگین ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

سرجون کی تشویش انگیز ہدایات نے کپتان کو غصے میں ڈال دیا۔ وہ پیٹنی کو ہاتھ نہ لگانے کا فیصلہ کرنے ہی والا تھا کہ اس کی ہم جو طبیعت نے جوش مارا، اور اس نے پیٹنی کو اٹھا لیا۔ آتش وان کی طرف جاتے ہوئے وہ بری طرح لڑکھڑاہتا تھا، اس نے سنبھلنے کی کوشش کی اور اس نکشش میں پیٹنی کا آزاد سر اس کے دوسرے ہاتھ سے چھو گیا، وہ جھرجھری لے کر رکھار کا پیٹنی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کتے کی طرح غراتا ہوا ایڑیوں پر گھوم گیا۔ اب وہ اٹلے قدموں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس پر پہلام کی سی کیفیت طاری تھی۔ کپتان میں ورنہ مگنی کے آثار دیکھ کر سرجون نے اسے پیٹنی چمک وینے کی ہدایت کی۔

کپتان نے خوف ناک چیخ ماری اور دانت پیستے ہوئے اسے نفرت و تحارت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف ناک غیظ و غضب مترشح تھا۔ پھر وہ اچھلا اور خونخوار درندے کی مانند تھنوں اور منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا سرجون پر جھپٹ پڑا۔ سرجون نے خوف زدہ ہو کر میز پر سے محجب شیشہ اٹھایا اور پوری قوت سے کپتان کے منہ پر دے مارا۔ ضرب کی شدت اور درد کے احساس نے کپتان کو احساس بخشد کر دیا۔ پیٹنی اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور جا پڑی اور وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

اسی لمحے دروازے کا پردہ اٹھا اور سرجون کے ملازم نے اندر داخل ہوتے ہوئے ہم کو پوچھا۔

”سر کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ سرجون نے ہانپتے ہوئے بے توجہی سے جواب دیا، لیکن فوراً ہی چونک کر کہا۔

”جروں!“

”جی!“

”چھٹا لاؤ۔“



ہندو روح

ساجدہ راجہ - ہندواں سرگودھا

ہوفیلی پہاڑی پر سے اچانک بچے کا پاٹوں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا جڑی تیزی سے نشیب کی طرف اٹے لگا مگر نیچے کھڑے نوجوان کی اس پر نظر پڑی تو وہ اڑتا ہوا بچے تک پہنچا اور بچے کو اس نے یوں پکڑا جیسے کہ وہ ایک کھلونا ہو۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ بعض روہیں بھی سالہا سال سرگرداں رہتی ہیں۔ ایک دلکش کہانی

گازی اونچے نیچے برفیلے راستوں پر آگے بڑھنے کے یومی جاری تھی موسم کی پہلی برف باری ہو چکی تھی اور آئندہ بھی متوقع تھی لیکن فی الحال مطلع صاف تھا۔

سڑکوں سے برف صاف کر کے ٹریفک کو بحال کر دیا گیا تھا لیکن سڑکیں گیلی اور پھسلن اب بھی موجود تھیں اس لئے کارورمیانی رفتار سے چلتی جاری تھی اس

کے گا۔

یہ سنتے ہی کپتان نے خوف زدہ نظروں سے مہ جون کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہلکا سا منظر لہرایا جب سرجون نے چٹی کو آتش دان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا تھا۔

”فکرمات کرو میرے دوست! اب تو وہ چٹی جل کر راکھ ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حکایت کا آخری حصہ صرف اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ لوگ اس شیطانی چیز کو ضائع نہ کریں۔“

کپتان یہ سن کر آتش دان کے قریب جا کھڑا ہوا اور حیرانی سے بولا۔

”سرجون! ذرا ادھر آ کر دیکھئے..... چٹی ت ابھی تک شعلے نکل رہے ہیں۔“

سرجون مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور کپتان کے قریب چلا گیا۔ آتش دان میں چٹی کا بڑا حصہ جل چکا تھا۔ صرف اس کا ایک سر باقی تھا اور اس سے ہلکے نیلے رنگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ چٹی سے اب تک آدازس آ رہی تھیں، لیکن اب ان آوازوں نے کسی غور کی سسکیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عورت نوحہ کر رہی ہے۔

”آخر میں نے اس منحوس چٹی کا خاتمہ کری دیا۔“ سرجون نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ پیچھے کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ چٹی سے نکلنے ہوئے شعلوں میں سے ایک زبان سی لگی اور سرجون کے سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خوف سے کپتان کا سارا جسم جھمپا ہو گیا اور وہ چکر آ کر فرش پر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو سرجون کا بے چہنہ جسم فرش پر پڑا تھا۔ اس نے آتش دان کے پاس جا کر دیکھا۔... آگ سرد ہو چکی تھی۔ چٹی جل چکی تھی اور اس کی راکھ دکھائی دے رہی تھی..... حکایت کا آخری حصہ بھی مکمل ہو چکا تھا۔



”چمکا!“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، ہاں چمکا، آتش کیز، سمجھے“ سرجون نے آتش زیر پا ہوتے ہوئے کہا۔

جڑوں نے خوف زدہ نظروں سے کپتان کی طرف دیکھا چمکا سامنے رکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

چمکا نے کمر سرجون پرانی سی کرسی پر بیٹھا ایک ڈاڑھی کی ورق گردانی کر رہا تھا پھر وہ مدھال قدموں سے اٹھا اس نے چٹی کو جتنے سے پکڑا اور آتش دان میں ڈال دیا۔ شعلے یکدم بلند ہو گئے اور کمرہ عجیب و غریب آوازوں سے گونج اٹھا۔ پہلے کسی درندے کے غضب ناک ہو کر غرانے کی آواز آئی، پھر انسانی قہقہوں، اس کے بعد سسکیوں اور اذیت ناک شور پیدا ہوا، پھر آخر میں ایسی ولد زنجیں بلند ہوئیں کہ کپتان نے ہڑبڑا کر سرجون کی طرف دیکھا اور بولا۔

”خدا کیلئے صاف صاف بتائیے یہ کیا راز ہے؟“ سرجون نے ایک نظر سے رنگ بدلتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھا اور کرسی سے ٹپک لگاتے ہوئے بولا۔

”آج سے بیس سال قبل افریقہ کے دشوار گزار جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے ایک حکایت سنی تھی۔ اس وقت میں نے اسے ایک دیوانے کی بڑے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، لیکن آج معلوم ہوا کہ اس کا ایک لفظ صدائت پوٹتی تھا۔ میرے بوڑھے افریقی ملازم نے بتایا تھا کہ“ اس کی بستی کے سردار کے پاس قدیم زمانے سے چڑے کی ایک ایسی چٹی ہے جسے

جھوٹے ہی انسان خونخوار درندہ بن جاتا ہے۔“ بوڑھے کے بیان کے مطابق۔۔۔ یہ چٹی کئی نسلوں سے اس سردار کی ملکیت ہے اور اسے ایک بہت پرانے صندوق میں بند کر رکھا ہے۔“

”آخراں سردار نے اس خطرناک چٹی کو سنبھال کر کیوں رکھا ہوا تھا؟“ کپتان نے مضطرب ہو کر سوال کیا۔

”ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اس چٹی کو ضائع کرنے کی کوشش کرے گا، وہ کبھی زندہ نہیں بچ

علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی شہنشاہ علاقہ تھا اور سردیوں کے موسم میں ہونے والی برف باری سونے پہ سہاگہ۔۔۔۔۔

ایک طویل عرصہ پہلے قصبے کا نام آس لینڈ پڑ گیا تھا جو ایک سیاح نے لکھا جو اس جگہ سردیوں میں ہونے والی برف باری دیکھنے آیا تھا۔ وہ سردیوں سے کچھ پہلے اس علاقے میں آیا تھا، اس کا خیال تھا کہ ایک دو مہینے بعد برف باری رک گئی تو وہ واپس آ جائے گا لیکن مسلسل تین ماہ برف باری نے تمام راستے بلاک کر دیئے تھے جس کی وجہ سے اسے تین ماہ وہیں رکتا پڑا۔ اتنی بڑی مدت اس نے وہاں گزاری اس دوران جب بھی برف رکتی وہ علاقے کی گشت پہ نکل جاتا۔ وہ گرم علاقے کا رہنے والا تھا اس لئے اتنی پڑی برف کی وجہ سے اس نے اس قصبے کو آس لینڈ کہنا شروع کر دیا اس کی دیکھا دیکھی تمام لوگوں نے بھی اس قصبے کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

حالانکہ پہلے اس قصبے کا نام کچھ اور تھا۔ روزی کے والدین شروع سے اس علاقے میں نہیں رہتے تھے بلکہ انہیں یہاں آئے چند سال ہی ہوئے تھے اس وقت روزی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دوسری بار مائیکل کے ساتھ اس علاقے کا رخ کر رہی تھی پہلی بار جب جنگی دو سال کا تھا اور دوسری بار بار۔۔۔۔۔ مائیکل اس موسم میں ادھر آنے کا بالکل روادار نہ تھا ایک تو وہ اتنے شہنشاہ علاقے میں رہنے کا عادی نہیں تھا دوسرا اس کا خیال تھا کہ جنگی بیمار نہ پڑ جائے اور انہیں راستے میں کوئی مشکل بھی پیش آ سکتی ہے لیکن روزی بھندھی کی کہ وہ اسی موسم میں ادھر جائے گی کیونکہ اسے برف باری دیکھنے کا بہت شوق تھا اور اپنے اسی شوق کی وجہ سے اس نے ادھر کا ارادہ کیا تھا۔

اس وقت سہ چہرے کوئی تین بجے ہوں گے جب آسمان پر بادل نمودار ہوئے شروع ہو گئے۔ سورج چھپ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ مٹھکڑ گھٹائیں آپس میں مل گئیں اور سہ چہرے میں ہی رات کا سماں پیدا ہو گیا

جکی کڑی، بادل گرے، سردیوں میں درختوں اور پہاڑوں سے ٹکرا کر عجیب بھیاں تک سا شور پیدا کرنے لگیں تو مائیکل کے چہرے پر کھردرے کے سائے پھیل گئے جبکہ روزی بھی کم پریشان نہیں تھی۔ اگر بارش یا برف باری شروع ہو جاتی تو انہیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا اس کا اندازہ انہیں بہت اچھی طرح تھا۔ شکر تھا کہ جنگی سور ہاتھ اور جکی کی کڑک اور بادلوں کی وحشت ناک گرج سے وہ کافی خوف زدہ ہو سکتا تھا۔

مائیکل کو وہ رہ کر روزی پر غصہ آ رہا تھا جس نے اس خطرناک موسم میں ادھر آنے کی ضد کی تھی۔ پہلے تو وہ چپ چاپ بیٹھا رہا لیکن جوں جوں جنگی برف باری شروع ہوئی تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔۔۔۔۔ اور وہ روزی پر برس پڑا۔

”اب دیکھو! اپنی ضد کا نتیجہ؟ میں نے کتنی بار منع کیا تھا کہ اس موسم میں وہاں جانا بہت خطرناک ہو سکتا ہے لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔ اب برف باری بھی شروع ہو گئی ہے اور ابھی ایک گھنٹے کا سفر باقی ہے اگر گاڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا یا برف میں پھنس گئی تو ہمیں کتنی مشکل ہو سکتی ہے؟“

اس کی باتوں کے جواب میں روزی خاموش رہی لیکن اس کی کٹورا آنکھیں آنسوؤں سے لالاب مگر گھٹیں اور وہیں سے آئے مائیکل مات کھاتا تھا۔

”اوکے۔ اوکے۔ پلیز! اب رو مت شروع کر دینا تم خود ہی دیکھو ہمارے موسم کی صورتحال؟ اگر برف باری اسی تیزی سے جاری رہی تو کیا ہم سفر جاری رکھ سکیں گے۔“ مائیکل نے باہر تیزی سے گرتی برف کی طرف اشارہ کیا جو پر زور ہواؤں کی وجہ سے اور بھی خطرناک لگ رہی تھی۔

”تو اس میں میرا کیا قصور؟ کیا میں نے برف کو کہا ہے کہ وہ ابھی گرے۔ یا موسم میرے تابع ہیں؟ تم ساری باتوں کا الزام مجھے کیوں دے رہے ہو۔“ روزی الٹا اس پر برس پڑی اور جواباً مائیکل نے خاموشی اختیار کر لی کیونکہ وہ بات کو قبول نہیں

دینا چاہتا تھا۔ اس علاقے کی سب سے پرانی باسی ایک بوڑھی عورت کیٹ ہاشن تھی جو اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی پوری دنیا میں اس بیٹے کے علاوہ اس کا کوئی نہیں تھا۔ اس کی تمام امیدوں کا مرکز۔ بڑھاپے کا واحد سہارا۔۔۔۔۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی اس کے شوہر کا کافی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور وہ خود بھی ستر کے لیے میں تھی لیکن اس عمر میں بھی وہ کافی چاق و چوبند اور قابل رشک صحت کی مالک تھی۔

اس کی زندگی کے ستر سالوں میں اس علاقے میں کافی وضع و تبدیلی آئی تھی لیکن اس نے کبھی اس علاقے کو چھوڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ اس کے بیٹے کا نام رچرڈ تھا اور اس کی عمر تیس سال تھی وہ کافی خوبصورت ہونے کے علاوہ کافی بڑا اور دردمند دل رکھنے والا بھی تھا اور وہ اس کا ہر حکم ماننا خود پر فرض سمجھتا تھا۔

اس دن مطلع صاف تھا سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا سردیاں قریب تھیں اور سب لوگ اسی فکر میں تھے کہ برف باری شروع ہونے سے پہلے پہلے وہ لکڑیوں اور کھانے کے اشیاء کا ذخیرہ کر لیں کہ انہیں سردیوں کے چند ماہ کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

رچرڈ بھی اسی سلسلے میں پہاڑوں پر آیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ لکڑیاں کاٹ کے ذخیرہ کر سکے۔ وہ پہاڑ چھوٹے بڑے درختوں سے بھرے پڑے تھے اس لئے لکڑیوں کے بارے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی بس انہیں کاٹ کر کھانے میں منت لگتی تھی لیکن ایسے خطوں میں بسنے والے صحت کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسے قصبے چونکہ شہروں سے کافی فاصلے پر ہوتے ہیں اس لئے حکومت ان پر اتنی زیادہ توجہ بھی نہیں دیتی۔ دوسرا پہاڑی علاقہ اور نشوں کے حساب سے بڑی برف۔۔۔۔۔

اس وجہ سے ان علاقوں میں گیس وغیرہ کی سہولت نہیں ملتی جتنی کہ آگے بھی چند سال ہوئے تھے اس لئے ان علاقوں کے کیسوں کو اپنا بندوبست خود کرنا پڑتا تھا سردی

سے بچنے کے لئے وہ لوگ لکڑی جلا کر گزارہ کرتے تھے۔ اس لئے برف باری کے موسم کے لئے ان کا سب سے اہم کام لکڑیوں کا حصول ہوتا تھا۔

رچرڈ کے ہاتھ میں کلبھائی تھی چند چھوٹے چھوٹے درختوں کی شاخیں کاٹ کر اس نے ہنڈل بنا کر رکھا اور پھر بڑی لکڑیوں کے حصول کے لئے وہ پہاڑی کی ڈھلوان کے قریب آگے بڑے درخت پر چڑھ گیا چند شاخیں کاٹنے کے بعد اس نے ایک بڑی سی شاخ کا انتخاب کیا اور کلبھائی کے پے درپے وار کرنے شروع کر دیئے شاخ آہستہ آہستہ ٹکڑی ٹکڑی جا رہی تھی۔

لیکن رچرڈ کی بد قسمتی کہ وہ جس شاخ کو کاٹ رہا تھا خود بھی اسی پر بٹھا تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا جب اسے خبر ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی شاخ مکمل طور پر ٹکڑی ہو چکی تھی اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔۔۔!

اس کی چیخیں پوری واوی میں پھیل گئیں اور وہ پہاڑی سے نیچے گرتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

موسم بہت زیادہ خطرناک ہو چکا تھا ان کی کار چوٹی کی رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ کیونکہ برف باری کی وجہ سے سڑک مکمل طور پر برف سے ڈھک چکی تھی اور مائیکل کو ڈرائیونگ میں شدید مشکل پیش آ رہی تھی برف بہت تیزی سے گرتی رہی اور تیز ہوا کی وجہ سے کار کی وینڈ اسکرین کے پار کافی دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ مائیکل کی کوشش تھی کہ جلد از جلد آس لینڈ پہنچ جائے کیوں کہ اگر وہ رکتے یا برف یوٹی گرتی رہتی تو وہ یہاں پھنس سکتے تھے اور اس صورت میں انہیں رات اسی کار میں گزارنا پڑتی جو کسی صورت ممکن نہیں تھی۔ ابھی آدھے گھنٹے کا سفر باقی تھا جو انہیں نبھانے کتنے گھنٹوں پر مشتمل لگ رہا تھا۔

”مائیکل میرا خیال ہے گاڑی لکڑی کر کے برف کے رکنے کا انتظار کرتے ہیں، ورنہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔“ روزی نے شیشے کے باہر دیکھتے ہوئے کہا

ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا تو وہ بھی غور مند ہو گئے۔

”ہم نے تو روزی کو خود منع بھی کیا تھا کہ اس موسم کا کوئی بھر و نہیں لیکن ہماری سستی کب ہے؟“

”خیر خداوند کالاکھ لاکھ شکر کہ تم لوگ خیریت سے پہنچ آئے ورنہ ہماری تو سانس سولی پر لگی ہوتی تھی۔“ روزی کی ماں نے مائیکل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو جواباً مائیکل نے اس کی کسی بات کی تردید نہیں کی۔

”نانو پتہ ہے راستے میں کیا ہوا تھا؟“ جسکی جو پہلے توئی وی کی طرف متوجہ تھا پھر اچانک اپنی نالو کی طرف متوجہ ہو گیا اور نانو سے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تو جواباً وہ بہت جوش سے بولا۔

”نانو جب ہماری کارسزک نے گزر رہی تھی تو پیچھے سے اتنی زیادہ برف گری کہ مٹی بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئیں جبکہ میں تو ڈرا بھی نہیں۔“

”نالو مٹی تو مجھ سے بڑی ہیں پھر یہ کیوں ڈر گئیں؟“ جسکی نے اپنی معصوم زبان میں نانو سے پوچھا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ و دز گئی اور روزی جھینپ کر اپنے ڈیڑھ کی طرف دیکھنے لگی جو بہت اونچی آواز میں بھر رہے تھے۔

”ڈیڈ آپ تو یوں نہ بنیں۔ آپ کو تو پتہ ہے میں بچپن سے ہی اس طرح کی چیزوں سے ڈرتی ہوں۔“ روزی نے لاڈ سے منہ پھلاتے ہوئے اپنے ڈیڑھ سے کہی تو وہ مسکرا کر تھدقین انداز میں گردن ہلانے آگے۔

☆.....☆.....☆

رجہ ڈانی ماں کے ساتھ شروع سے ہی اس قصبے میں رہتا تھا۔ اس قصبے میں بہت بار قدرتی آفات آئیں۔ تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے پھٹنے والے آتش فشاں نے آدھے قصبے کو لٹک لیا تھا اس علاقے میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا واقعہ تھا۔ جو زندہ بچ گئے تھے انہوں نے پھر بھی اس قصبے کو چھوڑنا گوارہ نہ کیا۔ زندگی آہستہ آہستہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس آتی گئی لوگ اس سانحہ کو بھولے تو نہیں تھے لیکن اس کی سفاکت کسی حد تک معدوم ہو گئی

تھی پھر دوسری نسل آئی چونکہ انہوں نے وہ سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں تھا صرف اپنے بڑوں کی زبانی سنا تھا اس لئے وہ اس کی ہولناکیت سے واقف نہیں تھے ہاں اتنا ضرور تھا کہ انہوں نے اس کے نشان ضرور دیکھے تھے اس لئے وہ سوچ سکتے تھے کہ وہ واقعہ کتنا ہولناک ہوگا جب چنگھاڑتا ہوا لاوا پہاڑوں سے بہتا ہوا قصبے کی طرف آتا ہوگا تو خوف و ہراس سے لوگ یقیناً پتھر کے ہو گئے ہوں گے انہیں بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ وہ بہت خوش قسمت تصور ہوئے جو بچ گئے تھے۔

پھر تقریباً سو سال بعد ایسا ہولناک واقعہ ہوا جس نے سنسنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا وہ اس قصبے میں پھر ایک ایسی آفت آئی جس نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اس دن لوگ معمول کے مطابق کاموں میں مصروف تھے ایک دن پہلے ہونے والی برف باری نے سردی کی شدت میں خاصہ اضافہ کر دیا تھا لیکن ان علاقوں میں رہنے والے لوگ ایسے موسم کے عادی ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول تھے۔ آسمان پر چھائے کالے گھٹکھور بادل اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ آج پھر برف باری ہوگی۔

اچانک لوگوں کو محسوس ہوا کہ سردی کی شدت میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا ہے ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائے تھے کہ سردی کی اتنی شدید لہر آئی کہ وہ وہیں جمند ہو گئے۔ چلتے پھرتے انسان اچانک برف کے ٹپوں میں تبدیل ہو گئے مکانات اور درختوں کے چوں تک بلکہ ہر چیز برف ہو گئی۔

”کیٹ ہائٹن کی عمر اس وقت تیس سال تھی اور اس کی کچھ عرصہ پہلے ہی شادی ہوئی تھی اس دن اس کا شوہر گھر سے کسی کام کے سلسلے میں نکلا کیٹ بہت زیادہ امید تھی کہ اس کا شوہر جلد واپس آ جائے گا اور اسے اپنے شوہر کے آنے سے پہلے تمام کام نبھانے تھے کیونکہ اس کے آنے کے بعد وہ اسے اپنے پاس بٹھائے رکھتا تھا۔ دنیا جہاں کی باتیں کرتا تھا۔ نیچے تہہ خانے میں خشک لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا

اس وقت بجلی نہیں پہنچی تھی ان علاقوں میں اس لئے لوگ روشنی کے لئے روایتی طریقوں پر عمل کرتے تھے۔

تہہ خانے میں چونکہ دن کے وقت بھی اندھیرا جا رہا تھا اس لئے کیٹ نے لائٹن اٹھا یا اور تہہ خانے کی طرف چل دی تاکہ خشک لکڑیوں کو حسب ضرورت اوپر لے آئے۔

ابھی اس نے تہہ خانے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے کسی چیز سے ٹکرو لگی اور وہ منہ کے بل گر گئی لائٹن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس جا گری مٹی کا تیل نیچے بہنے لگا اور لائٹن کا جھٹ ٹوٹنے کی وجہ سے آگ نے لکڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا چونکہ بہنے والے تیل کا رخ بھی لکڑیوں کی طرف تھا اس لئے آگ کو پھیلنے میں ڈرا دیر نہ لگی۔

کیٹ آنکھیں پھاڑے دھڑا دھڑ جلتی لکڑیوں کو دیکھنے لگی۔ اس کو اس بات کا بھی خیال نہ رہا کہ وہ اٹھ کر آگ کو بجھا دے۔ ان علاقوں میں رہنے والوں کے لئے زندگی کا دار و مدار انہیں لکڑیوں پر ہوتا ہے اس لئے وہ ان لکڑیوں کو بچلتے دیکھ کر سکت ہوئی انہیں کچے بیلاری تھی۔ لکڑیوں کے جلنے کی وجہ سے تہہ خانے میں بہت گرمی ہو گئی۔ ایسا لگنے لگا جیسے موسم گرما چکا ہو جب گرمی برداشت سے باہر ہوئی تو وہ نیچے اور اس دل کے ساتھ اوپر آ گئی تاکہ مزید آگ کو پھیلنے سے بچا جاسکے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پانی بھر بھر کر آگ پر پھینکے گی اس لئے وہ نال کی ٹوٹی کے پاس بالٹی نیچے دھک کر ڈھکی مھولی لے گئی۔

ٹوٹی میں سے کچھ بھی نہ نکلا وہ حیران رہ گئی کہ ابھی تو پانی کا اتنا ذخیرہ موجود تھا اور اب پانی کیوں نہیں آ رہا؟ اس علاقے میں چونکہ بجلی نہیں تھی اس لئے وہ لوگ تقریباً جیسے سے پانی بھر کر ٹنگی قفل کر لیتے تھے تاکہ کھولنے پر آرام سے گزر سکیں۔

اس لئے ان کے پاس جو ٹنگیاں تھیں وہ کافی بے شمار تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ پانی ذخیرہ ہو سکے اور انہیں روز روز جیسے پر جانے کی مشقت نہ کرنی

پڑے۔ وہ چشمہ ایسا تھا کہ سارا سال جاری رہتا تھا چاہے جتنا بھی ٹھنڈا موسم ہو وہ نہیں جمتا تھا اس لئے لوگوں کو پانی کے حصول کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

جب ٹوٹی سے پانی نہ نکلا تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ چھت پر جا کر دیکھے ہے کہ پانی کیوں نہیں آ رہا..... وہ جلدی جلدی چھت پر پہنچی اور ٹنگی میں دیکھا تو اس کی آنکھیں فرط حیرت سے چیل گئیں۔ سارا پانی برف بن چکا تھا اور تو اور ٹنگی کی بیرونی رخ بھی برف سے ڈھک چکی تھی۔

کیٹ کو کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوا اس نے جلدی سے گردن مٹھا کر آس پاس دیکھا اور اس کی آنکھیں وہشت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ اور گردن دھا دھا گاہ برف ہی برف تھی ہر چیز برف سے ڈھک چکی تھی درخت گھر سمیت ہر چیز حتیٰ کہ انسان بھی اجیتے جا گئے برف کے ٹپوں میں تبدیل ہو گئے تھے؟

وہ وہیں سکت کھڑی کھلی آنکھوں سے آس پاس دیکھتی رہی لیکن ابھی نہیں زندگی کی چہل پہل دکھائی نہ دی۔ ہمسایوں کا آگاہ جو وقت بھوک بھوک کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا تھا وہ بھی خاموش تھا۔ پھر جیسے اسے ہوش آیا اسے اپنے شوہر کا خیال آیا تو وہ تیزی سے نیچے اتری اور سڑک کی طرف چل پڑی تاکہ اپنے شوہر کا پتہ کر سکے۔ اس کے ساتھ وہ ہر گھر میں داخل ہو کر دیکھتی کہ شاید کہیں کوئی زندہ انسان موجود ہو لیکن ہر طرف سے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمسایوں کا آگاہ بھی اپنی جگہ سکت برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ لوگ جہاں جیسے تھے وہی برف کے ٹپوں میں تبدیل ہو گئے ایک بھی زندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

صرف اس کے تہہ خانے میں جانے کی دیر تھی کہ باہر کا منظر ہی بدل گیا۔ ہنسا سکرنا علاقہ..... زندگی سے بھرپور۔ ایک ہی بل میں موت کی آغوش میں جا چکا تھا۔ وہ صرف اس وجہ سے غلج کی کیونکہ وہ آگ کے نزدیک تھی اس کا جسم حرارت سے پر تھا اس وجہ سے سردی کی شدید لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا

دور نہ ہو بھی اس وقت برف کا ایک مجسمہ ہوتی۔

لیکن اپنی زندگی بچ جانے پر اسے ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی بھلا وہ اسکی خوش رہ بھی کیسے سکتی تھی اس نے اپنے شو پر کمر وہ حالت میں دیکھ لیا تھا پورا علاقہ قبرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ اسکی زندہ رہ کر کیا کرتی؟ لیکن وہ خود کو موت کے حوالے کیسے کر سکتی تھی اسے کسی نہ کسی طرح جینا ہی تھا۔ سو وہ جیتی رہی مردوں سے بھی بدتر اس سانحہ نے پورے قصبے کو ہلا کر رکھ دیا تھا، لیکن وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی لیکن وہ احساسات پھر اٹھائی لے کر بیدار ہو گئے جب نثار چڑھ اس کی گود میں آیا۔

ہوا کچھ یوں کر دو میاں بیوی اپنے چھوٹے سے بیٹے کے ساتھ اس علاقے کی سیر کے لئے آئے۔ ایک حاوٹے میں وہ تو ہلاک ہو گئے لیکن وہ ننھا سا بچہ بچہ خزانہ طور پر بچ گیا جسے کیٹ نے اپنا بیٹا بنالیا۔

رچرڈ کے آتے ہی وہ مصروف رہنے لگی اور اس کے ہرے ذمہ مندل ہونے لگے۔ جب وہ اپنی معصوم زبان میں اسے مام کہہ کر پکارا تو جیسے اس میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس نے بہت اچھے طریقے سے اس کا ہر پرورش کی۔ ان سالوں میں وہ علاقہ کافی حد تک پھرا پاؤ ہو چکا تھا اس لئے کیٹ نے بھی اس علاقے کو چھوڑنے کے بارے میں سوچا۔ اور اب تو رچرڈ جوان ہو چکا تھا اس کے بڑھاپے کا سہارا۔ اس کے غموں کا درماں۔ زندگی بہت خوشگوار گزرنے لگی کبھی کیٹ کو بیٹے دنوں کی یاد تازہ تو وہ رچرڈ سے کہہ کر اپنا غم غلط کرتی۔

وہ کچھ دنوں سے رچرڈ کا بدلا ہوا رویہ دیکھ رہی تھی لیکن اس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا وجہ ہے؟ پہلے تو وہ بالکل نارمل تھا لیکن جب سے وہ پہاڑی سے گزریاں کاٹ کر لایا تھا اور زخمی حالت میں آیا تھا وہ بالکل چپ ہو گیا تھا ہر وقت نہ جانے خلاء میں کیا سمجھتا رہتا اور کیٹ کا دل ہولناک ہوتا تھا۔ اس نے کئی بار اس سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ جواباً خاموش رہتا کبھی کبھی ضرورتاً بات کرتا اور نہ اپنی دنیا میں گھمن۔

☆.....☆.....☆

مائیکل روزی اور جیکی اس دن سیر کے لئے گھر سے نکلے، روزی کے والدین نے معذرت کر لی کہ وہ اتنی سرور برداشت نہیں کر سکتے اس لئے وہ ان کے ساتھ نہیں جاسکتے۔

موسم صاف تو ہرگز نہیں تھا لیکن اتنا تھا کہ وہ اس خدشے کے بغیر سفر کر سکتے تھے کہ یقیناً برف باری نہیں ہوگی لیکن قدرت کے کاموں کا کہے پتہ ہوتا ہے وہ گھر سے کافی دور آ گئے جب بادل گھر گھر گرتے۔ گئے انہوں نے توشیٹ سے دیکھا آسمان گود بکھا اور پھر جلدی واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن ابھی وہ گھر سے کافی دور تھے جب برف باری شروع ہو گئی تیز ہواؤں کے جھگڑوں دہلا رہے تھے۔

روزی کا خوف سے برا حال تھا جیکی کو مائیکل نے اٹھا رکھا تھا اور وہ پھوپک پھوپک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ سرور کی شدت میں خاصہ اضافہ ہو گیا تھا وہ چونکہ مکمل طور پر گرم لباس میں لمبوس تھے اس لئے سرور کا اتنا احساس تو نہیں تھا لیکن بہر حال موسم اتنا خطرناک ہو گیا تھا کہ کسی بھی دقت کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ پھوپک پھوپک کر قدم اٹھا رہے تھے کیونکہ راستہ مکمل طور پر برف سے ڈھک چکا تھا وہ نیچے نیچے پر نفلے راستے بہت دشوار گزار تھے ذرا سا پاؤں پھسلا اور وہ کسی ان دیکھی کھائی میں گر جاتے۔۔۔۔۔ جہاں کسی کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

انہیں سب سے زیادہ جیکی کی پریشانی تھی کیونکہ وہ چڑھا اور اس ماحول سے خوف زدہ ہو سکتا تھا لیکن جیکی کے چہرے پر پریشانی نہیں تھی بلکہ وہ تو دل چاہی سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ راستہ بھول چکے ہیں یہ احساس اتنا جان لیوا تھا کہ انہیں خون اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اب جتا ہوا محسوس ہوا راستہ بھولنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتے تھے۔

بہت کوشش کے بعد بھی وہ راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

دن آہستہ آہستہ ڈھلتا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ نہیں

کر پا رہے تھے اپنے پتھر لیے دشوار گزار راستوں پر جب وہ چلتے چلتے تھک گئے تو ایک گھنے درخت کے نیچے ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔

یہاں کسی حد تک برف باری اور ہواؤں کی شدت میں کمی تھی کبھی کبھی تیز ہوا کا جھونکا اپنے ساتھ برف بکھینی اڑا کر لے آتا تو ایک لمحے کے لئے ان کے منہوں میں کچھ کی دوڑ جانی وہ تینوں بہت خاموش تھے وہاں گھر ہاتھ جیسے ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا ہو۔

ہوا کی تیزی میں شدت آتی جا رہی تھی اگر وہ وہیں بیٹھ رہے تو پھر وہ شاید کبھی گھر نہ پہنچ پاتے اس لئے کچھ دیر سنانے کے بعد انہوں نے پھر اپنے کاراواہ کیا تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح راستہ تلاش کر کے گھر پہنچ سکیں۔

سب سے زیادہ ان دونوں کو جیکی کی فکر تھی جواب بہت خاموش نظر آ رہا تھا۔

کافی دیر چلنے کے بعد مائیکل بہت تھک گیا اس نے جیکی کو نیچے اتارا اور احتیاط سے اس کی انگلی پکڑ کر اپنے لگا روزی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں لیکن وہ اپنے خوف کو اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی وہ جس جگہ سے چلے جا رہے تھے وہ ایک اونچی چٹان تھی جو مکمل طور پر برف سے ڈھکی ہوئی تھی وجہ سے بہت خطرناک ہو چکی تھی انہیں ہوا کی شدت اور بھی بڑھ گئی وہ بڑی مشکل سے غراؤ کو سنبھال رہے تھے لیکن ہوا کی شدت مزید بڑھتی جا رہی تھی اور وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے، لیکن وہ یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں اور بھی مشکل ہو سکتی تھی اسی دوران روزی کا پاؤں لڑکھڑا گیا، اس سے پہلے کہ وہ گرتی مائیکل نے جلدی سے اسے تمام لیکن اس کے پیچھے میں جیل کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے جھوٹ گیا اور وہ چیخا ہوا پہاڑی سے نیچے جانے لگا۔

مائیکل اور روزی کی آنکھیں فرط دہشت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ انہیں چیخا بھی یاد نہ رہا۔ جکی مسلسل چیخا ہوا نیچے جا رہا تھا اچانک کسی نہبان کے ہاتھوں نے اسے تمام لیا لیکن اس وقت تک

وہ خوف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

ادھر گھر میں رچرڈ اپنی ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہ متنب کر کے اسے وہ پھر کا کھانا کھلا رہی تھی وہ ہمیشہ یونہی کھانے میں غرے کرتا تھا اور ماں حیران تھی کہ وہ تو کھانے پینے کا بہت شوقین تھا دقت سے پہلے ہی اسے بھوک لگ جاتی تھی لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا رچرڈ کا رویہ۔

تمام معمولات۔۔۔۔۔ کام تو وہ پہلے کی طرح کرتا تھا اور ماں کی خدمت بھی، لیکن کچھ تھا جو معمول کے خلاف تھا جس کی ماں کو کچھ نہیں آ رہی تھی وہ خاموش رہنے لگی اور اس کے معمولات پر غور کرنے لگی۔

کھانا کھاتے کھاتے اچانک رچرڈ نے ہاتھ روک لیا باہر شدت کا طوفان آیا ہوا تھا برف باری مسلسل جاری تھی۔ کیٹ نے حیران ہو کر رچرڈ کی طرف دیکھا اور کھانا روکنے کی وجہ پوچھی لیکن رچرڈ نے اور کچھ نہ بتایا صرف اتنا کہا۔

”وہ مصیبت میں ہیں مجھے ابھی جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ماں حیرانگی سے اس کے پیچھے دیکھنے لگی اسے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کون مصیبت میں ہیں؟ وہ اس طوفانی موسم میں باہر بھی نہیں جاسکتی تھی اس لئے رچرڈ کی ضرورت کی دعا کرنے لگی۔

رچرڈ جلدی سے چلا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اس شدت کے موسم کی کوئی پرواہ نہیں۔ اور یہ حقیقت تھی اتنا سخت اور سرد موسم اس پر کوئی اثر نہیں کر رہا تھا وہ یوں جا رہا تھا جیسے نارمل موسم میں چلا جاتا ہے۔

وہ ایک چٹان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

پھر ایک ناقابل یقین منظر سامنے آیا۔ اس چٹان سے ایک بچہ لڑھکا چیخا نیچے آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سخت پتھری زمین سے ٹکرا کر موت کے منہ میں چلا جاتا اس نے آرام سے آگے بڑھ کر اسے یوں پکڑ لیا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا کھلونا ہو پھر وہ اسے لئے ہوئے واپس مڑ گیا۔

چلتے چلتے وہ روزی کے والدین کے گھر پہنچ

کی پرفارمنس کے لحاظ سے انہیں انعام بھی دیتا تھا۔
گھر کے دروازے پر خوبصورت اور بہت ہی
قیمتی پتھر پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ ”بہائن
فضل رہی۔“

اکثر میرے ذہن میں آتا کہ شیطان میرے
بارے میں کیا سوچتا ہوگا کہ دولت انھیں کرنے کے
سارے گر سکھادیئے اور ارادہ مستقیم سے بھٹکادیا۔ کوئی
بیرے کاروبار کے متعلق پوچھتا تو کہہ دیتا کہ ”اللہ کا بڑا
فضل ہے۔“ صرف میں ہی نہیں میری طرح کے اکثر
لوگ یہی کہتے ہیں۔

اگر دولت ہی اللہ کا فضل ہوتی ہے تو فرعون
اور قارون پر خدا خوش تھا کیا؟ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے
کہ اللہ کا فضل اس پر ہے جس کو خدا دین کی سمجھ دے لیکن
صراطِ مستقیم پر تو انسان اس وقت چلتا ہے جب وہ چاہے
تو درند۔ میرے کاروبار میں ہر طرح سے فراوانی تھی
جبوئی قسم کھا کر مال پہنچنا چاہتا تھا کہ کرجانا میرے
لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا، انتظامیہ سے ٹھیک ٹھاک مراعات
ہونے کی وجہ سے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شاید یہ کوئی ایسا
شعبہ ہو جہاں میری چٹ کام نہ آتی ہو، میرا شمار شہر کے
چند ایک شرفاء میں سے ہوتا تھا۔

اتنی دولت ہونے کے باوجود ساری عمر جی
سعادت نصیب نہ ہوئی۔ لیکن اکثر لوگ مجھے حاجی
صاحب کہہ کر بلاتے۔ میرے ہاں اکثر مجمع سا
لگا رہتا۔ چٹائی، غنیمت، بہتان بازی، پھوٹ ڈالنا
اور توڑ جوڑ ہماری مجلس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ اونچی
اوچی آواز میں ایک دوسرے کو غیظ قسم کی گالیاں دیتا
تھا۔ بات تھی اس شور شرابے سے پورا حملہ ٹھک تھا۔
مگر کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ محلے کی
میں میرا آنا جانا صرف عید کے دن ہوتا تھا۔

دعا دی باتیں کرتے ہوئے میں ٹھٹھکتا نہیں تھا۔
میرن زبان چٹنی کی طرح چلتی تھی مگر بدستی سے میری
زبان ڈکرائی کے معاملے میں گوئی تھی۔ کبھی کسی نیک
آدمی کے سامنے جاتا تو بتائیں کیوں میری طبیعت بچلنے

لگی۔ میں خوب مزے لے لے کر معاشی دار مٹرجنے
سے سوال کرتا اور اس کی دینداری کو نشانہ بنا تا کہ وہ بے
چارہ پسائی پر مجبور ہو جاتا اگر کوئی یار دوست نماز کے لئے
کہتا تو میں جواب دیتا۔ ”یہ تو فارغ لوگوں کا کام ہے
وہیے بھی ابھی ساری عمر پڑی ہے۔ جب گھنٹے کام کریں
چھوڑ جائیں گے تو پھر بیچ اور سبھی تو وہ جائیں
گے۔“ روزے کے ذکر میں کہتا ”روزے تو غریب
رکھتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا
ذکوۃ کے متعلق میری رائے کچھ اس طرح ہوتی۔“ یہ
تو غنیمت کی ایک قسم ہے وہ ہم حکومت کو دے رہے ہیں۔“

کوئی میرے گھر کی طرف اشارہ کر کے پوسے کا
ڈکر کرتا تو میں جواب دیتا۔ ”بڑا بڑا کھانا ہے تمہاری اپنی
نیت میں فتور ہے۔ شرم تو آنکھوں میں ہونی چاہئے۔“ بہاد
کے بارے میں تو میں سننا بھی پسند نہیں کرتا تھا آخرت
کے بارے میں تو میں سنتے ہوئے کہہ دیتا۔ ”وہاں کسی نے
دیکھا ہے! اگر ایسا کوئی چکر ہو گا تو چونکہ میں یہاں بھی
بہت کچھ ملائے! آگے جا کر بھی ہمارے پاس بہت کچھ ہوگا
وہیے بھی ہم بخشی بخشا کی امت ہیں۔ ان باتوں کو
چھوڑو! جس طرح بن بڑے عیاشی کے ساتھ دن گزارو۔“
بہر حال وقت گزرتا چلا گیا لا پرواہی عروج پر تھی۔

ایک دن مجھے محسوس ہوا جیسے میرا وجود ساتھ چھوڑ رہا ہے
یک لخت ایسی حالت ہو گئی کہ مجھے پانی مانگنے کے لئے
پوری قوت صرف کرنا پڑی۔ میں اگلے ہی لمحے اسپتال میں
تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسیوں کی ایک پوری فوج میرے گرد
موجود تھی میرے کانوں میں آواز پڑی۔ ”دل کا شدید
دورہ ہے بہت مشکل ہے دعا کیجئے۔“ یہ سنتے ہی مجھ پر کیا
نبتی یہ میں ہی جانتا ہوں یا میرا خدا اس وقت میری سمجھ میں
آیا کہ میں کتنی بکواس کیا کرتا تھا، جب میں کہا کرتا تھا کہ
موسیقی روح کی غذا ہے اور گانے بجنے سے روح کو سکون
ملتا ہے۔ ”آج تو مجھے اس سکون کی سخت ضرورت تھی، آج
میرا دل گانا سننے کو کیوں نہیں چاہ رہا تھا۔

پھر مجھے اسپتال کے ایک کمرے میں
لا کر لٹا دیا گیا۔ میں بمتر مرگ پر پڑا چھت کو گھور رہا تھا،

جہاں کی بات ہے کہ اس وقت چھت پر ایک بہت بڑی
بکر بن تھی اور اس پر میری زندگی کی گھٹاؤنی فلم چل رہی
تھی اس میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے
منہ بہت صاف نظر آ رہے تھے۔

کیسی عجیب فلم تھی وہ؟ میں گناہ کرتا تو دروازہ
بڑکھلتا کہ کوئی دیکھ نہ لے لیکن انوس کے یہ نہ سوچا تھا
کہ ایک ذات میری ہر حرکت کو دیکھ رہی ہے، میری
پختی کے مجھے تو فرش والوں سے تو شرح آتی رہی تھی
فرحش دالے سے مجھے ذرا بھی شرم نہ آتی۔

آہ! کتابت شرم تھا میں اس وقت مجھے احساس ہوا
کہ ”اے بد بخت انسان! اللہ کی ذات کس قدر صابر ہے کہ
تیری مسلسل بد اعمالیوں اور سیاہ کاریوں پر اس نے کس
ذمہ صبر کیا اور تو کیا ظالم کہ اس کی طرف سے اتنی مہلت
ہونے کے باوجود تو اپنی جان پر پیورے ظلم کرتا رہا۔“

میں اپنی اس بھیاکت فلم میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے
محسوس ہوا کہ میرے گرد ”لا الہ الا اللہ“ کا دور دورہ ہے۔
ایک عورت کی حریف سی آواز میرے کانوں میں
پڑی۔ ”لکھا ہے آنکھیں پتھر اگئی ہیں۔“ پھر گلے کے
ارویش تیزی آ گئی۔

حیرت ہے کہ! جب میں گانے سنتا تو ساتھ
ساتھ میری زبان بھی حرکت کرتی تھی ساتھ ہی ساتھ
میں بھی نکلتا تھا مگر آج میرے چاروں طرف ایک ہی
ننگے کا دور دورہ ہوا تھا مگر بڑی کوشش کے باوجود بھی ایک
تھک میری زبان سے جاری نہیں ہو پا رہا تھا۔

بک لخت مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے جسم
بہت بولی آری کے سامنے ڈال دیا گیا ہو، جیسے مجھے
ایک بولی دیگ میں ڈال دیا گیا ہو، جیسے میرے جسم کو
کمر سے ہزاروں ٹکڑے کر دیئے گئے ہوں جیسے زندہ
نہلی کی کھال اتاری جا رہی ہو۔ جیسے بیلنے میں گنے کے
ساتھ مجھے بھی ڈال دیا گیا ہو۔ جیسے ریل کی پٹری
نہل کر اٹھ کر اوپر سے ٹرین گزار دی جائے۔

جیسے زندہ چڑیا کو پتھر پر بھونکا جا رہا ہو، جیسے میرے
جسم کے ہر حصے پر ڈرل مشین سے سوراخ کئے جا رہے

انتقام کا جذبہ.....!

انتقام میں اپنے ہی مزاج کا زہر ملا دیا ہے
اور اثر کرتا ہے۔ اگر تم انتقام نہیں لے سکتے تو
الحال تم اس تکلیف میں مبتلا رہو گے اور اگر بدلہ
لے سکتے ہو تو آئندہ خود سخت ترین رنج اٹھاؤ گے۔
آپ نے بھی غور کیا کہ انتقام کا جذبہ کیونکر

پیدا ہوتا ہے؟ صرف ذاتی مفاد کی مخالفت پر یہ
جذبہ ابھرتا ہے، خواہ یہ مفاد مال سے تعلق رکھتا ہو،
آبرو سے یا پھر جان سے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو مالی
نقصان پہنچائے یا اس کی توہین کرے یا اس کے
جسمانی آزار کا باعث ہو تو وہ فوراً انتقام کے لئے
آمادہ ہو جائے گا۔ جب انتقام کی آگ بھڑکتی ہے
اور کوئی شخص بدلہ لینے کیلئے آمادہ ہوتا ہے تو سب
سے پہلے وہ اپنی تو قوت کا جائزہ لیتا اور دیکھتا ہے کہ
اس کے اندر کون سی ایسی طاقت موجود ہے، جسے وہ
اپنے حریف کے خلاف کا سیاسی سے استعمال کر سکتا
ہے۔ پس انسان وہ خاص طاقت استعمال کر کے
اپنے حریف کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے طور پر
انتقام کے جذبے کو تسکین دیتا ہے۔

(ایس ایم اناز احمد۔ کراچی)

ہوں، جیسے ایک زبردست خاردار ٹہنی کو میرے جسم میں
داخل کر کے یک دم بار کھینچا جائے۔۔

میں بہت چلا بہت واہ کیا۔ خدا کا واسطہ دیا
کہ مجھے چھوڑ دو، ایک بار مہلت دے دو، میں بہت نیک
ہو جاؤں گا، کبھی گناہ کے قریب بھی نہ پہنچوں گا، مجھے
بہت تکلیف ہو رہی ہے، ہائے میں مر گیا اوہ! میرے
اللہ! ہائے میری ماں دیکھ میں کس قدر اذیت میں ہوں،
کاش میں مٹی ہوتا، کہاں گئے میرے کارندے! وہ کہاں
گئی میری سفارشیں کہاں گئی میری پرچی۔

اور پھر اچانک ملک الموت کی دہشت ناک

آواز میرے کانوں میں پڑی مجھے لگا جیسے اس آواز سے میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے آواز سنائی دی "نکل اے نصیبت روح اپنے نصیبت جسم سے، آج تو قابلِ مذمت ہے بھولنے پانی ویسپ، زقوم اور طرح طرح کے عذابوں کی تجھے خوشخبری ہو۔"

اوہ! خدا یا! کیا ہر بدکاری ایسے ہی روح نکلتی ہے، میرا سارا بدن تار تار ہو گیا، پہلے میرے پاؤں ٹھنڈے، پھر ہڈیاں اور آہستہ آہستہ میرا پورا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

"اور میں مر گیا۔"

میری روح سرگرداں رہی، میرے مرنے کے بعد جامع مسجد کے بڑے بڑے اسپیکروں سے میرے جنازے کا اعلان ہو رہا تھا۔ وہ مسجد جس کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں اب تک کی زندگی میں صرف چند مرتبہ ہی مسجد میں جا سکا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں آج لمبے چوڑے القابات کے ساتھ میرے جنازے کا بار بار اعلان ہو رہا تھا۔ ہر بار مجھے حاجی صاحب کہہ کر پکارا جا رہا تھا۔ زندگی میں جب کسی جنازے کا اعلان سنا تو ہنسنے ہوئے کہتا۔ "کوئی آج ایک اور پکارت کٹ گیا۔" لیکن یہ بات میرے دہم و گمان میں بھی نہ گئی کہ ایک روز میرا بھی پتہ لگے گا۔ یعنی میرے جنازے کا بھی اعلان ہوگا۔

میری روح بے چینی کے عالم میں یک ٹک دیکھے جا رہی تھی، میری آنکھیں بند کر دی گئیں، میرے جبرڑوں کو باندھ دیا گیا، میری بدبستی! کہ روتے روتے کچھ نے ماتم شروع کر دیا، کچھ نے بال نوچنے شروع کر دیئے، اسی دورانِ عمر کی اذان ہوئی گھر میں عورتوں کا ہجوم، باہر مردوں کا ہجوم لیکن شاید ہی کسی نے نماز پڑھی ہو، میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ "عاقلو! میں تو اپنے انجام کو پہنچ گیا ہوں تم اپنی فکر کرو نماز کا وقت جا رہا ہے۔" مگر اتنے شور شرابے میں میری کون سن رہا تھا۔

میری لاش کے گرد میرے گھر والوں اور رشتہ داروں کا ہجوم تھا۔ میرا ایک ہاتھ چھوٹی بیٹی نے اور دوسرا بڑی نے اپنے کانوں پر لگا رکھا تھا۔ پاؤں کو میرے بیٹوں

نے اپنے ہاتھ سے جکڑا ہوا تھا میری ماں میرے چہرے پر بار بار ہاتھ پھیر رہی تھی۔ آخری بار میری ماں نے میرے ماتھے کو چومنا پھر ایک دم گہما گہما ہو گئی ہر طرف ایک کھرام سا جگ گیا۔ کوئی کفن خریدنے کا کہہ رہا ہے تو کوئی قبر کھودنے کا تو کوئی لاش کا بندوبست کرنے اور کوئی نسل دینے والے کو بلانے کے لئے جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے تختہ میت پر لٹا کر نسل دینا شروع کر دیا گیا۔ میرے اوپر پانی ڈالا جا رہا تھا کفن کے بعد مجھ بد نصیب پر الگ محل والے اسپرے کا بھرپور چھڑکاؤ کیا گیا، ان محفل کے اندھوں کو کیا پتا کہ ابھی ابھی میرے ساتھ کیا جاتی ہے اگر میں انہیں بتانے کے قابل ہوتا کہ فرشتوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو خدا کی قسم اوہ صوب میری میت کو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ اور اپنی اپنی فکر میں لگ جاتے۔

اسی دورانِ میری تربیت یافتہ اولاد میں سے ایک بھاگ کر فوٹو گرافر لے آیا، فوٹو گرافر اپنے پیسے بنانے کے لئے دھڑا دھڑ میری تصویریں بنانے لگا پھر ویڈیو والے کو لے آئے ویڈیو والوں کو دیکھ کر میری سمجھ میں بات آ گئی۔

لوگ اپنی فکر بنوانے کے لئے انداز بدل بدل کر میری چار پائی کے گرد گھوم رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق میرے جنازے کا وقت ہو گیا۔ آوازیں آتی شروع ہو گئیں کہ "دیر ہو رہی ہے جی۔" اس وقت مجھے یہ شعر یاد آیا۔

ذرا سنبھل کر کسی کو حساب دینا ہے زندگی کے لمحے کہاں کہاں گزرتے جنازہ اٹھنے کی دیر تھی کہ عورتوں کی چھین نکل گئیں جس سے سارا محلہ دھل گیا، میرے بیٹے چار پائی سے لپٹ گئے، بڑی مشکل سے میرے بے جان وجود کو نکالا گیا۔ چار آدمیوں نے چار پائی کو کندھوں پر اٹھایا، سڑک پر پہنچے تو سارے دکھدار کھڑے ہو کر افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ لوگوں کی قدموں کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ میرے جنازہ میں زیادہ لوگوں کا مجمع ہے

افسوس کہ کسی تبلیغی پریمیز مار غداوت گزار غریب کا جنازہ ہوتا تو سو آدمی اکٹھے نہ ہوتے۔

تھوڑے مختصر جنازہ گاہ میں عجب منظر تھا، ہمارے وہاں جانے سے پہلے کچھ لوگ موجود تھے جو کاروباری اور سیاسی کہیں ہانک رہے تھے۔ خیر نصیب درست کی گئیں، اٹھنے میں میرے بڑے بیٹے نے نہایت مری ہوئی آواز میں کہا کہ! بھائیو! اگر میرے باپ پر اگر کسی کا قرض ہو تو جنازہ کے بعد رابطہ کر سکتا ہے۔

امام صاحب نے جنازہ شروع کیا افسوس کہ راستے بڑے جیسے شاید ہی چند لوگ ہوں گے جنہیں مکمل نماز جنازہ آتی ہو۔ ورنہ سب ہی اس معاملے میں میرے بھائی نظر آتے تھے۔ اور مارے شرم کے دائیں بائیں نظریں کھما رہے تھے، کچھ سامنے کھڑے تھے، کچھ کے بعد سلام پھیرا گیا تو ان بھائیوں کی جان میں جان آئی، قدرت کا انصاف دیکھو کہ میں بھی اکثر مرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتا تھا، آج میرے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہو رہا تھا۔

پھر مجھے قبر میں منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا بعض محرمے خیر خواہ میرے اوپر دوسری قبروں کی مٹی کھرج کھرج کر ڈال رہے تھے۔ اس طرح مجھے منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا سارے لوگ اپنے اپنے گھر لوں کو چلے گئے۔ میں جو تینوں کی آواز سن رہا تھا، میں سمجھا کہ جتنی سزا مجھے ملنی تھی وہ مل چکی ہے اب یہاں آرام سے پڑا رہوں گا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اب میرا واسطہ ایک مستقل مناب سے پڑنے والا ہے۔ ایسا دردناک عذاب کہ دشمنوں کی ہمت ہو سکتی نہ تھی۔ لگے میری قبر کے باہر گلاب کی بہت خوشبو اور گیلی مٹی کی ایک مہلک تھی۔ لیکن خدا کے لئے گمراہانے لگا۔ اتنا سخت اندھیرا اور میں تنہا تھا۔

قبر نے عجب طریقے سے میرے ساتھ شکوہ کیا۔ "اے غافل انسان! تو دنیا میں ملن تھا مگر کوئی ایمان نہیں گزرا کہ جس دن میں نے تجھے آواز نہ دی تو کہ میں وحشت کا گھر ہوں۔ میں دہشت کا گھر ہوں۔ میں تنہائی کا گھر ہوں، میں خاک کا

گھر ہوں۔ میں کڑوں کا گھر ہوں، جتنے لوگ میری پشت پر چلتے تھے میرے نزدیک ان میں سے سب سے زیادہ تو قابلِ نفرت تھا، اب میں تجھ پر حاوی کر دی گئی ہوں، تو دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کیا برا سلوک کرتی ہوں۔"

"آٹا ٹانا سیاہ رنگ کے دوفرشتے قبر کی دیواروں کو چیرتے ہوئے اندر آ گئے۔ (نہ پوچھا اس وقت میری کیا حالت تھی، میں قہر قہر کانپ رہا تھا) وہ آتے ہی انتہائی غضب ناک لہجے میں اپنی بیوی بلے جسے میں نہ سمجھ سکا، انہوں نے غضب ناک طریقے سے مجھے گھورا پھر بولے۔ "تیرا رب کون ہے؟"

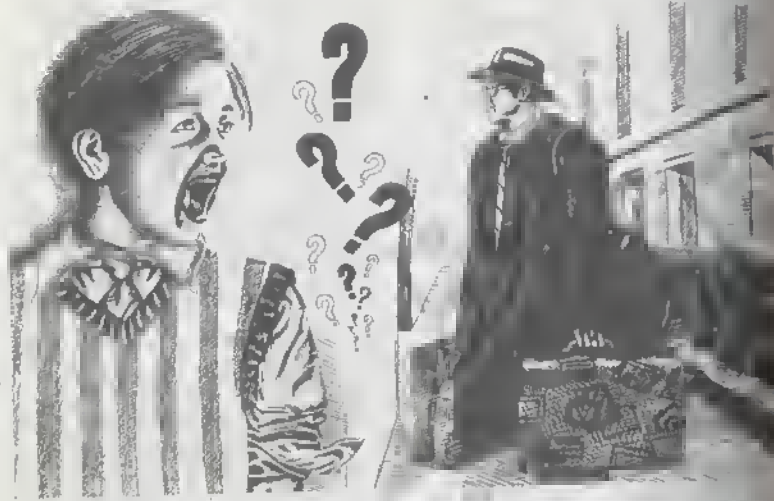
مجھے نہیں معلوم میں نہیں جانتا" میں نے جواب دیا اس کے بعد انہوں نے مزید سختی سے سوال کیا۔ "تمہارا دین کیا ہے؟" دوبارہ میں نے انکار کیا تو وہ انتہائی سخت گرد اور پھنی آواز میں بولے۔ "تو اس برحق آدمی کے بارے میں کیا کہا کرتا تھا۔" قسمت کھوئی اس بار بھی میں نے انکار کیا، زندگی میں قلمی ستاروں کے بارے میں تو بڑے وثوق سے جانتا تھا لیکن بیشک کمالے کے ذکر سے دور رہتا تھا۔ آج اس بے اعتنائی کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔

میرا یہ جواب سننا تھا کہ کرخت آواز سنائی دی۔ "اس کے لئے آگ کا پتھوٹا بچھاؤ، اس کو آگ کا لباس پہناؤ۔" یہ آواز آنے کی دیر بھی کہ اسی وقت میری قبر میں ناقابلِ برداشت گرمی آتی شروع ہو گئی پھر میری قبر تک ہو گئی اتنی تک کہ میری پسلیاں ایک دوسرے میں گھس گئیں۔

ایک فرشتہ میری قبر میں مسلط کر دیا گیا جس کے ہاتھ میں لوہے کا گرز تھا۔ اس نے اس گرز سے مجھے مارنا شروع کر دیا۔

بھائیو! اور بھئیو! مجھے اس وقت کس قدر تکلیف ہو رہی تھی اگر آپ لوگوں کو پتا چل جائے تو آپ لوگ اپنے مردے دفنانا چھوڑ دیں۔

بھائیو! اور بھئیو! جو کچھ مجھ پر گزری تھی وہ بیان



قبر

اجنان سحر - میا توالی

رات کے دو بجے قبرستان میں ہولناک تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ اجنانک ایک دل دھلا دینے والی خوفناک جسم و جاں پر لرزہ طاری کرتی چیخ سنائی دی اور پھر ساتھ ہی ایک الو کریہہ آواز نکالتے ہوئے سامنے آیا۔۔۔۔۔

دل دو ماٹ پر دہشت اور دہشت طاری کرتی اپنی نوعیت کی ایک خوفناک اور ڈراؤنی کہانی

حسام اور یوسف بچپن ہی سے گہرے دوست تھے اور ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا جبکہ یوسف نے سب کچھ کرنگ کر کے پڑھائی کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ سات کے دو بجے وہ سینما سے فلم دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ دیکھ کر وہ انہیں کلمہ چوک پر اتار کر واپس چاچا کا تھا۔ اب وہ بچوں میں سے گزر رہے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے ان کے دانت نخر رہے تھے اس وقت وہ قبرستان کے راستے پر تھے کیونکہ قبرستان کے دوسری طرف انکا گھر تھا۔ ”کیا تم دوسری طرف سے نہیں جا سکتے تھے؟“ یوسف نے تقریباً ڈرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ قبرستان دیکھتے ہی اسے ہول آنے لگتے تھے وہ تو دن کے وقت بھی اس طرف نہیں آتا تھا لیکن حسام تو اسے رات کے دو بجے یہاں لے آیا تھا۔ ”کیوں نہیں جاسکتا تھا۔“

اب تو امید کی ایک ہی کرن نظر آتی ہے کہ کوئی رحم دل بچے دل سے خدا کی بارگاہ میں میرے لئے دعائے مغفرت کر دے تو اس کی بدولت میری قبر تاحدنگاہ تک وسیع ہو جائے گی اور میری قبر ٹھنڈی کر دی جائے گی۔

اتنے میں ایک خوف ناک بھیانک سانپ بھی پھیلانے میرے سامنے کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھوں اور منہ سے شعلے کی پیش نکلنے لگی، وہ پھنکارتا ہوا مجھ پر چڑھا اور میرے ماتھے پر اپنے زہریلے دانت سے ڈس لیا، تکلیف اچانک برداشت سے باہر ہو گئی۔ ”یا اللہ..... یا اللہ..... مجھے بچالے، یا اللہ مجھے معاف کر دے۔“

یا اللہ میں توبہ کرتا ہوں یا اللہ مجھ پر رحم فرما۔۔۔۔۔ مجھے زور زور سے جھنجھوڑا جا رہا تھا، میری آنکھیں بند تھیں، پھر جھنجھوڑنے والے نے مجھے پوری قوت سے جھنجھوڑنے لگا۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی، صبح کا سپیدہ بھیل رہا تھا، میرے گھر کے سارے افراد میرے قریب کھڑے تھے، میرے سارے کپڑے پینسے سے تراش دیے تھے، میں سب کو یک ننگ دیکھتے ہوئے سوئے سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا، گھر والوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ کیا ہوا، کیا بات ہے؟ آپ کیوں جیغ رہے تھے؟ کچھ تو بتائیں؟“

میں نے سب کو ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم لوگ فوراً میرے قریب سے چلے جاؤ اور پھر میں نے لمبی لمبی سانس لینے لگا، میری زبان بالکل گنگ تھی، مجھ میں بولنے کی سکت بالکل نہیں تھی۔ بیوی سے ٹھنڈا پانی منگوایا اور غٹا غٹ تین گلاس پانی پی گیا۔

اس رات کے بعد میری دنیا بدل گئی، صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو گیا، دنیاوی خرافاتیں ختم ہو گئیں، گھر والوں کو بھی نری اور نحتی سے راہ راست کا پابند کیا اور اب یاد اُمی میں شب در در گزرا رہا ہوں۔



سے باہر ہے بہت تکلیف دہ ہے مگر میرا خدا اس بات کا گواہ ہے کہ جو چیز مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی وہ یہ ہے کہ ”اے اللہ قیامت کے دن، اپنا یہ ذلیل اور کمزور چہرہ لے کر کس طرح تیری بارگاہ میں حاضری دوں گا، اپنے جرائم کا تجھے کیا جواب دوں گا، قبر میں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مگر میدان حشر میں تو ساری آتیں ہوں گی، سارے نبی کرام خصوصاً سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی موجود ہونگے کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟“

کاش! کوئی بہن یا بھائی میرا یہ پیغام میری اولاد کو بھی پہنچا دے کہ آذ اپنے بدنصیب باپ کی سرخ انگاروں بھری قبر کو دیکھو۔

میرے بچہ! میری قبر کو بے شمار سانپ اور بھوڑوں نے گھر رکھا ہے جو سارا سارا دن میرا بدن نوچتے رہتے ہیں۔

میرے بچہ! خدا کے واسطے ایک مرتبہ ہی میری قبر پر آ جاؤ۔ اگر آنے کی فرصت نہیں تو کم از کم میرے چھوڑے ہوئے مال سے میرے نام پر کچھ صدقہ خیرات ہی کر دو۔“

آتے وقت تم نے میرے تمام کیش بک، کپڑے یہاں تک کہ گھڑی تک بھی اتاری تھی۔ میں دن رات یہاں نیکیوں کو ترستا ہوں، میری اولاد ہونے کی حیثیت سے کم از کم ایک مرتبہ ہی میری قبر پر آ کر دعا کر دو، اگر یہ بھی نہیں تو ایک شریف پڑوسی کی حیثیت ہی دے دو اور کچھ صدقہ خیرات میرے لئے کر دو۔“

بس آخری بات! میرے زخمی ہاتھ دیکھو۔ یہ لڑتے ہوئے ہاتھ جو زکریا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میرے اس انجام سے عبرت لے کر بڑھاپا آنے سے پہلے جوانی میں کچھ کر لو۔ مصروفیت آنے سے پہلے فرصت میں کچھ کر لو اور موت آنے سے پہلے زندگی میں کچھ کر لو، ورنہ میری طرح پچھتاوے بہت پچھتاؤ گے۔

اب پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ تین دنوں میں پانچ انسان جنوں کی طرح غائب تھے۔ لوگوں نے دس بجے کے بعد گھروں سے نکلتا چھوڑ دیا۔ اگلے تین دنوں میں چار بندے اور غائب ہو گئے۔ پولیس کے خلاف نعرے بازی شروع ہو گئی۔ چوک چوک پر دھڑا لگا دیے گئے تھے۔ اس وقت میں اپنے آفس میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ مانا کہ میں ذہین انسپکٹر تھا لیکن اس وقت جو پیش مختلف قسمی میں دو دنوں سے مجرموں کا سراغ لگا رہا تھا، لیکن کوئی کلیو ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن میں نے کالونی والوں کو کہہ رکھا تھا کوئی نئی واردات ہو تو مجھے ضرور اطلاع دی جائے۔ ویسے میں نے دو خبروں کو کالونی میں چھوڑ رکھا تھا لیکن انہوں نے ابھی تک کوئی رپورٹ نہیں دی تھی کیونکہ زیادہ تر افراد وہیں سے غائب ہوئے تھے۔

نہ جانے رات کا وہ کونسا پہر تھا کہ میرے دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ ایک ہی دستک پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے لائٹ کو چلایا اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ دوسری ہارنٹوش انداز میں دستک دی گئی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے دستک دینے والے کے پیچھے ڈاکو لگے ہوئے ہوں۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ سردی کی ایک تیز لہر میرے چہرے سے ٹکرائی جو میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

اچانک میرے پیروں سے کوئی چیز ٹکرائی تو میں تڑپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ”انسپکٹر صاحب..... انسپکٹر صاحب..... مم..... میری بچی..... کو بچائیں..... پتہ نہیں کہاں گئی وہ..... انسپکٹر صاحب.....“ ایک شخص نے میرے پیروں کی طرف پڑے ہوئے کہا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر چار پائی پر بٹھایا۔ وہ ہانگوں کی طرح کہہ رہا تھا کہ میری بچی..... کو بچائیں.....“

کافی قسٹیاں دینے کے بعد اس کی حالت سنبھل تو اس نے کہا شروع کیا۔ ”انسپکٹر صاحب میری بچی

دیر بعد کالونی تو مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور گلی کے آخری ٹکڑ پر میرے دوست اقبال کی دکان ہے۔ میں نے جب اس سے زورینہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ”اس نے زورینہ کو قبرستان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ یہاں تک پہنچ کر وہ رستہ گیا۔ اب اس کی حالت کافی سنبھل چکی تھی اس نے کہا شروع کیا۔

”مائی باپ میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مجھے والوں سے پوچھا لیکن پتہ نہیں وہ کہاں چلی گئی۔“ اس شخص نے رو ہانسی لہجے میں کہا، ایک مرتبہ اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا درد سمٹ آیا تھا۔ ”خیر آپ نے اپنا نام نہیں بتایا اور آپ رہتے کہاں ہیں؟“ میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

”جنت میرا نام رحمت علی ہے اور میں مراد آباد کالونی میں رہتا ہوں؟“ اس نے کہا اس کا لہجہ کافی سنبھلا چکا تھا۔

ٹھیک ہے تم باہر نکلو میں آ رہا ہوں۔ میں نے کہا میرا ذہن تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ میں زورینہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے آخری وقت قبرستان میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا تو کیا..... اسے بھی..... غور کر لیا گیا تھا.....؟ لیکن کون ہے جو لوگوں کو اغواء کر رہا ہے.....؟ اور اس کے اغواء کرنے کا مقصد کیا ہے.....؟ کیونکہ میں بھی زورینہ کو اس سلسلے کی کڑی سمجھ رہا تھا۔ اگر زورینہ کے بارے میں تھوڑا سا بھی کیول جانے تو بھر باقی اغواء کنندگان کا بھی پتہ چل جاتا۔ میں نے تیزی سے یونیفارم پہنا اور سردی سے بچنے کے لئے فطریگی ساتھ لے لیا۔ رحمت علی کو لے کر میں ساتھ والے کواٹر کی طرف چل پڑا وہاں سے میں نے کاشییل فیصل کو بیدار کیا کاشییل فیصل کو میرا لائٹ دینا سمجھا جاتا تھا، کیونکہ وہ خاصا ذہین تھا فیصل آنکھیں ملتا ہوا ہمارے ساتھ چل پڑا۔

وہ کل یونیفارم میں تھا اس کے ایک ہاتھ ش

تاریخ اور دوسرے میں داخل تھی میں نے موثر سائیکل لٹائی اور ہم رحمت علی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہم سراد آباد کالونی میں داخل ہو چکے تھے کیونکہ تھانہ کالونی کے ساتھ ہی تھا اس وقت گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ ”رحمت علی تمہارے دوست اقبال کی دکان کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جی کڑو میں جو دروازہ آپ کو نظر آ رہا ہے وہ اقبال کی دکان ہے۔“ رحمت علی نے مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہم نے موثر سائیکل کو رحمت علی کے گھر میں کھڑی کی اور اقبال کی دکان کی طرف چل پڑے۔ ہم اقبال کی دکان پر پہنچے تھے اقبال کی دکان سے سو قدم کے فاصلے پر جنوب میں قبرستان تھا اور اقبال نے آخری بار زرینہ قبرستان میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

ہم نے رحمت علی کو گھر بھیج دیا۔ ”فیصل تمہارے خیال میں لڑکی کہاں ہوگی؟“ میں نے فیصل سے پوچھا۔

سر میرے خیال میں زرینہ کو اغواء کیا گیا ہے۔ اگر عشق دشمن کا پکڑ ہوتا تو وہ اب تک واپس آ چکی ہوتی۔ فیصل نے اپنے تئیں تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویری گڈ! فیصل میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا۔

اب ہم قبرستان میں داخل ہو چکے تھے۔ ”فیصل تم مناسب فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آنا کیونکہ کوئی بھی ناخوش گوار واقعہ پیش آ سکتا ہے۔“ میں نے کہا تو فیصل نے کچھ کہنے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں چہ کئے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت میری تمام حسیں بیدار ہو چکی تھیں۔ شدید سردی کی وجہ سے میرا تاراج والا ہاتھ ٹھنڈا چکا تھا۔ کانٹیل فیصل مناسب فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آ رہا تھا۔ یلکھت مجھے

ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز سنائی دی میں تیزی سے مڑا لیکن دور تک کوئی نہیں تھا۔ فیصل بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے قوی امید تھی کہ وہ یہی کہیں ہوگا۔ دھند کی وجہ سے مجھے ارد گرد دیکھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ یلکھت میرے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ اس وقت میری تاریخ کی روشنی اس فیر دزی رنگ کے دوپٹے پر پڑ رہی

تھی جو ایک جھاڑی میں اٹکا ہوا تھا میں غلط انداز میں ہلکے ہلکے قدم بڑھاتا ہوا اس جھاڑی کی طرف چل پڑا۔ دوپٹہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا میں نے گرد و پیش کا باریک بینی سے جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ اس جگہ رنگ برنگی چوڑیاں بھی ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں۔

اچانک میرا ذہن اغواء کی طرف چلا گیا کیونکہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا دوپٹہ اور ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جی جی کر کہہ رہی تھیں کہ زرینہ کو اغواء کیا گیا ہے۔

میں نے ہاسٹل کو پکڑا اور غلط انداز میں تھوڑا سا آگے بڑھا۔ ایک دم میری عقابانی نظریں زمین میں گر گئیں کیونکہ وہاں واضح انداز میں نظر آ رہا تھا جیسے کسی کو کھینچا گیا ہو۔ میں نے نشان کی طرف چلتا شروع کر دیا۔ میں قدم چلنے کے بعد وہ نشان بائیں طرف مڑ گیا۔ وہ قدم چلنے کے بعد وہ نشان کبھی قریب جا کر رک گیا۔ وہ چو فٹ کی سینٹ سے بنی ہوئی قبر کی قبر کے اوپر خون کے نشانات تھے جو سوکھ چکے تھے۔

میں نے پھر باریک بینی سے قبر کے ارد گرد کا جائزہ لیا لیکن وہ نشان یہی پر ختم ہو رہے تھے۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ زرینہ کو یہیں دفنایا گیا ہے لیکن میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے قبر کو کھود کر اپنے یقین کا تصدیق کر سکوں۔ جو نمی میں واپسی کے ارادے سے مڑا میری ناک سے ایک نالوس سی بو نکرائی میرا ذہن لٹو کی طرح گھوما اور میں چکر اکر وہیں گر پڑا۔

☆ ☆ ☆ اور مجھے جب ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جو اس کے انداز میں سجا ہوا تھا۔ سامنے ٹیبل پر ترتیب سے فون رکھے ہوئے تھے۔ ٹیبل کے پیچھے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی تو اس کے چہرے ناگوری کے تاثرات چھا گئے۔

”میں زمان اسپیکنگ ریسور دکان سے لگا کر ان نے سخت لہجے میں کہا۔

”ہنری بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے خلاف توقع نرم لہجے میں کہا ”ہاں سر۔۔۔ حکم سر۔۔۔ اس وقت اس کا لہجہ بھکا رہا جیسا ہو گیا۔ ”زمان مال تیار ہے؟“ ہنری نے نرم لہجے میں کہا شاید اس کا لہجہ قدرتی طور پر نرم تھا۔

”میں سر کتنا مال چاہئے؟“ زمان نے جوش سے لہجے میں کہا۔

”ایکس پیس کی ایمر جنسی ضرورت ہے۔ ہنری نے کہا۔

”ٹھیک ہے سر آپ میرے اکاؤنٹ میں دس لاکھ روپے جمع کروائیں ٹھیک چار دن بعد مال پہنچ جائے گا۔“ زمان خان نے کہا۔

”میں زمان خان ایک دن کے اندر اندر مال پہنچاؤں تمہیں اس کے پندرہ لاکھ دوں گا۔“ ہنری نے کہا۔

”لیکن سر یہاں پولیس الٹ ہو چکی ہے ہر طرف ڈاکو بندیاں ہیں، بہر حال میں دو دن میں پہنچانے کی کوشش کروں گا۔“ زمان خان نے خوشامد لہجے میں کہا۔

”ہاں سر کے مال جلدی پہنچانے کی کوشش کرو۔“ ہنری نے یہ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔

زمان خان نے ریسورڈ کرڈیل پر رکھا۔ اس کا دل بیسوں اچھل رہا تھا کیونکہ اس کی ذمہ داری میں اتنا بڑا آرڈر پہنچا دیا تھا۔ پندرہ لاکھ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے گئے۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے پانچ روز ہو چکے تھے۔ اس نے یہاں اپنی پوری گینگ تیار کر لی تھی۔ اس کی تنظیم کے ارکان پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں کہیں انہیں موقع ملا وہ لوگوں کو اغواء کر لیتے اور ان کے اڈے تک پہنچا دیتے۔ قبرستان کے انہماک نے پرائیویٹ کلینک کھول رکھا تھا اور غریبوں کا مفت علاج کرتا تھا لیکن دوسری طرف وہ کردہ انداز کر رہا تھا، جو نمی اس کے آدمی کسی کو اغواء کر کے لے کر وہ اس کی آنکھوں کو نکال دیتے اور ان کی آنکھوں

کے پتلیاں اور گردوں کو غیر ملک اسمگل کرتے، اس بار اسکے کارندوں نے ایک ماہ میں بارہ آدمیوں کو اغواء کیا تھا۔ سات آدمیوں کو تو اس نے قبرستان سے اغواء کیا تھا اور باقی پانچ کو بھی ارد گرد کے علاقوں سے اغواء کر لیا تھا۔ چونکہ پولیس پورے شہر میں دھناتی پھر رہی تھی اس لئے اس نے اپنے آدمیوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیا تھا اور یہی اس کی سیانی کا راز تھا کیونکہ جب بھی اس کے آدمی کوئی لہبا تھ مارے تو وہ انہیں کافی عرصے کے لئے عائب کر دیتا اور خود بھی کلینک پر توبہ دیتا پھر جب ہر طرف خاموشی چھا جاتی تو پھر اپنا دھندہ شروع کر دیتا۔

یلکھت فون کی گھنٹی بج اٹھی تو وہ خیالوں کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ ”میں زمان اسپیکنگ۔“ زمان خان نے خلاف توقع نرم لہجے میں کہا۔

”ہاں آپ جلدی سے آپریشن ہال کی طرف آئیں۔ دوسری طرف دھشت زدہ انداز میں کہا گیا۔

”کیا ہوا۔۔۔ کوئی بم پھٹا ہے کیا؟“ زمان خان نے پریشان لہجے میں کہا۔ ”ظاہر ہے جس جگہ ایسا کام ہوگا وہاں بم تو پھٹے گا۔“ دوسری طرف شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”کیا۔۔۔ مطلب ہے تمہارا۔۔۔ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔“ زمان خان نے کہا۔

”ہاں آپ جلدی سے آپریشن ہال کی طرف آئیں ورنہ یہ کسی بھی لمبے اڑ سکتا ہے۔“ دوسری طرف منیر نے کہا تو زمان خان کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ اس نے تیزی سے ریسورڈ کرڈیل پر چٹا اور باہر کی جانب لپکا۔

جو نمی وہ دروازے سے باہر نکلا تو سردی کا ایک جھونکا اس کی ناک سے نکل گیا جو اسکے پورے وجود میں سرایت کر گیا یہ ایک طویل راہداری تھی جو بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ وہ تقریباً دو سو فٹ راہداری پار کر گیا۔ سامنے راہداری ختم ہو رہی تھی وہاں ایک دروازہ تھا، دروازے کے دائیں جانب تھوڑی سی سڑج ابھری ہوئی تھی۔ زمان خان نے اسے دایا تو دروازہ بغیر کسی آواز کے کھلتا چلا گیا

نیچے سیریاں جاری تھیں وہ تیزی سے سیریاں پھیلائی چلا گیا۔ سیریاں کے اختتام پر دو گن من کھڑے ہوئے تھے، جنہوں نے اسے جھک کر سلام کیا لیکن زمان خان کو کسی بھی چیز کا ہوش نہیں تھا اس کے چہرے پر بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔

وہ تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا دائیں طرف دروازے کے دونوں جانب گن من کھڑے ہوئے تھے۔ جونہی وہ اندر داخل ہوا ایک شخص تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ "باس آپ ادھر آئیں۔" زمان خان نے ماتھے کا پین صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہی ایسی ہے جس نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔" منیر نے کہا۔

"منیر زمان خان کو ہاتھ سے پکڑے تیزی سے ایک مشین کی طرف لے گیا جس کی اسکرین آف تھی۔ اس نے اسکرین کو آن کیا تو اسکرین ایک جھماکے سے روشن ہوئی۔ "باس میں آپ کو ایک فلم دیکھاتا ہوں آپ اس غور سے دیکھیں۔" منیر نے زمان خان سے کہا تو زمان خان کی آنکھیں اسکرین سے ایسے چپک گئی جیسے مقناطیس لوہے سے چپکا ہے۔

اسکرین پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ساتھ ہلکی، ہلکی دھند بھی تھی لیکن اسکرین پر قبرستان کا منظر واضح نظر آ رہا تھا ایک شخص جو پولیس کی ردی میں ملیں تھا بڑے چوکے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں پستل اور دوسرے ہاتھ میں نارنج تھی۔

اچانک اس نے جھاڑیوں میں اٹکا ہوا ڈوبٹا اٹھا یا اور غور سے زمین کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا جوں، جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا دایسے، دایسے زمان خان کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی، کہ پھر وہ غصہ بائیں طرف گیا اور کچھ قدم چلنے کے بعد ایک قبر پر جا کر رک گیا تو زمان کا دل اچھل کر طاق میں آ گیا۔ "منیر یہ شخص مخصوص جگہ پر کیسے پہنچ گیا؟" زمان خان کسی ہم کی طرح پھٹ پڑا تو ہال میں یکدم سکوت چھا گیا۔ "باس آرام سے آپ آگے تو

دیکھیں۔ چندا کھی گئے کام نہیں کرتا۔" منیر نے زور سے کہا تو زمان خان کی آنکھیں ایک بار پھر اسکرین سے چپک گئے۔ پولیس والا تھوڑی دیر وہاں رکا اور اس نے وہاں نشان لگایا اور جونہی دایسے کے اوپر سے سڑک دھڑام سے زمین پر آگرا۔ "منیر یہ کیا ہو گیا، یہ تو بالکل جا رہا تھا اسے واپس جانے دیتے۔" زمان خان ایک ہی پھر منیر پر برس پڑا۔

"ایسا لگتا ہے آپ نے فلم کو غور سے نہیں دیکھا۔ اس نے قبر کے ساتھ نشان لگایا ہے جس سے آگے ہے کہ وہ صبح آکر اسکو ضرور کھودے گا اور ہمارا راز فاش ہو جائے گا اس لئے میں نے بے ہوشی والا سپرے کر کے اسے بے ہوش کر دیا اور اس وقت وہ ڈارک روم میں ہے۔" منیر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو زمان خان کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اسکرین کی طرف دیکھا جہاں وہ پولیس والا بے ہوش پڑا تھا۔ اچانک وہ قبر بغیر کسی آواز کے ایک طرف ہٹی اور اس سے دو نقاب پوش جو کہ سیاہ لباس میں ملیں تھے تیزی سے باہر کی طرف لپکے، میرے بے ہوش وجود کو اٹھا یا اور تیزی سے قبر کے اندر آئے۔ قبر کے اندر سیریاں آ رہی تھیں۔ باہر اتنی تاریکی کے باوجود اندرون کا سامان تو ہر جگہ ہی روشن تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے سیریاں کے ساتھ والے ٹین کو دایا تو قبر دوبارہ اپنی جگہ پر آگئی اور وہ دونوں مجھے اٹھائے آگے کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے۔ دونوں اس مرتبہ سے چلنے، چلتے داکن طرف مڑ گئے۔ دائیں طرف مڑنے کے بعد ایک دروازے پر جا پھرے اور ایک ٹین کو دایا تو دروازہ کھل گیا اندر گھپ اندھیرا تھا انہوں نے مجھ کو اندر کی جانب دھکیل دیا تو منیر نے اسکرین کو آف کر دیا۔

"باس آپ اس سے پوچھ چکے ابھی کریں گے؟" منیر نے پوچھا تو زمان خان نے اپنی کھڑی ٹا طرف دیکھا سوا جا رہا ہے تھے۔

"منیر میں صبح آکر اس سے پوچھ چکے کروں گا۔ ابھی میں گھر جا رہا ہوں یہاں مکمل گمراہی رکھنا۔" زمان

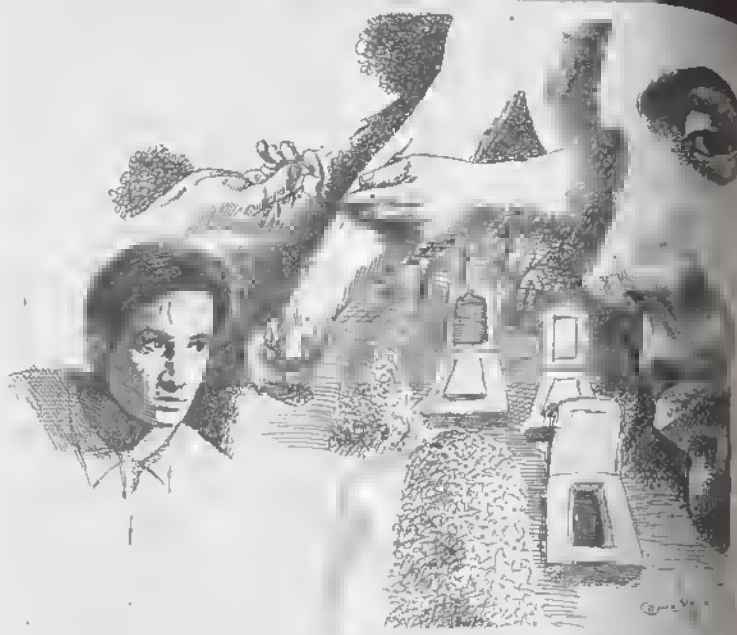
خان نے منیر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ بے فکر ہیں میں سب کچھ سنال لوں گا۔" منیر نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا زمان خان کو منیر کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا اس لئے وہ بے فکر ہو کر گھر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆
کاٹھیل قیصل بڑے چوکے انداز میں مناسب اسلحہ رکھ کر میرا چھپا کر رہا تھا شاید میری کی وجہ سے اس کے ہاتھ نہ بٹے ہو چکے تھے۔ ہلکی دھند کی وجہ سے اسے دیکھنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر مناسب فاصلہ رکھ کر وہ انپکڑ کا چھپا کر رہا تھا۔ اچانک قیصل جھاڑیوں کی دھند میں ہو گیا تاکہ وہ کسی کی نظر میں نہ آجائے تو وہ بھی کسی کے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں گر نہ پڑا اس لئے وہ چھپ چھپ کر پیچھا کر رہا تھا۔ قبرستان میں اس وقت موت کا سامنا تھا پورا قبرستان اندھیرے کی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ٹیگٹ کاٹھیل قیصل ایک باب کو گیا کیونکہ اس نے انپکڑ کو ایک دوپٹے اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا اس نے دیکھا کہ انپکڑ دائیں طرف لپکا اور کچھ قدم چلنے کے بعد ایک جگہ پر رک گیا۔ اس جگہ کی لائٹ ایک قبر پر پڑی تھی تھوڑی دیر کیلئے منیر جھک گیا۔ جونہی وہ واپس کیلئے مڑا تو اس کے دونوں ہاتھ فضا میں لہرا گئے۔ پستل اور نارنج اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے تھے۔ وہ جھومتا ہوا زمین پر جا کر اچانک کاٹھیل کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ وہ تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا تاکہ انپکڑ کی مدد کو پہنچ سکے پھر اس نے دیکھا کہ قبر ایک طرف سے آگے بہت گئی ہے اور اس سے دو نقاب پوش نکلے آئے۔ انہوں نے اس کے راتھل ان کی طرف تان لی۔ انہیں یہاں ہجوں ڈالے لیکن یہ سوچ کر راتھل کا منہ کھینچ کر لیا کہ کہیں ان کے ساتھی چھپے ہوئے نہ ہوں۔ راتھل کے سینے پر جائیں۔ ان نقاب پوشوں نے منیر کو اٹھا یا اور تیزی سے قبر میں اترتے چلے گئے۔ منیر نے قبر کے دوبارہ اپنی جگہ پر آگئی۔ کاٹھیل

قیصل کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔ یہ نہیں وہ لوگ انپکڑ وارث کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اسے جو بھی کرنا تھا بہت جلدی کرنا تھا۔ وہ تیزی سے دایسے کے لئے دو اسکا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا ایک منٹ کے اندر اندر وہ چوٹی کی چادر پوشی پھیلا گئی۔ اس کا رخ رحمت علی کے گھر کی طرف تھا تھوڑی دیر بعد وہ موزر سائیکل پر چڑھا اور آندھی اور طوفان کی طرح تھانے کی طرف رواں دواں تھا۔

☆ ☆ ☆
جب مجھے ہوش آیا تو ردی کی ایک تیز لہر میرے جسم میں دوڑ گئی اور میں کراہتا ہوا جوش میں آ گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کا منظر کسی فلم کی طرح میری آنکھوں میں گھومنے لگا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی قبر میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے اپنے دائیں بازو میں بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی انجکشن لگایا گیا ہو۔ اچانک بدبو کا ایک جھوٹا میری ناک سے نکل گیا تو میرا ذہن چکرانے لگا میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا ایک قدم میں نے آگے کی طرف بڑھایا تو فضا میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز گونجی میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے پاؤں کے نیچے آنے والی چیز کو ہاتھ لگایا تو مجھے اپنا ذہن گھومتا ہوا محسوس ہوا ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرا دل ابھی پولیس کے بنجرے کو توڑنا ہوا باہر نکل آئے گا کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک انسانی کھوپڑی تھی۔

کھوپڑی کے تصور ہی سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا جب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہاں کا منظر دیکھ کر مجھے پورا کرہ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا کیونکہ یہ ایک جھوٹا سا کرہ تھا جس کی دیواروں سے نحوست ٹپک رہی تھی اور کمرے کے فرش پر جا جا ہڈیوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور خون کے نشانات بھی تھے جو اب سوکھ چکے تھے۔ ان کی غلاطت کی وجہ سے کرہ بدبو سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے مذبح خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ موت میری آنکھوں کے سامنے رقص کر



آخری دعا

کے راجپوت - کراچی

زندہ دل قوموں کے دل و دماغ میں وطن سے محبت اٹھ ہوتی ہے، وطن کی حفاظت کے لئے اگر لہو کے آخری قطرہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے تو وہ لہو بھی کیا اپنی جان تک وطن پر نہ جاوڑ کر دیتی ہیں اور پھر.....

رونگے کڑے کرتی..... رنگ و پے میں سنسنی پھیلاتی جسم پر لرزہ طاری کرتی کہانی

زندہ قومیں جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہوتی ہیں ایک امریکی جاسوس کی روداد جس پر ظلم و ستم کے خلاف لڑنے کے لیکن اس نے آف تک نہ کی اور نہ ہی دشمن کو ہار دینے کے لئے اپنی زبان کھولی، وہ اپنی ہنگامہ بازی کے لئے واقعات کو کچھ اس طرح بیان کرتی ہے کہ جب 1942ء میں امریکی فوجیں واپس ہاتان آنے لگیں تو ان فوجیوں کے ساتھ ساتھ ہاتان چل دیے، میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے شوہر کے قریب رہ سکوں، جو امریکی فوج میں تھا، جاپانیوں کے خوف سے ہم پہاڑیوں میں جا چھپے، اور جانوروں کی زندگی گزارنے لگے، ڈاکٹی پر بخار کا شدید حملہ ہوا تو میں ڈاکٹی کو بڑی مشکل سے سے چھپتے چھپاتے نکال کر نیا پینٹی، جہاں مجھے اور ڈاکٹی کو ایک بچہ روک ساس نے پناہ دی، یہ میرے شوہر کے دور کے عزت تھے۔

منیر تھا کیونکہ شیدا نے اسکا یہی جلیا بتایا تھا۔ میں نے کاشفیل فیصل کو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ لٹا دیا! ”خان ان سب کو کس کر باندھ دو اور انہیں ہوش میں لے آؤ۔“ منیر نے اس نقاب پوش سے کہا جو سب سے آگے تھا۔

خان ایک الماری کی طرف گیا اور وہاں سے ایک رسی لے آیا اور سب کو کس کر باندھ دیا اور دوبارہ اس الماری کی طرف گیا تھوڑی دیر بعد ایک شیشی اور انگلشن لے آیا۔ سب سے پہلے اسے ہوش میں لے آؤ۔ لگتا ہے یہی انکا لیڈر ہے منیر نے فیصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

خان نے فیصل کو وردی کے اوپر سے انگلشن لگا دیا۔ پانچ منٹ گزرنے کے بعد کاشفیل فیصل نے کسمسا شروع کر دیا شاید وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ میں اس وقت ان سب سے پیچھے کھڑا تھا۔

اس وقت ہال میں تقریباً بارہ آدمی تھے جن کے ہاتھ میں رٹکلیں تھیں اور ان سب کی توجہ فیصل کی طرف تھی۔ جواب تک ہوش میں آ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ منیر کوئی بات کرنا چاہے ہال گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور چیخوں سے گونج اٹھا۔ سب ہی جو فیصل کی طرف متوجہ تھے بے اختیار اچھل پڑے اور دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے چمکتی چلی گئی کیونکہ اس کے بارہ ساتھیوں کی لاشیں پھیلی کی طرح تڑپ رہی تھیں اور ان کے جسم سے خون کے فوارے سے بھی تیزی سے نکل رہا تھا۔

”من..... شیدا.....“

تو نے..... تنگ..... کیا کرو یا؟“

حیرت کے مارے منیر کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”شیدا تو منکر نکیر کو جواب بھی دے چکا ہوگا۔ مسز منیر“ میں نے اپنا نقاب کھینچتے ہوئے کہا تو منیر بے اختیار اچھل پڑا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو کیونکہ اس کے سامنے شیدا انہیں بلکہ میں کھڑا تھا۔ جب کہ وہ مجھے اپنے ذہن سے بھی جھوکر چکا تھا مجھے زندہ دیکھ کر فیصل کا مڑھایا ہوا چہرہ بے اختیار کھل اٹھا۔



مجھے جاپانیوں سے سخت نفرت ہو گئی تھی، میں نے جب بیج روک ساس کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا کہ میں جاپانیوں کے خلاف جاسوسی کروں گی اور ملکی ساحلی علاقہ میں ایک ٹائٹ کلب کھول کر جاپانی جہازوں کی آمد و رفت دیکھوں گی اور جاپانی گاؤں سے معلومات حاصل کر کے امریکی فوجیوں کو روک دوں گی تو بیج روک ساس نے مجھے بہت سمجھایا کہ ”میں ایسی حرکت نہ کروں، کیونکہ جاسوسوں کو کبھی نہ سمجھی پکڑی لیا جاتا ہے اور پھر ایسے لوگوں کا انجام بہت ہی عبرت ناک ہوتا ہے۔“

میں کچھ عرصہ قبل مادام ڈوٹ کے نام سے جو میرا فرضی نام تھا ”ایٹانی“ کے شانہ کلب میں جاپانیوں کی ناک کے نیچے دو ماہ تک گلوکارہ کا کام سرانجام دے چکی تھی اور کسی کو کچھ پر شبہ بھی نہیں ہوا تھا، میں نے اپنی گلوکاری کے دوران جاپانیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، خوش قسمتی سے میری جلد کی رنگت زیتونی اور بال سیاہ تھے اسی لئے مجھ پر امریکی ہونے کا شبہ ہی نہیں کیا گیا، ٹائٹ کلب کے حوالے سے میں نے اپنی کوششیں شروع کر دیں دو ماہ تک میں نے فلیلا کے شانہ کلبوں کے ساتھ ہی جاپانیوں کے کردار کو بخوبی دیکھا اور بغور اس کا جائزہ لیا، میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں ٹائٹ کلب کو سنبھال سکتی ہوں دیگر یہ کہ اپنے کلب کی اہمیت جتانے کے لئے میں عام شانہ کلبوں سے زیادہ قیمت وصول کروں اس کے ساتھ ساتھ کلب صرف جاپانیوں کے لئے وقف ہو دیگر افراد کیلئے کلب میں آنے پر پابندی ہو، چونکہ قیمت زیادہ ہوگی تو عام آدمی وہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکے گا اور یہی میرا مقصد تھا اور اگر میں اپنی اس سوچ پر عمل کرتی تو اپنے دیرینہ مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اپنی ہیرے کی انگلی اور کلائی کی گولڈن گھڑی رہن رکھ دی، اس سے مجھے اچھی خاصی رقم مل گئی اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ”اسیکا“ کے ساحلی علاقے میں میں نے ایسی جگہ تلاش کر لی، جہاں سے میں بندرگاہ میں جہازوں کی آمد و رفت کو بآسانی دیکھ سکتی تھی، معقول جگہ کے حصول

میں کامیابی کے بعد یہیں میں نے اپنا کلب کھول کر کلب کا نام جاپانی طرز پر ”زوہا کی کلب“ رکھا۔ زوہا کی جاپانی زبان میں ایسی چیز کہتے ہیں جو بڑی ہو اور ناممکن الحصول بھی، میں نے ایک لڑکی کو کارا، کولڑکیوں پر منتقل کی حیثیت سے ملازم رکھا، اس لڑکی کو میرے ارادوں کا علم تھا اور کی مرتبہ میری جان بچا چکی تھی، وہ ایک اچھی ملازمہ کے ساتھ ساتھ میری با اعتماد سہیلی بھی بن گئی۔“

15 اکتوبر 1942ء کو ہمارے شانہ کلب کا افتتاح تھا، میں روزانہ اس میں تیار ہو کر کھڑی ہو گئی، کوئی جاپانی افسر آتا تو میں تعظیماً جھک کر اسے ”کوماند“ (شام کا سلام) عرض کرتی اور اس کو میز تک لے جاتی، جہاں ایک میزبان لڑکی اپنے لئے چن لیتا، اس زمانے میں شانہ کلب کے بہت شانہ کلب بننے میں صرف شو کرتے تھے، میرے کلب میں اس قسم کے شور و زائد ہوتے تھے، کوکارا، جاپان کے رومانی گیت گاتی اور دوسرے لڑکیوں کے اور لڑکیاں مقامی رقص کرتے۔“

ابتدائی ایام میں ہمیں چند مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، شروع میں جاپانی مجھے اور دوسری لڑکیوں کو اپنے مخصوص آوارہ انداز میں دیکھتے تھے ان کو بہت ہی مشکل سے سمجھانا پڑا کہ یہ جگہ اس قسم کی نہیں ہے لیکن ہٹ دھرم جاپانیوں کو خفصہ جاتا، اس کے لئے بعض دفعہ میں جاپانی افسروں کے طمانچے بھی کھانے پڑتے لیکن میں نے اپنا سخت طرز عمل جاری رکھا، یہ صرف شانہ کلب تھا، فلاحی ادارہ نہیں، آہستہ آہستہ یہ مشکل ختم ہو گئی لیکن دوسری مشکل ابھی باقی تھی، گاؤں کے کلب کو بہت ہونگا سمجھتے تھے میں نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ ہمارا کلب بہترین انداز میں تفریح پیش کرتا ہے اس پر اخراجات بھی دیے جاتے ہیں میرے سمجھانے پر آخر کار گاؤں کے لوگ ہونے لگے اور کلب کی رنگینیاں عروج پر نظر آنے لگیں۔ عموماً جو بیڑا افسران بیڑے کے بعد بول کوئی پرچکا چور کر دیتے اور بغیر رقم دے کلب سے چلے جاتے تھے ایک مرتبہ تو خواہش کی حد ہوئی ایک ظالم افسر نے

میری مالی بول ایک میزبان لڑکی کے سر پر دے ماری ہوئی چٹا ہوا کلب سے چلا گیا۔ چونکہ میزبان لڑکی کے سر سے خون بہنے لگا تھا اس لئے اسے فوری طور پر فرسٹ ایڈ دی گئی اور اسے آرام کرنے کے لئے کمرے میں ایک بیڈ پر لٹا دیا، اگرچہ جاپانیوں کی طرف سے حکم تھا کہ افسروں کی بد اخلاقی اور ان سے جو نقصان کلب کو ہوتا ہے اس کی نورا اطلاع دی جائے مگر میں ارادہ ان کی شکایت کو جس سے چشم پوشی کرتی، کیونکہ میں ان کا مکمل احترام حاصل کرنا چاہتی تھی اور دشمنی کے بجائے مصالحت سے کام لیتی، جاپانیوں نے دوران جنگ رقص پر قطعی پابندی عائد کی ہوئی تھی، کیونکہ ان کے نزدیک رقص فوجی غور کے مذاق اڑانے کے مترادف تھا، مگر اکثر جاپانی افسر میزبان لڑکیوں کو رقص کے لئے مجبور کر دیتے تھے۔ ایک رات جاپانی فوجی پولیس کا ایک آدمی کلب میں آیا ایک کپٹن کے جو اس وقت ایک میزبان لڑکی کے ساتھ کمرے میں تھا زور سے تھپڑ مار دیا کپٹن کا چہرہ اپنی تھک اور غصہ سے سرخ ہو گیا لیکن کپٹن نے بغیر کچھ کہے اپنا رقص ختم کر دیا، مجھے اس واقعہ کو دیکھ کر بہت برا لگا، بولی، کہ اب جاپانی میرا کلب بند کر داریں گے اور جس مقصد کے لئے میں نے اتنے پار پیسے ہیں خرچ ہو جائے گا، فلی کوکارا نے میری ہمت بندھائی، ”نہن۔“ آپ گھبرا نہیں، یہ سب کام مجھ پر ہوا کریں، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی اور یہ بدترکی ہوسا دہی ختم ہو جائے گا۔“

فلی کوکارا اور ایک میجر نے اس جاپانی فوجی پولیس کو دیکھا، اس سے سمجھایا کہ ہم نے خود کشی کے رقص کی مشق کیا تھا، لیکن ہمیں مجبوراً کپٹن کی مرضی سے اس کے خلاف وٹ رہنا پڑا، میجر نے پولیس کو کچھ رشوت دی کہ وہ کپٹن اس نے وہ شکایت نامہ چھڑا جو وہ پہلے لکھ چکا تھا اس واقعہ کے بعد سے مجھ پر مکمل اعتماد رہا۔ جاپانی افسروں کا راتوں کو تانہ بندھا رہتا تھا، ان کی مشق خراب ہوتا جا رہا تھا، اور اصل کام کا نہ کیا جاتا تھا، میں نے کپتان جان بون سے

جو امریکی گوریل فوج کا باتان میں کاٹر تھا رابطہ پیدا کیا میرا غصہ تام ”ہائی پائکس“ تجویز کیا گیا، میں کھانے پینے کی چیزوں کے ناموں کو اپنی اطلاع کی ترسیل کے لئے استعمال کرتی تھی، اگر میری فراہم کردہ اطلاعات بہت اہم ہوتیں تو کپتان جان بون جواباً ”پھلیاں بہت مزیدار تھیں“ لکھتا اور اطلاعات کے غیر اہم یا ناقابل عمل ہونے پر لکھتا۔ ”سبزی آتے آتے خراب اور ہاسی ہو گئی۔“

آخر کار دوسری ہوا جو ایسے کاموں میں ہوتا ہے، ہمارا سب سے پہلا پیغام پکڑا گیا۔ اور اسے معلومات حاصل کرنے کے بعد گولی مار دی گئی، دوسرا پیغام محفوظ رہا، اس کے جوئے دو ہرے تلے کے تھے، ہم اپنے پیغامات اس کے جوتوں کے تلوں میں چھپا کر بھجواتے یا کبھی کبھی ہم کیوں کے سمجھے میں سے ایک کیلے کی چھال اتار کر پرچہ اس کے اندر رکھ دیتے اور کیلے کی چھال کو پراپر کر دیتے، مہینے میں ایک دفعہ میں اپنی فراہم کردہ اطلاعات ادویات اور غذاؤں کے بینکوں کے ساتھ بھیجتی، اگر کوئی بہت اہم بات ہوتی تو میں ایک لفظی خدمت گار کو اطلاع کے ساتھ فوراً کپتان جان بون کے پاس روانہ کر دیتی، میں جاپانی جہازوں کی نقل و حرکت کے بارے میں اور ان کی منزل مقصد کو خبریں پہلے فرصت میں جان بون تک پہنچانے کی کوشش کرتی، میری یہ جلد بازی کی کوشش خطرناک بھی ہو سکتی تھی مگر میں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور اپنے عمل کو جاری رکھا۔

ایک رات میں اپنے شانہ کلب میں ایک جاپانی افسر سے گفتگو ہوئی کہ اچانک اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”میں نے آپ کو اس سے پہلے ہی کہیں دیکھا ہے؟“ میں نے سوچا کہ اس نے پہلے مجھے ”ایٹانی“ کلب میں دیکھا ہوگا، میں نے اس سے پوچھا۔ ”پہلے کب؟“ جناب میں ایک زبردست گھونٹ میرے چہرے پر پڑا۔ اور میں لڑکھڑاکر فرش پر گر گئی۔ وہ انتہائی غصے سے دھاڑا۔ ”تم لوگ ہمیشہ جاپانیوں کے آنے سے پہلے زمانے کی باتیں کرتے ہو، یہ بات تمہیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ذیل امریکن ہمیشہ کے لئے جا چکے ہیں

اور اب یہاں جاپانیوں کی حکمرانی ہے۔

ان سب مشکلات کے باوجود میں نے اپنا کام جاری رکھا، کبھی کبھی مجھے اپنی محنتوں کا علم فوری ہو جاتا تھا، ایک طیارہ بردار بحری جہاز (ایئر کرافٹ کیئر) کا کپتان فلی کوکارا کے گانے پر بری طرح فریفت تھا، اس افسر کی الوداعی پارٹی کے موقع پر فلی کوکارا نے اس سے نہایت مکاری سے کہا۔ ”اب آپ جا رہے ہیں، میں آپ کو کس پتے پر خط لکھوں؟“ کپتان نے بتایا کہ وہ پہلے سنگاپور اور پھر رابول جائے گا۔ میں نے یہ اطلاع فلی سے حاصل کر کے فوراً کپتان جان بون کے پاس پہنچادی اس کے کچھ ماہ بعد ایک جاپانی افسر نے فلی کو بتایا۔ ”تمہارے ایئر کرافٹ کیئر کے کپتان اور اس کے پورے عملے کو امریکیوں نے تباہ کر دیا تھا۔“ میں نے اور فلی نے نہایت مکاری سے اپنے افسروں کا اظہار کیا۔ ایک رات جبکہ کلب کی روٹیں حسب معمول اپنے عروج پر تھیں، ایک جاپانی آبدوز بیڑے کا کمانڈر میرے کلب میں آیا، کچھ ہی دیر بعد وہ مجھ پر بہت مہربان نظر آنے لگا، میرا خیال تھا کہ سان فرانسسکو میں اس نے میرا پنکھا قفس دیکھا ہوگا، یہ قفس بالکل برہنہ ہو کر کیا جاتا ہے اس نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں پنکھا قفس پیش کروں، میں نے اسے دوسری رات آنے کی دعوت دی، ہم نے بانسوں کی کچھڑیوں اور عمدہ کاغذ سے دوپٹے بنائے، فلی نے میرے جسم کی رنگت سے دم آہنگ ایک چشت اور چیکٹ ہوا لباس تیار کیا، ہال میں دم نے تمام روشنیاں بند کر کے سرخ روشنی پھیلا دی، وہ افسر اپنے چالیس ساتھیوں کے ساتھ آیا، ان لوگوں نے نظریں گاڑ کر دیکھا، میں واقعی برہنہ تھی، وہ دوسری رات بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا اس نے کہا۔ ”آج رات تم اور پنکھا قفس کرو، کیونکہ کل ہم سلومن جا رہے ہیں، اس اطلاع پر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔“ دوسری رات میں نے پنکھا قفس نہایت عمدگی اور کامیابی سے پیش کیا، اپنے جملہ امور سے فارغ ہو کر جاپانی آبدوز بیڑے کی روانگی اور منزل کی اطلاع کپتان

جان بون کے پاس پہنچاؤں میں مجبوری، چند مہینوں کے بعد ایک جاپانی افسر آیا، اور اس نے بتایا کہ آبدوز کا وہ بیڑہ بالکل تباہ کر دیا گیا ہے اور چند بچنے والے خوش قسمتوں میں سے وہ ہے۔

میرا شوہر کہا تھا ان کی کمپ میں قید تھا، وہ زمانہ تھا جب میں دونوں ہاتھوں سے دولت سیٹ رہی تھی، میری خواہش تھی کہ اپنے شوہر کی کچھ مدد کروں، میں نے بہت کوششوں کے بعد اس قیدی کی کمپ میں اپنا کچھ اشیاء بھیجا دیا، مگر مجھے یہ معلوم کر کے از حد افسوس ہوا کہ میرا شوہر دو ہفتے قبل مر چکا تھا، گوجاپانی یہ کہتے تھے کہ اس کی موت طیرا سے ہوئی ہے لیکن وہ دراصل فادہ کشی سے مر اٹھا۔ رابرٹ ٹیلر اور ٹی بی ڈی دو پادری تھے یہ دونوں ایک جاپانی قیدیوں کے جہاز پر دوسرے سولہ سو آدمیوں کے ساتھ تھے، اور جہاز جاپان جا رہا تھا اس جہاز کو تاریک و کور سے ڈیرے ختم کر دیا گیا تھا ان پادریوں نے مجھے امریکی قیدیوں کی مشکلات اور ان کی ضروریات کے بارے میں لکھا، میں قیدیوں کی مدد کرنے کی خاطر ”یوگروپ“ میں شامل ہو گئی، تاکہ میں قیدیوں کے لئے پیٹارم، کچھ رقم، غذا، ایندھن اور ادویات بھجوا سکوں، ہم لوگ قیدیوں کی چادروں کی تھکن درست کرتے اور ان کے موزوں کی مرمت کرتے، ہم قیدیوں کے لئے دوامی بھی خود بناتے، قیدیوں میں جاتیں ”ج“ کی کمی کی وجہ سے ہیری ہیری اور سکروڈ کی بیماریاں عام تھیں، ہم غذائی تاریکیوں کا رس پکا کر اس میں شکر ملا کر اور جگلوں میں ہرگز قیدیوں کے کمپ میں بھجوا دیتے، قیدیوں تک سامان پہنچانے کی خاطر چونکہ اردوں کو کھڑیوں، کیمروں اور کچرے کے نذرانے دینے پڑتے۔

ایک ہی وقت میں مخصوص رقم اور سیکڑوں پیٹا مات کمپ میں پہنچا دیے جاتے قیدیوں کا مددکاری میری تاجی کا پیش خیر ثابت ہوا، 23 مئی 1944ء کی صبح میں بہت بے چین اور تنگدست تھی کہ میز پر بیٹھی میری افسردگی کی وجہ سے بھی کرکین جو خفیہ طور پر کمپ میں بہت سی چیزیں لے جاتا تھا وہ بکڑیا گیا تھا۔

اچانک جاپانی فوجی پولیس کے چار افسر نہایت ہرے کلب میں داخل ہوئے، میں گھبرا کر اچھل پڑی دو افسروں نے ریوالور کی تالیاں میری ہاتھوں میں کاڑیں۔ ”تمہارے سب کاغذات کہاں ہیں، جلدی پل ڈیل عورت؟“ ایک افسر چلایا، میرا دل ڈوبنے لگا، حلق میں کانٹے سے جھپٹنے لگے، مجھے معلوم تھا کہ پاسوں کو یا تو گولی مار دی جاتی ہے یا ان کا سر قلم کر دیا جاتا تھا، انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور مجھے گاڑ روم لے گئے، آنکھوں پر پٹی بندھے مجھے ان کے سوالات کے جواب دینے پڑے۔

ایک آواز گونجی۔ ”ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے اب کچھ چھپانا بیکار ہے، ہائی پانکس، ہائی پانکس۔“ یعنی اپنا خفیہ نام سن کر مجھ پر سکتہ ساطاری ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں کو میرا کوئی خفیہ خط لکھا ہے، مگر میرا کون سا خط انہوں نے بکڑیا؟ اگر کپتان جان بون کے نام میرا کوئی خط بکڑیا گیا تو میرا خاتمہ یقینی ہے، جب انہوں نے میرا وہ خط پڑھنا شروع کیا جو میں نے پادری کے نام لکھا تھا تب مجھے پتہ چلا کہ میرا پیٹا بکڑیا جاتا ہے۔

انہوں نے پوچھا۔ ”کال کون ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ کالے سین من مقامی تارنگی کے نام کا مخفی ہے، اس خط میں پادری کو میں نے لکھا تھا کہ میرے پاس حکوں کی کمی ہے اور جتنے جگ آپ کے پاس ہوں فوراً بھجوا دیں۔“

لیکن جاپانیوں کو میری باتوں پر یقین نہ آیا، انہوں نے مجھے چھڑوں، لاتوں اور گھنٹوں سے خوب بٹاؤ مارا جاتے اور پوچھتے جاتے۔ ”یہ کال کون ہے اور جگ سے کیا مراد ہے، ہم بے وقوف نہیں ہیں کال ایک خیر لفظ ہے اور جگ ایک امریکی نام ہے۔“ مارے پینچے پینچے ہاتھوں نے مجھے بکڑیا پھر مجھے زیر دستی لایا گیا، میرے ہاتھوں، پیروں اور سر کو پٹی سے باندھ دیا گیا، اس کے بعد پانی کا پائپ میرے منہ اور ناک میں بھرا دیا گیا، جب اس میں پانی چھوڑا گیا تو مجھے ایسا

محسوس ہوا کہ جیسے میں پانی میں ڈوب رہی ہوں پھر میں بے ہوش ہو گئی، بے ہوشی کے دوران تکلیف کی شدت اتنی تھی کہ میں خوف سے جتنی ہوئی ہوش میں آئے ہوش میں آتے ہی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی، جاپانی میرے جسم کے مستوحشوں کو طی ہوئی سگریٹوں سے جلا رہے تھے۔ ”مسٹر ڈی، جون کون ہیں، اور کال کیا ہے؟ سوائے جھپٹنے چلانے کے اور کچھ نہ کہہ سکتا، جب میرے منہ میں وہ دوبارہ پائپ پھنسانے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ ”ڈی، جون کے متقی کسی انگریزی جاپانی لغت میں دیکھیں، انہوں نے پائپ میرے منہ میں بھنسا دیا، اور پھر دسی محل دہرایا، میری قوت برداشت چونکہ ختم ہوئی جاری تھی اس لئے مجھے بے ہوش ہونے میں دیر لگی۔

ایک مرتبہ پھر بے ہوشی کا سلسلہ ٹوٹا، میں جب دوبارہ ہوش میں آئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھ کچھ بند کر دی، ہر جاپانی افسر کی جیب میں ایک چھوٹی انگریزی جاپانی لغت ہوتی تھی، انہوں نے اس لغت میں ڈی جون کے معنی دیکھ لئے تھے، وہ لوگ باہر چلے گئے اور میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔

پھر مجھے تین ہفتے تک ایک کمرے میں بالکل تنہا رکھا گیا، مجھے روزانہ تین پیالے پانی اور ایک پیالہ ابلے ہوئے چاول بطور غذا ملتے تھے، میری ذہنی اور جسمانی حالت خراب ہوتی جاری تھی، ایک دن میں نے چند جاپانیوں کو جو میرے کمرے کے پاس کھڑے تھے اشاروں سے بتا دیا کہ مجھے اپنے گندے کپڑے دھونے کے لئے کچھ پانی کی ضرورت ہے، ایک جاپانی نے گند کی بالٹی میرے اوپر اٹھل دی، میرے بال چپکٹ ہو رہے تھے، جسم پر گرد اور میل کی تہیں جم چکی تھیں سر کے بالوں میں جوڑ کا راج تھا، میں بھتیجی کی شکل میں پہرہ فرس پریشی رہتی، کوئی بولے اور سننے والا نہ تھا، کبھی کبھار خود سے باتیں کرنے لگتی تو جاپانی سمجھتے کہ میں بالکل ہونگی ہوں یا ذرا سرگردانی ہوں۔

چوبیس گھنٹوں میں ایک پیالہ ابلے ہوئے چاولوں کی اہمیت ہی کیا تھی، میں غذا کی کمی کی وجہ سے کمزور ہونے

گئی تھی، جسم کا گوشت آہستہ آہستہ گھلنے لگا تھا، سگریٹوں سے جلاوا حصر علاج نہ ہونے کی وجہ سے کپٹنے لگا تھا، جسم پر جٹلے کے ایسے نشانات پڑ چکے تھے جن کی بدفہمی ختم نہیں ہو سکتی تھی میں ان تمام نشانوں سمیت قبر میں جانے کی سوچتی تھی، رہی سہی کسر تنہائی نے پوری کر دی تھی اکیلے پن کا شدید احساس ہوتا تھا، کبھی کبھی میں خود بڑوانے لگتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں، جاپانی مجھے دیکھتے بھٹتے اور پھر سب ل کر قہقہہ لگاتے، میں خاموشی سے صرف انہیں دیکھتی رہتی۔

تین مہینے گزرنے کے بعد حالات نے معمولی سی کروٹ لی، مجھے "سانا گو" قید خانے میں بھیج دیا گیا، جہاں مجھے دیگر گیارہ عورتوں کے ساتھ اسی فٹ لمبے اور میں فٹ چوڑے کمرے میں بند کر دیا گیا اگرچہ قید خانہ تو بہر حال سزا کٹنے ہی ہوتا ہے یہاں بھی قابل ذکر کوئی تبدیلی نہ آئی لیکن تنہائی کے عمل سے بہر حال جان چھوٹی تھی اس قید خانے میں بھی تین مہینے کا عرصہ گزر گیا، ندرت کا احساس ہوتا تھا، نندن کی خبر، مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا کہ میں اسی قید خانے میں پیدا ہوئی تھی اور میری سابقہ زندگی محض ایک خواب تھی۔

وہ شانہ کلب کی سر مشاوم رقبے اور دولت کی بے تحاشہ آمد سب کچھ خواب و خیال ہو کر رہ گیا تھا اور میں بھگتی کی مانند اس قید خانے میں پڑی تھی۔

آخر کار ایک دن ایک جاپانی افسر جس کو میں پہلے اپنے کلب میں دیکھ چکی تھی، میری کھڑکی کے قریب سے گزرا میں نے اسے بلایا، اور اس سے کہا۔ "کہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں، میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرے معاملے کو دوبارہ افسروں کے سامنے پیش کرے، تاکہ مجھے اس قید تنہائی اور جہنم سے نجات مل سکے، دو بچے سہہ پہر میں پھر باز پرس کے لئے لے جائی گئی جاپانی ہمیشہ گہری نیند میں سے قیدیوں کو اس لئے اٹھاتے ہیں کہ اس طرح قیدی شاید نرم پڑ جائیں اور اصل حقیقت اگل دیں، و دران تفتیش مجھے یہ بتایا گیا کہ ایک خاص خط جو میرے معاملے میں بہت اہمیت رکھتا تھا وہ نہیں کم ہو گیا

ہے مگر دوسرے خطوط موجود ہیں ایک خط میں تو میں نے بیوقوفی کی حد کر دی تھی میں نے لکھا تھا کہ "میں ایک امریکی عورت ہوں، اور جاپانیوں کو اس حق بتانے کے لئے ایک جاپانی کلب چلا رہی ہوں۔" یہ خط اب ان لوگوں کے پاس تھا، اور اس خط پڑھ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ "پھر وہ چیخنے لگا۔" اے پاگل عورت تو نے جاپانیوں تک اس لئے رسائی حاصل کی تھی کہ تو ان کی جیب، ڈسٹیل امریکیوں کی خاطر خالی کر داسکے۔"

جاپانوں نے مجھ پر اذیت کے مختلف ہتھکنڈے استعمال کے طرح طرح سے مجھے شدید اذیتیں پہنچائیں انہوں نے میرے ناخنوں میں میٹھیں ٹھوک دیں درد کی شدید لہر میرے جسم کو چیرتی ہوئی پاؤں تک چلی گئی، میں بالکل بے حال ہو گئی اس وقت اگر میں ان کے سوالات کے جواب دیتا بھی چاہتی تو شدید تکلیف اور اذیت کی وجہ سے نہ دے سکتی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک پرانے ہسپتال کی کیمپ میں لے جایا گیا، یہ کیمپ سانا گو کیمپ کے زیر عمل تھا جب میری آنکھوں سے پٹی گھولی گئی تو مجھے ایک جاپانی افسر ہاتھ میںنگلی چمکتی کھوار لئے ہوئے نظر آیا اس نے مجھے جھک جانے کا حکم دیا مجھے کھوار کی دھار اپنی گردن پر محسوس ہوئی جاپانی افسر نے کہا۔ "یہ تمہارا آخری وقت ہے، اگر وہ عام گتھی ہے تو مانگ لو۔"

شاید اس موقع پر میں کچھ جدوجہد کرتی کیونکہ موت کے اور میرے درمیان کچھ فاصلہ نہ رہا تھا لیکن قوت مدافعت بالکل ختم ہو چکی تھی، رنخوں سے چادرم خود میرے قابو میں نہ رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ میں حرکت کرنے کے بھی قابل نہ رہی تھی، ہر طرف ایک بھیا تک خاموشی کا راج تھا، وقت تند تیز سیلاب کی مانند گزرتا جا رہا تھا، کھوار کی دھار مجھے اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھی مگر میں اپنی زندگی اور موت سے بے نیاز اپنے خدا کے حضور گڑ گڑا رہی تھی میری آنکھیں بند تھیں لیکن میں محسوس کر رہی تھی کہ جاپانی افسر کی نظرس میرے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں، آخر کار جاپانی افسر نے ٹولی

چوٹی انگریزی میں کہا۔ "اے بہادر عورت، ہمیں امید تھی کہ تم اس مرحلے پر کچھ نہ چمچا سکو گی اور وہ سب کچھ ہمیں بتا دی گی جس کی ہمیں ضرورت ہے مگر تم اس مرحلے پر بھی خاموش رہی ہو یقیناً تم مجرم نہیں ہو، اس لئے ہم یقین کرتے ہیں کہ تم بے قصور ہو۔" وہ بولے جا رہا تھا اور مجھ پر ٹی جھاری ہوئی جا رہی تھی، اس کی تقریر کا آخری حصہ میں اس لئے نہ سن سکی کہ میں بے ہوش ہو کر آگے کی جانب ڈھلک چکی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے نما کوٹھری میں پایا، ابھی میں کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک جاپانی ہاں داخل ہوا اور مجھے دھکیلا ہوا ایک ہال نما کمرے میں لے گیا، یہاں اور بھی جاپانی موجود تھے وہ مجھ پر کورٹ مارشل کا مقدمہ چلانا چاہتے تھے، میں نے اپنے وقار میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک زوردار گھونہ مہرے منہ پر پڑا، گھونسا اتنا شدید تھا کہ اس سے میرا ایک دانت ٹوٹ گیا، ایک آواز نے مجھے ڈانٹا۔

"تم صرف یہ توقع کی جاتی ہے کہ تم صرف یہ مانو کہ تم مجرم ہو کر نہیں، اس کے علاوہ کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔" گو پہلے میں بہت خوف زدہ تھی، مگر دانت ٹوٹنے کے بعد پتہ نہیں لگیوں مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا، شاید میں اذیت سہنے کی عادی ہو گئی تھی، مجھے یہ سن کر بہت تعجب اور حیرت ہوئی کہ مجھ پر ایک اور مقدمہ چلنے والا ہے اور وہ یہ کہ میں نے جاپان کی شاہی حکومت کے خلاف کام کیا ہے، جب مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ اس سلسلے میں میں کیا کہنا چاہتی ہوں تو میں نے بے ساختہ اس جرم کا قرار کر لیا، میری گورنر شہ حالت ایسی تھی کہ مجھے زندگی سے محبت بدرجہاں بہتر نظر آتی تھی، میرے عتراف جرم کے بعد مجھے تین سال فیڈ یا مشقت کی سزا سنائی گئی۔

اگلے دن مجھے اس کوٹھری سے عورتوں کی جیل پہنچایا گیا اگرچہ یہ جگہ بھی بہت اچھی نہ تھی مگر دوسرے جیلوں اور کوٹھری کی تنہائی کے مقابلے میں عورتوں کی یہ ٹیکل جنت معلوم ہوئی تھی چونکہ جاپانی جیل کی عورتوں لکھانے کے لئے برائے نام غذا دیتے تھے عموماً اسلے

ہوئے چاول یا آلو اور وہ بھی اتنی کم مقدار میں کہ ایک بچے کا بھی پیٹ نہ بھرے، پھر یہ کہ نہ انتہائی کم غذا ابھی چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ دی جاتی تھی اس لئے قیدی عورتیں کبھی قافذ کشی کرتیں اور کبھی کٹیلے کے لئے لبال کر پیٹ کا جہنم بھر تیں، ہم پر ایک فلکیٹی عورت گراں تھی اور ہم عورتیں کھیتی باڑی اور باغبانی کا کام سر انجام دیتی تھیں یہ گراں عورت بہت ہمدرد اور مہربان تھی اور صرف یہ چاہتی تھی کہ جس دن جاپانی افسر معائنہ کے لئے آئیں تو اس دن باغ کو خوب اچھی طرح سنوار دیا جائے میں نے باغ سے مختلف قسم کے پھولوں کا رس اپنے رنخوں پر لگایا تو وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگے، اب ومارغ بھی کچھ سکون پایا جا رہا تھا جیل میں کسی قسم کی اذیت اور پریشانی نہیں تھی ہم تمام عورتیں سارا دن باغبانی کرتے اور رات کو پاؤں پھیلا کر زمین پر آرام سے سو جاتے زندگی کا کارواں یونہی رواں دواں تھا، ہم دن اور رات کو بھول چکے تھے بس صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ ہماری زندگی اور دنیا کی جیل ہے۔

لیکن وقت کبھی یکساں نہیں رہتا، ہر رات کے بعد صبح ضرور طلوع ہوتی ہے، ہماری زندگی میں بھی بلا آخر صبح طلوع ہو گئی وہ 10 اپریل 1945ء کا دن تھا، جب اتحادی فوجوں نے ہمیں اس قید خانے سے نجات دلائی۔ میں پریشان حال شگے جیروں ہی بھاگ کھڑی ہوئی، آزادی کے تصور نے مجھے دیوانہ سا بنا دیا تھا، یہ خیال کہ میں اب اپنے شانہ کلب جاسکوں گی، اپنی بیٹی ڈانٹی سے مل سکوں گی اپنے ملک کی آزادی کا احساس لے سکوں گی پرست اور خوشگوار خیالوں کی یلغار تھی جس نے مجھے خوشی سے پاگل کر دیا تھا۔

آج میں اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی حصوں پر جاپانی افسروں کے جٹے ہوئے سگریٹوں کے داغ لئے پرست زندگی گزار رہی ہوں، مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی قوم کی آزادی کے لئے حب الوطنی کے جذبے کا بھرپور مظاہرہ کیا۔



دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرنی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرنی، لرزیدہ لرزیدہ نہرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرنی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کھانی۔

جس اور سسٹم سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو درمیان حیرت میں ڈال دیں گے

پھر اس نے نورانی لپک کر کٹا ہوا سر اٹھالیا۔ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”تم نے کتنے غرے دکھائے..... میرے قابو میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں..... لیکن میں نے تمہیں کتنی آسانی سے بے بس کر دیا..... تم نے میرے چہرے پر تھوکا..... اپنے لیے لے لے ناخنوں سے پہلے تو میری آنکھیں پھوڑنے کی کوشش کی..... جب آنکھیں نہ پھوڑ سکیں تو نہ صرف میرے چہرے بلکہ جسم پر بھی خراشیں ڈال دیں..... کیا فائدہ ہوا..... آخر میں نے تمہاری عزت پامال کر دی..... اپنی عزت جسے بچانے کے لئے تم نے نہ جانے..... کیا کیا جتن نہیں کئے..... لیکن ناکام رہیں..... آخر جیت میری ہوئی.....“

پھر وہ توقف کر کے اس کے زخروں سے رستا نکلتا لہو پیئے اور زبان سے چائے لگا..... پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا.....

پھر اس نے دیوار میں نصب تھیں کاٹن دہایا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے آنکھیں سنیں..... دو آدمی آئے جو چہرے مہرے اور منہ قلع سے پیشہ و قاتل لگ رہے تھے۔ جب وہ کمرے میں گئے تو اس نے کہا۔

”یہ لاش لے جاؤ..... اس کی کھال اتار کر لے آؤ..... اس کا سر ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دینا.....“ پھر وہ دونوں بد معاش اس لڑکی کا سر اور لاش لے گئے۔ وہ لڑکی بمشکل سولہ برس کی ہوگی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں بہت خوب صورت اور اس کا جسم بھی بہت خوش تھا۔ میں اس جگہ سے نکل کر اس لئے جانیں سکتا تھا مجھے اس کمرے کے سامنے سے گزرتا تھا۔ دروازہ نہ صرف کھلا ہوا تھا بلکہ وہ بے چینی سے کسی وحشی بھوکے درندے کی طرح ٹہل رہا تھا۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھوک سے بے تاب ہو رہا ہو..... اس لڑکی کا خون پینے سے جیسے اس کی بھوک کھل اٹھی ہو۔ کئی دقتوں کا بھکا ہو۔

”کیا یہ ڈر نکولا ہے.....؟ میں نے دہشت زدہ ہو کر سوچا۔ میں نے اس کی ظلم اور دو جین ناویس پر مبنی تھیں۔ جو انسانی خون پی جاتا تھا۔ وہ تو قہر کہانی تھی..... شاید اس کا وجود بھی ختم ہو گا..... میں نے اس کی تمام کہانیوں کو فرضی کہا تھا۔ اس لئے کہ صرف چڑیلیں تھیں جو انسانی خون کی پیاسی ہوتی تھیں اور..... خون پی جاتی تھیں۔

مجھے یہ یقین کرنا اور تسلیم کرنا پڑا کہ..... ڈر نکولا کا جو دھماکا..... وہ کوئی بدروح تھا۔

لیکن یہ کوئی بدروح نہ تھا۔۔۔ بدروح ہوتا تو ظاہر ہو جاتا۔۔۔ میں نے اس کا عکس آئینے میں دیکھا تھا۔ وہ ایک صہذب انسان نظر آتا تھا۔۔۔ نہ تو اس کے دانت تو کیلے اور خون خوار تھے۔ عام آدمیوں کی طرح تھے۔۔۔

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکی کی لاش لائے اور اس کمرے میں ایک کھوٹی سے نکادیا اور چلے گئے۔ مجھے وہ جانور یاد آگئے جنہیں فوج کرنے کے بعد نکال دیا جاتا تھا کہ کھال اتاری جائے۔ اس وقت لڑکی کی لاش بغیر کھال کے تھی۔ اس کا گلایہ گلابی چہرہ مرد تازہ تھا۔۔۔ لاش کی کھال بڑی نفاست طریقے اور سلیقے سے اتاری ہوئی تھی۔

اس نے میز پر رکھا ہوا چھرا اٹھایا۔۔۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ ڈر کیولا کی طرح۔۔۔ کسی خون آشام درندے کی مانند کچا کھانے لگے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے مختلف جگہ کے گوشت کا لے اور ایک آدم خور کی طرح مزے لے لے کر طعنے سے نیچے اتارنے لگا۔

میں اگر مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو خوف و دہشت سے شاید بے ہوش ہو جاتا۔ میرے اعصاب مضبوط اور قوی اس لئے تھے کہ میں جنگل میں لرزہ خیز مناظر دیکھنا چلا آ رہا تھا۔ میں نے صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ جنگل میں درندوں کو نہ صرف ایسے جانوروں کو چیر پھاڑ کر کھاتے دیکھا تھا جو ان کے مقابلے میں کم زور اور بے ضرر سے تھے۔ وہ ان موذی درندوں کو بال تک بیکانہیں کر سکتے تھے۔۔۔ عام جانوروں کو درندوں کا چیر پھاڑ کر کھانا ایسا خوف ناک لرزہ خیز نہیں جتنا ان کا انسانوں کو کھانا۔۔۔

انسانوں کا شکار کر کے انہیں کھانا سب سے دل خراش منظر ہوتا تھا۔ جب وہ چیر پھاڑتے تو آتما لرز جاتی تھی۔ وہ ایک مرتبہ تو میں بے ہوش بھی ہو گیا تھا۔ ایسا بھی ایک منظر ایک آدمی دیکھنے سے رہا۔

میرے لئے ایک ایک بل کی صدی کی طرح ہماری اور اذیت ناک تھا۔ جب میں نے قدم بڑھایا

تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ساری طاقت سلب ہو کر رہ گئی ہو۔۔۔ فکس میں خون خشک ہو گیا تھا۔۔۔ ساری ہمت جواب دے چکی تھی۔ چوں کہ مجھے اپنی جان پیاری تھی۔ زندگی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی ہے۔

مجھے اپنی زندگی سے زیادہ فکر اپنی بیوی اور لڑکیوں کی عزت اور جان کی فکر تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں اور کس لئے میری بیوی اور لڑکیوں کے حصول کے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ان کو دس کا نشانہ بنائے۔ پھر ان کی قابل اعتراض جسم کی فلمیں بنائے۔ پھر اپنے ساتھیوں اور آدمیوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے حوالے کر دے۔ جب وہ جی بھرے کہ ان سے کھیل لیں تو ایک ایک کر کے انہیں فوج کر دے۔ پھر ان کی کھال اترا کر ان کا کچا گوشت کھا جائے۔ خون پی جائے۔

مجھے ہر قیمت پر ان کی عزت اور زندگی بچانا تھی۔ انہیں تحفظ دینا تھا۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ کیوں کہ اس شیطان نے سب سے خطرناک بدحاشوں کو میری بیوی اور لڑکیوں کے انوکھے لئے پیچھے لگا دیا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ میں اس کی شرط پوری کرنے سے کاسر ہوں۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ اس شیطان نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری بیوی اور لڑکیوں کی فلم سپر ہٹ جائے گی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے گلا گھونٹ کر ختم کر دیتا۔

میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت جمع کی۔ میرے ہر کون کن ہماری ہور ہے تھے۔ میرے لئے ایک ایک قدم آگے کرنا ایسا ہی تھا جیسے صدی کی مسافت طے کر رہا ہوں چوں کہ جان پر بنی تھی۔ اس لئے اپنے آپ کو جبر سے گھمٹتا ہوائی کی طرف بڑھا۔

میں نے بہ مشکل چند قدموں کی مسافت طے کی ہوگی۔ وہ تو خون خوار شکاری کتے اچانک جانے کہاں سے نکل کر آیا میری بوسونگہ کر میری راہ میں حائل ہو گئے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ پھر مجھے اچانک اس کی متش جی پی ٹی کا خیال آیا تو میں نے اسے نکال کر ان کی نظروں کے

سامنے لہرایا۔ اگر لکھ بھری کا خیر بھی ہو جاتی تو وہ مجھ پر جلتا اور ہو چکے ہوتے اور میری نکال پٹی کر دیتے۔ میں کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا ندی پر پہنچا۔ وہیں بارہ جدید ترین چھوٹی بڑی کشتیاں کنارے کھڑی تھیں۔ میں ایک موٹر بوٹ پر سوار ہو گیا۔ میں نے اس کا انجن اس لئے اسٹارٹ نہیں کیا تھا کہ رات کی خاموشی میں اس کی آواز پھرے دار سن لیتے۔ وہ اس وقت منوعہ قلم کی شوٹنگ دیکھ رہے تھے۔ اور پھر شیطان شاید ہوش میں آچکا ہو۔ وہ اس کی آواز سن کر چونک جاتا۔ پھر میں کشتی کو دور تک لے آیا۔ پھر اس کا انجن اسٹارٹ کیا۔ پھر ایک سمت چل پڑا۔

مجھے نہیں معلوم تھا یہ راستہ کدھر جاتا ہے۔ منزل کون سی ہے۔ میں جھرمٹا اٹھا اور چلا جا رہا تھا۔ طے میں ایک خوف دامن گیر تھا کہ مجھے اچانک غائب پا کر ہرے تعاقب میں کوئی بدحاش نہ آ رہا ہو۔ میں بار بار لیٹ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں بھٹکتا رہا۔ جب پوچھنے لگی تو مجھے دور سے نورسٹ گاؤں کا دفتر نظر آیا۔ چپ چپ کا ابالا پھیل چکا تو دفتر جانے سے پہلے میں نے کشتی روک دی۔ ہوا دیکھا جو لوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ امریکی ڈالروں اور ہندوستانی کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔ سو سو ڈالر کے سوٹ تھے اور ہندوستانی کرنسی دس ہزار روپے تھی۔ میں نورسٹ گاؤں کے دفتر جانے کے بجائے ایک ہوٹل میں آ گیا۔ ایک کرا کر پرے کر سونگیا۔ دن کے اجالے میں گھر جانا میرے لئے خطرناک تھا۔ میں مغرب کے وقت پھر اتر آیا۔ مجھے جانے کی طلب ہوئی تو میں نیچے آیا۔ بھوک بھوک رہی تھی۔ ہوٹل کا ہال خالی تھا۔ میں کھانا کھا رہا تھا تو اس وقت دو بدحاش کھانے کے ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن میں نے انہیں پہچان لیا۔ بہ بھگور شہر کے خطرناک غنڈے تھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ نہ صرف لاش اور تعاقب میں آئے ہیں۔ یہ میری غلط فہمی تھی۔ ان دونوں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ ویٹر جب آرڈر لے کر چلا گیا تو ایک بولا۔

”یار جندہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس

بلک ٹائیگر کو کہاں تلاش کریں؟ حرام زادہ مر کے سینک کی طرح غائب ہو گیا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ ریش۔۔۔ وہ اپنی محبوبہ کو تباہ سے ملنے اور اس کی حراج پری کے لئے جاتا رہا ہے۔“

”اب ہمیں بہت ہوشیاری سے ایسا منصوبہ بنانا ہے کہ وہ بچ نہ سکے۔“ ریش نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ اب نہیں بچ سکے گا۔“ جندہ بولا۔ ”ہم اس کی کار میں بم نصب کر دیں گے۔ جب وہ گاڑی اسٹارٹ کرے گا تو ریوٹ سے اڑا دیں گے۔“

”لیکن کتنی ایسا نہ ہو کہ راہ گیر غور میں اور بچے اس دھماکے سے متاثر ہوں۔“

”بلا سے۔۔۔ وہ مرتے ہیں مرنے دو۔“

جندہ نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”پاس نے کیا کہا۔۔۔ ٹائیگر کو موت کے گھاٹ اتارتے وقت یہ مت دیکھو کہ۔۔۔ ساتھ میں کون رو رہا ہے۔“

”وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میری سماعت غیر معمولی طور پر تیز ہے۔ ان کا منصوبہ اور باتیں سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں ساکت و جامد ہو گیا۔ خون رگوں میں بھج رہا تھا۔

میری نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور ذہن ماؤف ہو گیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ جب نظروں کے سامنے سے تار کی چمٹی تو میرا معطل دماغ کسی قابل ہوا۔ مجھے اچانک تمہارا خیال آیا۔ میں نے ان کی گنگو میں تمہارا نام سنا۔ یہ جان کر کہ تم بھگور میں ہو اور وہ شیطان تمہیں ختم کرنے کے لئے تمہارے تعاقب میں بدحاشوں کو لگا رکھا ہے مجھے اس خیال سے ڈھارس بندھی۔ پھر میری جان میں جان آئی۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں تمہیں شاید بتا چکا ہوں کہ میں اس شیطان کے ہاں سے فرار ہوتے وقت اس کا بوٹا اور بیروں کی انگوٹھیاں لے آیا تھا۔ میرے پتائی سار تھے۔ میں نے تین برس اس دکان میں کام کیا تھا جس میں پتائی میز تین تھے۔ مجھے بیروں اور سونے کی پہچان ہے۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ایک انگوٹھی ڈیڑھ لاکھ کی مالیت سے کم کی نہیں ہے۔

ہیں۔ "ٹائیگر نے خوشی سے کہا۔" ان کا سواگت نہ صرف بڑی گرم جوشی سے بلکہ والدہ انداز سے ہونا چاہئے۔ ایسا استقبال کہ گھر آیا ہوا مہمان جان سکے۔"

"لیکن بھیا! ساوھتا بولی۔" ابھی رات کے آنے میں خاصی دیر ہے۔ کیوں نہ ہم غمی راستے سے نکل جائیں؟"

"یہ مہمان نوازی کے اصولوں کے خلاف ہے۔" ٹائیگر نے کہا۔ "آپ لوگ دیکھیں گے میں ان کی کیسی خاطر مدارت کرتا ہوں۔ وہ زندگی بھر کسی کو بھولیں گے نہیں کہ ان کا کیسا سواگت کیا گیا تھا۔ آپ لوگوں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہیں بولیں۔ اور پھر جلدی کا بی بنا کر لائیں۔"

رات کے دس بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت ارودنا اور ٹائیگر کمرے میں اندھیرا کئے کھڑکی کی اوٹ سے باہر جھانک رہے تھے۔ انہوں نے گلی کے کھڑے جو اسٹریٹ لپ تھا اس کی روشنی میں گھر کی سمت آتے دیکھ لیا تھا۔ ٹائیگر نے پہلے ہی ارودنا کی بیوی ساوھتا سے کہہ رکھا تھا کہ دستک ہونے پر وہ سوال و جواب کرتی رہے۔ وہ جب تک اسے اشارہ نہ ملے دروازہ نہ کھولے۔

"کون ہے؟" ساوھتا نے تیز آواز میں پوچھا۔

"ارودنا صاحب۔! تشریف رکھتے ہیں۔"

باہر سے ریش نے کہا۔

"جی نہیں۔" ساوھتا نے سپاٹ لچھ میں جواب دیا۔ "وہ کسی کام سے تین ماہ سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کون ہیں؟"

"ہم ان کے دوست ہیں۔" میرے ساتھ ان کے دوست بھی ہیں۔ "ریش بولا۔" میرا نام بچن ہے اور دوسرے کا نام راج کمار ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔" ساوھتا نے سابقہ لہجہ میں کہا۔ "میں نے بھی آپ دونوں میں سے کسی کا نام نہیں سنا۔"

"ہم ان کے آفس کے دوست ہیں۔" غیر

نورسٹ گائیڈ نے ان کی دو ماہ کی تنخواہ بھیجی ہے۔ دینے آئے ہیں۔"

"آپ دروازے کے نیچے سے لفافہ اندر ڈال دیں۔" ساوھتا بولی۔

"شریستی جی۔! اس کی رسید بھی تو لینی ہے۔" ریش نے کہا۔

"میں رسید بھی نیچے سے ڈال دوں گی۔"

"ہیں معلوم نہیں آپ کون ہیں۔؟ کم از کم شکل دیکھ کر غیر صاحب کو بتائیں۔"

"ٹائیگر نے اشارہ کیا تو وہ بولی۔" ٹھیک ہے۔ میں دروازہ کھول کر آ رہی ہوں۔ ایک منٹ۔"

ٹائیگر کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس نے ارودنا کی تینوں لڑکیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کمرے میں آجائیں۔

"جب وہ لڑکیاں آگئیں تو ساوھتا نے دروازہ کھول دیا۔ ریش دروازہ کو دھکا دیتا ہوا اندر گھس گیا۔ اس کے پیچھے جتنی جتنی اس نے دروازہ بند کر کے چھٹی لگا دی۔ ریش نے ان چاروں کو دیواری کی روشنی لے لیا۔

"خبردار۔" وہ سفاک لہجے میں بولا۔ "اگر تم میں سے کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو میں اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔"

"یہ کھلوں آپ کس لئے لائے ہیں۔؟"

میرے پتی کی تنخواہ والا لفافہ کہاں ہے۔؟"

"میرے پاس ہے۔" جتنی نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ "کھلوں تو میں بھی لایا ہوں۔"

"ہمیں کھلونے سے کیا لینا ہے۔ تنخواہ سے مطلب ہے۔ میرے پتی تین ماہ سے پراسرار طور پر لاپتا ہیں۔ تنخواہ گھر نہ آنے سے ایک ماہ تو بڑوں اور محلے والوں سے قرض لے کر گزارہ کیا۔ لیکن اب کوئی بھی قرض دینے کو تیار نہیں۔ ہم فاقوں سے زندگی گزار رہے ہیں۔ پلیز۔ تنخواہ لائے ہیں تو دے دیں۔"

آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔"

"ہم کرپا ہی تو کرنے آئے ہیں۔" ریش نے استہزاء لہجے میں کہا۔

بھروسہ اور جتنی نے اپنی اپنی جیب سے کلورو فارم میں پھینکے ہوئے رو مال نکالے۔ وہ ماں اور بیٹیوں کی طرف بڑے تو ٹائیگر نے کمرے سے باہر آ کر کہا۔

"وہ میری ریشمیں۔ میرے سرکار۔! کیا آپ یہ معطر رو مال سوگھا کر ان سے اظہار محبت کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ دونوں ٹائیگر کو دیکھ کر اس کی آواز سن کر ہلکے بڑے۔ "کون ہو تم۔؟" ریش دھاڑا۔

"ناور۔" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "یہ کھلونے کیوں لائے ہو۔ کیا تمہاری عمر ہے کھلونوں سے کھیلنے کی۔ کھلوں تو میرے پاس بھی ہے۔" ٹائیگر نے جیب سے پستول نکالا۔ وہ کھلونے پستول تھا جس میں بچے اپنی ہر ہر ہر پیکاری مارتے ہیں۔"

"یہ کھلوں۔" جیب میں رکھ لو۔ جتنی نے غرور سے بھرے لہجے میں کہا۔ "خاموشی سے کمرے سے باہر۔ تم میں سے کسی نے شور مچایا تو اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ میری بات کو خدا کی مت سمجھو۔"

"لگتا ہے کہ تم دونوں بے وقوف نمبر ایک ہو۔ گدھے ہو۔ تمہاری عقل گدی میں ہے۔ ذرا بھی منگھل ہوئی تو اس میں سائی لیسر لگا رکھ لے آتے۔"

رات کا وقت ہے۔ کیسا سا نورا چاروں طرف خاموشی بھائی ہوئی ہے۔ فائز کی آواز کی گونجی تو اڑدس پڑدس ہی ہلکی سی منگھل میں گونج جائے گی۔ لوگ گھروں سے نکل جائیں گے۔ سوچ لو۔"

"پہلے اس کا منہ بند کرو۔ یہ مسخرہ جانے کون بھروسہ کر جائے کہاں سے ٹپک پڑا ہے۔" ریش مگر جا۔

"جتنی۔" ٹائیگر کی طرف بڑھا تو ٹائیگر نے زہریلی جیب سے کھلونے پستول نکال لیا۔ جتنی کے ہاتھ میں ہاتھ میں رو مال تھا اور دائیں ہاتھ میں کلورو فارم تھا۔ اس وقت ریش نے ساوھتا اور لڑکیوں کو دیواری کی روشنی لے لیا ہوا تھا۔

جیسے ہی جتنی اس کے قریب آیا تو اس نے چشم زدن میں نہ صرف جتنی کے ہاتھ پر بلکہ ریش کے ہاتھ پر پیکاری ماری۔ ان کے ہاتھوں سے رو مال اور چھوٹ کر فرش پر گر پڑے۔ ان دونوں نے ایک جی ماری۔ جتنی کے ہاتھ سے کلورو فارم والا رو مال نیچے گر گیا۔ وہ دائیں ہاتھ سے پایاں ہاتھ پکڑ کر کہنے لڑ پڑے۔

ان کے ہاتھ جھلک گئے تھے۔ ٹائیگر کے کھلونے پستول میں تیزاب بھرا ہوا تھا۔ ان دونوں نے تکلیف سہتے اور کراہتے۔ غصے سے رو مال اور اٹھانے بڑھے۔ ٹائیگر نے پہلے تو ایک زوردار لات ریش کے سینے پر رسید کی تو وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکا۔ دو تین قدم لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا اور رو مال سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ جتنی کے ساتھ بھی ٹائیگر نے وہی سلوک کیا۔ اس کے سینے پر لات مارنے کے بجائے اس کے لمبے بالوں کو پکڑ کر اسے زور سے دیواری کی چوکت پر مارا کہ اس کی چوٹ برداشت نہ کر سکا۔

ساوھتا نے اور اس کی بڑی بیٹی نے فرش پر رو مال اور اس کے گرد سے اٹھائے۔ دونوں فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔ پھر ارودنا ہاکی لئے کمرے میں آ گیا۔ ٹائیگر نے اس سے کہا تھا کہ وہ صورت حال ہاتھ سے نکلے دیکھ کر کمرے میں آ کر ان دونوں بدعاشوں کے سر بھاڑ دے۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ان دونوں نے مل کر جلدی جلدی ان کی منگھلیں کر سی پر کس دیں اور ان کے منہ پر وہی شپ چپکادینے جو وہ ساتھ لائے تھے کہ ساوھتا اور اس کی جوان لڑکیوں کے منہ پر چپکادیں گے۔

معاذ اللہ ہو گیا تھا۔ انہیں لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ ماں اور بیٹیاں خوش ہو گئی تھیں۔ ارودنا بھی خوش سے زیادہ تیز زدہ تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ بازی الٹ بھی سکتی ہے۔ یہ خطرناک بدعاش اس آسانی سے قابو میں آسکتے ہیں۔ ٹائیگر بازار جا کر تیزاب اور کھلونے پستول لے آتا تھا تو ارودنا اور ماں بیٹیوں کی بالکل بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ٹائیگر ان سے

کیا کام لے گا۔ جب اس نے ٹائیگر سے کہا کہ ریوالوروں کے مقابلے میں یہ پتول کیا کام دے گا۔ ٹائیگر اس کی بات سن کر مسکرا دیا تھا اور کہا تھا۔ ”بس..... تم خاموشی سے ایڈ وچر فلم دیکھو۔“

آج کے اخباروں میں بھی پال کی خبر بھی چھپی ہے کہ اس کے کسی دشمن نے اس کے سر پر اتنے زور سے پھروے مارا کہ اس کا سر کھل گیا۔ وہ بے ہوش کی حالت میں ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ وہ کتنا عرصہ بے ہوش رہے گا۔ حکومت نے اس کے سر کی قیمت پانچ لاکھ روپے رکھی تھی۔ وہ بڑا خطرناک مجرم تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ وہ پولیس کو دس افراد کے قتل۔ اور کم عمر لڑکیوں کی بے حرمتی کے علاوہ۔ عورتوں کے اغوا کے جرم میں مطلوب تھا۔ حکومت اس شخص کو انعام و پنا جاتی ہے جس نے یہی پال کو بے ہوش کی نیند سلا دیا۔

”تو آپ کیا پانچ لاکھ کی انعامی رقم حکومت سے لیں گے؟“ ساوھتا نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ٹائیگر نے نئی میں سر ہلایا۔

”تو کیا اتنی بڑی رقم نہیں لوگے۔“ جب کہ یہ انعامی رقم ہے۔“ اروندا حیرت سے بولا۔

”اس لئے کہ یہ پولیس کی ایک چال ہے۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”وہ انعام کا جھانسہ دے کر گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس پر قاتلانہ حملے کا جھانسہ دے کر اندر کر دے۔ میں حکومت اور پولیس کی شاطرانہ چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔“

”اب ان مہمانوں کی کیا خاطر مدارات کی جائے۔“ اروندا کی بیٹی شمشا نے ٹائیگر سے پوچھا۔

”پہلے تو انہیں ہوش میں لانا ہے۔ پھر ان کی پرزور دعوت کرنی ہے۔“ ٹائیگر بولا۔ ”گنتی خوشی کی بات ہے کہ یہ ہم آسانی سے سر ہو گئی۔ جس کی توقع نہ تھی۔ جتنی بھی قاتل، ذہیت، درندہ صفت اور وحشی ہے۔ اس کے جرائم ناقابل معافی ہیں۔ میں اس کے پاس کو سر پرانہ کر دینا چاہتا ہوں۔“

پھر ان دونوں کو ہوش میں لانے کی تدبیر بھی ٹائیگر کرنے لگا۔ ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد کیے بعد دیگرے ہوش میں آتے گئے۔ ایک ہاتھ جھلس جانے کے باعث انہیں تکلیف اور درد ہونے لگا تو وہ کسمسانے اور زہرے لگے۔ چون کہ ان کے منہ پر شپ چکا ہوا تھا اس لئے منہ سے کراہنے کی آواز نکل نہیں پارتی تھی۔

جب وہ پوری طرح ہوش میں آ گئے تو انہوں نے منظر دیکھا وہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آیا۔ خوف و دہشت سے چٹنی چٹنی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کے ریوالور ایک عورت اور جوان لڑکی کے ہاتھ میں تھے ان کی نظروں کے سامنے اروندا تھا جس کا شیوہ کی دونوں کا بڑھا ہوا تھا جسے وہ پہچان نہ سکے۔ ٹائیگر کو دیکھا تو بری طرح چو گئے۔ ایسا لگا جیسے کوئی ڈراؤنا پہنا دیکھ رہے ہوں۔ اس وقت انہوں نے ٹائیگر کو پہچان نہیں تھا۔ اس لئے ان کا سارا دھیان عورت اور لڑکیوں کی سندرتا کی طرف تھا۔ اور پھر وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ٹائیگر یہاں ہوگا۔ یوں بھی اس وقت ٹائیگر نے غلطی مونیچس اور واڈمی لگائی ہوئی تھی۔ اب اس کی واڈمی اور مونیچس سامنے والی چیز پر رکھی ہوئی تھیں۔

اس وقت کمرے میں جو چھ افراد تھے انہیں موت کے فرشتے دکھائی دے رہے تھے۔ دو عورتوں کے ہاتھ میں ریوالور اور اروندا کے ہاتھ میں اسٹک تھی۔ ٹائیگر کے ہاتھوں میں کھلو پتول جو جب سے خطرناک ہتھیار تھا۔ گولی سے کہیں خطرناک۔

گولی سے تو آدی فوراً مر جاتا ہے۔ لیکن تیزاب جو جلن، تکلیف۔ درد دیتا اور جھلسا دیتا ہے انہیں اب اس کا احساس ہو رہا تھا۔ ان کا ہاتھ جو بندھا ہوا تھا۔ جو جھلس گیا تھا۔ اس کی تکلیف ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔

ان دونوں نے اپنا پورا زور صرف کر دیا تھا کہ اپنا ساتھ ساتھ ہاتھ جھڑائیں۔ ریبوں سے آزاد کر لیں۔ وہ جیسے ہی اسے آزاد کرنے کی کوشش کرتے جیسے ان کی جان

نکل جاتی۔ ان کی کراہیں سننے میں گھٹ کر رہ جاتیں۔ وہ جو ڈیجیٹل کیمرے لائے تھے سامنے والی میز پر رکھے ہوئے اس کے علاوہ ان کے بٹے اور چاقو بھی۔

”میں سب سے پہلے بن بلائے مہمانوں سے سب کا تعارف کرا دوں۔“ ٹائیگر کہنے لگا۔ ”یہ مسٹر اروندا زرسٹ کا بیٹا۔ جسے اس شیطان پاس نے اسے برہماں اور دہشت زدہ کر کے اس کی جتنی اور لڑکیوں کو بھی اغوا کر کے بریغال بنائے تاکہ ان کی عزت سے کھیلے اور ان کی معذرت طلبیں بنائے۔ پھر قتل کر دے یعنی ذبح۔ پھر خون پی کر اور ان کی کھال اترو کر کچا گوشت اور بوٹیاں حربے لے لے کر ورنڈے کی طرح کھا جائے۔ ان کی بیڑیاں اپنے خون خوار شکاری کتوں کو کھلا دے۔ تمہارا پاس آدم خوروں سے بھی بڑھ کر ہے۔ آدم خور بننا ہوا انسانی گوشت کھاتے ہیں۔ ورنڈوں کا بھی۔“

قسمت نے ساتھ دیا، اروندا وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو کر دس دن پہلے گھر پہنچ گیا۔ تم دونوں نے دس دن پہلے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر پر دگرم بنایا رہنا سیکھ کر گھر میں کمرن کو اسٹاک پر اس کی بیوی اور لڑکیوں کو بریغال بنایا جائے۔ ان کے منہ پر شپ چکا کر نہ صرف دل کے ارمان ٹکائے جائیں اور بلکہ میل کرنے کے لئے عریاں حالت کی تصویر اتار لی جائیں۔ لیکن انہوں کی بازی الٹ گئی۔ بیڑیاں تمہارے رحم و کرم پر ہونے کے بجائے اب تم ان کے رحم و کرم پر ہو۔

مجھے بھی تم سے اپنا حساب کتاب کرنا ہے۔ تم دن نے پولیس کتب کے باہر حملہ کیا۔ اس غریب معافی قدرت نے میری زندگی بچانے کے لئے ایثار دیا، ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ دھڑی ہو گئی۔ اس کی زندگی بھی جو جھلکی۔ میں اس کا بدلہ اور انتقام نہ صرف تم دونوں بلکہ تمہارے شیطان پاس سے بھی لوں گا۔ میں اپنے دشمن کو سزا دینا نہیں چاہتا ہوں۔

تم دونوں پیش دراور سفاک ترین قاتلوں میں سے ہو۔ اور ہاں تم دونوں نے اپنی مجرمانہ زندگی میں اجرت سہ کر کچھ لڑکیوں اور عورتوں کے چہروں اور جسموں پر

صحیح طریقہ

ایک صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھے آرام سے سگریٹ پی رہے تھے جبکہ ان کی بیگم پیسے میں شرابور گاڑی کی سروس میں مصروف تھیں۔ اتنے میں اتنا کا ایک دوست گھر آیا اس نے جب یہ منظر دیکھا تو ان صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ تم یہ کام کس طرح اپنی بیوی سے کرانے میں کامیاب ہوئے۔ ان صاحب سے لاپرواہی سے منہ سے دھوکے کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔ معمولی سی بات ہے ایک دن میں نے بیگم سے کہا جب میں گاڑی سروس کرتا ہوں تو میرا وزن ایک پونڈ کم ہو جاتا ہے۔ بس اسی دن سے یہ کام بیگم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

(ٹائیگر محمد عظیم رضوی۔ کھاریاں کینٹ)

تیزاب پھینکا۔ تمہیں اعزاء نہیں تھا کہ تیزاب سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اب تمہارے ہاتھ کا کچھ حصہ جل گیا تو معلوم ہو رہا ہوگا کہ یہ تکلیف کیسی ہوتی ہے۔

تم قانون کے ہاتھوں سے اس لئے بچتے رہے ہو کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت اور عینی گواہ نہیں تھا۔ تم دونوں نے عینی گواہوں کو بھی دنیا سے رخصت کر دیا۔ تمہارے جرائم کی فہرست ایک اخبار کے کرائم رپورٹر نے دی تھی۔ تم دونوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جو ناکام ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ایک کرائم رپورٹر نے تم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ میں تم دونوں کی تلاش میں تھا۔ حالات کے پکڑنے تم سے ملا دیا۔

ٹائیگر نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔

”تم دونوں کے جرائم ناقابل معافی ہیں۔ عدالت تم دونوں کو جو سزا دے گی وہ ایسی نہ ہوگی جس کے تم دونوں مستحق ہو۔ سزا تمہیں میں دوں گا۔“

فیصلہ میں سناؤں گا۔ تم دونوں یہ بھول گئے کہ اوپر والے کے ہاں دیر ہے۔ اندھ نہیں۔ میں تم دونوں کو گولی مار کر ہلاک نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ گولی سے فوراً مر جاؤ گے یا کچھ دیر تپ کر۔ لیکن میں تو ایسی سزا دیتا جا رہا ہوں کہ برسوں تک ایڑیاں رگڑتے رہو۔ موت مانگو تو موت نہ ملے۔ اس کے علاوہ کوئی سزا نہیں ہے۔

میرے خیال میں یہ کھلونا ہسپتال تم دونوں کو سزا دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ چاروں باری باری تم دونوں پر ہسپتال چلائیں گی۔ شاید تم نے سنا ہوگا کہ سو دن چور کے ایک دن شاد کا۔ یا کوئی اور۔

چاچی! پہلے آپ آئیں۔ سب سے پہلے آپ چکاری ماریں۔ سب ہی باری باری چکاری ماریں گی۔ اس بات کا خیال رکھیں ایک آنکھ ضائع ہو۔ پورا چہرہ جھلس جائے۔ ہاتھ پیر اور جسم جھلس جائے۔ کوئی حرج نہیں۔ ان سے ذرہ برابر رعایت نہ ہو۔

جند اور ریشم یہ سن کر ڈھی پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے اور ترپنے لگے۔ اول غول کرنے لگے۔ آنکھوں سے آنسو آئیں گئے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

ٹائیگر نے کہا۔ "موت دیکھ کر کیا بھگوان یاد آ رہا ہے؟۔ سزا پائی ہے مل کر رہے گی۔"

"کیا یہ بہت ہی بھیا تک جبر تک اور انتہائی تکلف دہ سزا نہیں۔" سادھنا بولی۔ "یہ کیا برداشت کر سکتیں گے۔؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" ٹائیگر کہنے لگا۔

"اگر ان کی جگہ کوئی درندہ ہوتا تو اسے اتنی بھیا تک سزا نہیں دی جاتی۔ یہ انسان ہیں۔ درندہ مفت۔ شقی القلب۔ ان کی انسانوں پر جو بربریت کی گئی آپ اس کا تصور تو کیجئے۔ انہوں نے سات دس برس کی معصوم بچیوں کی عزت لوٹی۔ درندگی کی۔ شادی شدہ عورتوں کو نہیں بخشا۔ اور پھر ان دونوں

حرام زادوں نے لڑکیوں عورتوں پر بھی چند روپوں کے عوض حجاب پھینکا۔ اور اس کے علاوہ قتل اور خون خرابا بھی کیا۔ کیا یہ کسی رعایت اور معافی کے مستحق ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔" ماں اور بیٹیوں نے بیک وقت ایک زبان ہو کر کہا۔

"آپ آج کے روز کا تصور کریں۔ یہ آپ کی عزت سے کھیلنے اور تصور میں اتارنے آئے تھے۔ اگر آپ چاروں پر قیامت گزر جاتی تو کیا محسوس کرتیں۔؟ کیا آپ انہیں معاف کر دیتیں۔؟"

"نہیں۔"

"تو پھر اس شہ کا کام میں دیر کیوں۔؟ کس بات کا انتظار ہے۔"

"تو یہ ریشم تھا۔؟" سادھنا کا چہرہ نفرت اور غصے سے تھما گیا۔ اس کی آنکھیں شعلہ برسا نے لگیں۔ وہ دہرناک لہجے میں بولی کیوں نہ میں رسوئی سے چھری لا کر اس کا سر تن سے جدا کر دوں۔ پھر اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں اور چیلوں کو کھلا دوں۔؟"

"ہاں۔ ہاں۔" سسما بولی تو اس کی زبان کا بچنے لگی تھی۔ "ان درندوں کے ساتھ اس سے بھی کہیں بربریت کرنی چاہئے۔ ماں جی۔ رسوئی سے چھری لے کر آتی ہوں۔"

"جب وہ رسوئی کی طرف بڑھی تو ٹائیگر نے ایک کراس کی ہانہ پکڑ لی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مجھے جانے دیں۔ میں اسے ذبح کر کے اس کا خون پی جاؤں گی۔"

"سسما! اجنباتی نہ بنو۔ اصل سزا یہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے مہمان رہیں گے۔ ان کا چہرہ اور جسم جھلسا دینے سے یہ مہر کے جیتے رہیں۔ جن اور تکلیف۔ انہیں اذیت۔ تکلیف اور عذاب دینا رہے گی۔ ایک گھڑی، ایک دن نہیں۔ ہفتوں اور مہینوں۔ اس وقت تک جب تک موت نہیں آ جاتی۔

ایک لمبی مدتی سے کم نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے سادھنا کھلونا ہسپتال لے کر ریشم کی طرف بڑھی۔ ریشم اچھلا۔ سر ہلانے لگا۔ سادھنا نے سب سے پہلے اس کے چہرے پر چکاری ماری۔ پھر اس کے جسم پر۔ پھر اس کے جسم کے سب سے نازک حصے پر۔ وہ بے آب مایہ کی طرح ترپنے لگا۔ پھر جند کو اس نے اسی طرح نشانہ بنایا۔ پھر ان چاروں نے۔ وہ دونوں خوف و وحشت، دراز اور تکلیف کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو چکے تھے۔

"کیا یہ دونوں مر گئے۔؟" سسما نے انہیں بے بسی و حرکت دیکھ کر پوچھا۔

"یہ بے غیرت۔ درندے۔ اتنی جلدی اور اسے مرنے سے رہے۔" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "یہ جھلس جانے کے باعث بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد دیکھنا کیسے ترپتے ہیں۔ انتقام اور کینہ کر دار تک پہنچانے کی آشا پوری ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہم یہاں سے چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔"

گھر میں فون تھا۔ ٹائیگر نے ریسور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کسی نے ہیلو کہا تو وہ بولا۔

"آنکھ راجی۔! دو بارسل ہیں۔ جلدی سے ڈر لے جاؤ۔ کسی دیرانے میں ٹھکانے لگانا ہے۔"

"دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے اذیت دیا گیا۔

دس منٹ میں آنکھ راجی اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ پہنچ گیا۔ وہ ایک بڑی گاڑی لے کر آیا تھا۔ وہ فوری القامت خوش اخلاق تھا۔ اس نے اروندا اور سادھنا لڑکیوں اور ٹائیگر کو غصہ کر کیا۔ پھر اروندا اور ٹیگر سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

"مجھے خبر مل گئی تھی آپ آئے ہیں۔ بہراشم نے بتایا تھا۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" آنکھ راجی بولا۔

"اس کے ساتھی نے بھی جلدی کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو بڑے تھیلے تھے۔

"یہ دونوں کون ہیں۔؟" آنکھ راجی نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے مسخ ہو گئے تھے۔

"یہ ریشم اور جند ہیں۔" ٹائیگر نے بتایا۔ "یہ دونوں شب خون مار کر عزت سے کھیلنے آئے تھے۔"

"اچھا۔ یہ بہت اچھا کیا۔ یہ حرای زندہ ہیں یا مر گئے۔؟"

"زندہ ہیں۔ بے ہوش ہیں۔ صرف جھلس گئے ہیں۔" ٹائیگر نے کہا۔ "ان کا زندہ رہنا ضروری ہے۔"

"ہاں آپ سچ کہتے ہیں۔" وہ اور اس کا ساتھی دونوں کی مشکلیں کھولنے لگے۔

آنکھ راجی نے انہیں تھیلوں میں ڈال کر ان کے منہ تسلی سے باندھ دیے۔ ٹائیگر نے تین ہزار روپے بڑھائے تو وہ پس و پیش کرنے لگے۔ ٹائیگر نے زبردستی دے دیے۔

وہ گاڑی کی ڈگی میں ڈال کر اور ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

"اوہ بھگوان۔!" سادھنا نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ انہیں کہاں اور کیسے ٹھکانے لگایا جائے گا۔ بھیا نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔"

☆.....☆.....☆

رات ایک بجے کی فلاٹ کی کلکیں انہیں مل گئیں۔ ٹائیگر نے انہیں در اس یعنی اب جو چٹائے شہر تھا اس میں اروندا کا کزن تھا۔ وہاں اروندا کا سگا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہاں پہنچا کر چائے پی کر پھر ہوائی جہاز سے بنگلور واپس آیا تو اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔

وہ بہت خوش تھا کہ نہ صرف یہی پال کو ان دونوں غنڈوں کو کینہ کر دار تک پہنچا آیا تھا۔ اب اسے اس شیطان درندے کو کینہ کر دار تک پہنچانا تھا۔ یہ ہم سر

کرنے لگی۔

بنگور میں کرشل اسٹریٹ پر جوتوں کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے پاس جوتوں کی چھٹی درانی تھی ہندوستان کے کسی بھی شہر کی دکان پر نہ تھی۔ اس دکان کا نام نند باڈرن بوٹ ہاؤس تھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے جوتوں کے کارخانوں سے جدید ترین ڈیزائن کے نہایت عمدہ جوتے، سینڈلز اور چمپلیں مردانہ اور زنانہ جو بڑے فیشن اور پائیدار بھی ہوتے تھے۔ اس کے امریکہ، یورپ، چین، ہانگ کانگ اور کئی بڑے ملکوں سے درآمد کرتا تھا۔ اس لئے ہر وقت گاہکوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ دکان کے اندر گاہکوں کا رش دیکھ کر لگتا تھا مفت میں جوتے دیئے جا رہے ہیں۔

ٹائیگر جب بھی بنگور آتا تھا اس دکان سے نہ صرف جوتے، مردانہ سینڈل بلکہ چمپلیں بھی خرید کر لے جاتا تھا۔ اب چوں کہ ہم پر جانا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ ایسے جوتے کی جوڑی خریدی جائے جو جڑی اور بے حد پائیدار ہو۔ اس لئے وہ دکان پر آیا تھا۔ دکان میں گاہکوں کا اس قدر رش تھا کہ گل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ دکان میں سبھاں دت ایک پرانا سیکڑا تھا۔ وہ ٹائیگر کی پسند اور مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے ٹائیگر کا وقت ضائع نہ ہوتا تھا۔ اور ٹائیگر اسے سودو روپے اپنی خوشی سے ٹپ دے دیتا تھا۔ ویسے ایسی دکانوں پر ٹپ کی کوئی روایت نہ تھی۔

وہ ٹائیگر کو دیکھتے ہی لپک کر آیا اور نسا کر کرنے کے بعد کہا۔

”سر! آپ بہت دنوں بلکہ ایک لمبے عرصے کے بعد آئے ہیں۔ شکار کا پروگرام بنا کر آئے ہوں گے؟“

”ہاں ٹھیک کہا تم نے۔!“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں شکار پر جاتے وقت یہاں سے جوتے خرید کر لے جاتا ہوں اور واپس جاتے ہوئے بھی۔ کوئی ایسی ہی جوڑی دکھاؤ جو ہمیشہ دکھاتے ہو؟“

”کوئی ڈیزائن سے ایسے جوتوں کی جوڑی نہ

صرف بڑی زبردست، پائیدار اور بلکہ ٹایپ بھی ہے۔ اور بے حد چمکی بھی ہے۔ بے حد آرام دہ۔۔۔۔۔ کسی بھی موسم میں۔۔۔۔۔ اس میں ایسی نرمات اور گداز محسوس ہوتا ہے کہ اس کا کس سارے بدن میں سرور و کیف اور فرحت سا پھیل جاتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ ٹائیگر مسکرا دیا۔ ”میں نے آج تک ایسی کوئی بات کسی جوتے کی جوڑی میں نہیں پائی اور نہ ہی تم نے کبھی کسی جوتے کی جوڑی کی اس قدر تعریف کی۔۔۔۔۔؟“

”دکان پر پہلی بار فروخت ہو رہی ہے اس لئے میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔“ وہ بولا۔ ”آپ بھی اسے پہن کر اس کی تعریف پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ ٹائیگر مسکرا دیا۔ اس کا تجسس اور اشتیاق بڑھ گیا۔ ”یہ جوتے کیا امریکہ یا یورپ یا افریقی ممالک کے بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے کبھی تمہاری زبان سے کسی جوتے کی ایسی تعریف نہیں سنی۔ ہندوستان کے بنے ہوئے جوتوں میں کیا ایسی کوئی خوبی اور خصوصیت ہوتی ہے۔“

”یہ کسی کو نہیں معلوم۔“ سبھاں دت نے جواب دیا۔ ”دو تین مہینے میں ایک شخص آتا ہے۔ وہ ہندوستانی ہے۔ صرف دس بارہ جوڑی لاتا ہے اور اس کی قیمت وصول کر کے چلا جاتا ہے۔ مالک نے کئی مرتبہ اس سے پوچھا کہ یہ کس ملک کے بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔

وہ صرف یہ جواب دیتا ہے کہ۔۔۔۔۔ آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا بیڑ مکنے سے۔ یہ دروازہ بندہ ہیں۔ غیر قانونی۔ یہ اسمگل ہو کر آتے ہیں۔ کس ملک کے ہیں۔ وہ بتانے سے قاصر ہے۔ اگر آپ کو نہ خریدنا ہوں تو میں کسی اور دکان پر چلا جاؤں گا۔ یہ جوتے اس قدر پائیدار اور مضبوط ہیں کہ پٹھان کھینے اور جنگل میں بہت کام آئیں گے۔ اس کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اس پر پالش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی صافان سے دھو دیں۔ نہ صرف یہ چمک جاتے ہیں بلکہ اس میں ایک

بب سا نکھار آ جاتا ہے۔“

سبھاں دت نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کاپ کی ایک جوڑی لے آئی۔

ٹائیگر جوتے کی جوڑی دیکھ کر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی اور کبھی ایسے خوب صورت، دیدہ زیب اور نرم و گداز چرمی جوتے نہیں دیکھے تھے۔ ان کے لمس نے ان کی کس کس میں ایک عجیب کیف ڈرا دیا۔

اس نے جوتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے سبھاں دت کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ”یہ ریشمی طرح نرم و ملائم ہیں۔۔۔۔۔ پھول کی طرح ہلکے ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ پیر میں جوتے ہیں بلکہ موزے لگ رہے ہیں۔“

”یہ اس کی خصوصیت ہے۔“ سبھاں دت کہنے لگا۔ ”یہ جیتے نرم، ملائم اور گداز لگ رہے ہیں اتنے ہی سخت اور مضبوط ہیں۔ آپ اسے میچے کے بعد کتنی ہی سخت چیز محسوس شے اور چٹان یا پھاڑی یا دیوار کو پوری قوت سے لات ماریں۔۔۔۔۔ جوتے اور آپ کے پیر پر کوئی اثر نہ ہوگا۔۔۔۔۔ آپ کسی دھڑے یا آدی کو لات بیک کریں وہ کئی فٹ دور جا کرے گا۔ اس میں آپ کی ملائت کے علاوہ جوتے کی پائیداری کا دخل ہے۔“

”اس کی کیا قیمت ہے۔۔۔۔۔؟“ ٹائیگر نے حیر سے جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔

”صرف بیس ہزار روپے۔“ سبھاں دت نے مالک سے بات کر کے آپ کو کچھ رعایت دی۔

”رعایت کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”آپ اسے پیک کر دیں۔“

☆ ☆ ☆

صبح ناشتے کی میز پر ٹائیگر نے اخبار دیکھا۔ اس نے اچھا محسوس کیا۔ ایک خبر تو یہ تھی۔

گیارہ نو جوان اور حسین لڑکیاں جن کی عمر چودہ برس سے لے کر بیس برس کی عمر کے درمیان تھیں وہ

ایک درانی شہر میں شرکت کر کے آؤنیورسٹی سے نکلیں۔ ان کا تعلق اسکولوں اور مختلف کالجز سے تھا۔ ایک کوشر میں آئی تھیں۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میزنگل آرٹ سرکل کی وہ ممبر تھیں۔ جہاں وہ روزانہ رقص، موسیقی اور گانگی کی تربیت اور مشق کے لئے جاتی تھیں۔ اس درانی شہر کا اہتمام اسی ادارے نے کیا تھا۔ وہ کوشر میں سوار ہو گئیں اور ڈرائیور انہیں ان کے گھروں پر چھوڑنے کے لئے لے گیا۔ جب تین بجے گھروں کو نہ پہنچیں تو ان کے گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ آؤنیورسٹی کے دفتر رابطہ کیا۔ وہ بند ہو چکا تھا۔ چوکی دار نے بتایا کہ لڑکیاں کوشر میں رات سوا بارہ بجے چلی گئی تھیں۔ رات ایک بجے تک سارا آؤنیورسٹی خالی ہو چکا تھا اور اس کا دفتر بھی بند ہو چکا تھا۔

کوشر کی پراسرار گمشدگی کی اطلاع پولیس کو دی گئی۔ شہر کے کئی تھانوں کی پولیس اور موہل دین حرکت میں آ گئیں۔ پولیس کو کوشر عین پارک کے پاس ملی جو خالی تھی۔ ڈرائیور اور لڑکیوں کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ لڑکیاں ڈرائیور سمیت غائب تھیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں شیطان مانیا نے اغوا کر لیا ہے۔ میسور پولیس کو فوراً خبر کر دی گئی ہے۔ آخری کالمی پریس جانے تک کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

دوسری خبر یہ تھی کہ تین ماہ سے اب تک سولہ برس کی عمر سے لے کر بائیس برس کی عمر کی لڑکیاں۔۔۔۔۔ جو پراسرار طور پر لاپتا ہو چکی ہیں۔۔۔۔۔ وہ اور سات نو جوان لڑکے اور جوں سال مرد بھی لاپتا ہیں۔۔۔۔۔ پولیس انہیں سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔ ان کے بارے میں بھی یہ خیال ہے کہ اس شیطان مانیا نے اپنے ٹھکانے پر بریغمال بنا رکھا ہے۔

چھ ماہ کے عرصے میں کل اب تک دوسو عورتیں لڑکیاں۔۔۔۔۔ مرد اور لڑکے جو پراسرار طور پر اغوا کر لی گئیں ان کا بھی کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ٹریفک کے حادثاتوں میں جو زخمی

ہو جاتے ہیں۔ انہیں اسپتالوں کے مردہ خانوں سے پراسرار طور پر عائب ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سارا کام اس قدر منظم طریقے سے ہو رہا ہے کہ اب تک ایک ملزم بھی گرفتار نہ ہو سکا۔

حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس پراسرار اور شیطان درندہ مفت اور پراسرار مافیا کا حکومت کرنا تک پتا نہیں چلا سکی جس نے مسور کے جنگل میں اپنی حکومت بنا رکھی ہے۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کس لڑکے لڑکیاں۔۔۔۔۔ مرد اور عورتیں۔۔۔۔۔ ٹریفک حادثے میں زخمی اور مردہ خانوں سے پراسرار طور پر کیوں منظم طریقے سے عائب کیا جا رہا ہے۔ یہ حکومت کرنا تک کی بے بسی، غفلت اور نااہلی ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

☆ ☆ ☆

ٹائیگر نے دانستہ اور عدو والا واقعہ نہیں بتایا۔

اس لئے کہ اسے اندیشہ تھا کہ یہ واقعہ اخبار میں شائع ہو جانے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شیطان اپنے بد معاشوں کو ان کے تعاقب میں بھیج دے کہ ان کا خاتمہ کر دیں۔۔۔۔۔ اس نے اردو اسے کہا تھا کہ وہ تین چار ماہ کسی پرنسپال مقام پر رہ کر آئیں۔ اردو اسے پاس پیس تئیں لاکھ کی رقم تھی۔ پھر وہ واپس آ جائے۔۔۔۔۔ مافیا کے بد معاش اس شہر میں ڈھونڈ اور تلاش کر کے نامراد ہو کر چلے جائیں۔

ایک اور سنسنی خیز خبر بھی شائع ہوئی تھی کہ وہ دو تین ماڈل گٹز جو شہر سے پراسرار طور پر عائب ہو گئیں یا اغوا کرنی گئیں ان کی ممنوعہ قلموں کے سی ڈیز دستیاب ہیں۔ کیا یہ فلمیں بھی اس شیطان مافیا کی کارستانی ہے؟ لیکن جنگل میں ایسی قلموں کی عکس بندی ممکن ہے۔۔۔۔۔ جب کہ وہاں بجلی کی سہولت نہیں ہے۔ کیوں کہ فلمیں بہت ہی صاف اور تیز ردشنوں میں قلم بندی کی گئی ہیں۔

بنگور شہر میں جیس اور گری ہوتے ہی ہرست سے آسان پر کا لے کا لے بادل آ کر برسے لگتے ہیں۔ کوئی

گھنٹہ ڈیرہ گھنٹہ موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ پھر مہم سرد اور خوشگوار ہو جاتا ہے۔ جب تک بارش ہوتی رہتی ہے اندھیرا چھٹا ہوتا رہتا ہے۔ آج سہ پہر کے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ آسان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آٹھ بجے یا دس بجے۔ رات کا وقت ہوگا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا۔

جب بارش زور و شور سے ہو رہی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد باہر کے دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی۔

ٹائیگر حیران ہوا کہ اس تیز بارش میں کون کیوں اور کس لئے اس وقت آیا ہے؟ جب وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اس وقت کسی نے دروازے کو پیٹ ڈالا۔ جیسے اس سے موسلا دھار بارش میں بھیکنا نا تامل برداشت ثابت ہو رہا ہو۔

ٹائیگر نے دروازہ کھولا تو دیکھا دروازے پر ایک نوجوان سی عورت کھڑی ہوئی تھی۔ دروازے کے کھلتے ہی اس نے پہلو تو اس طرح پلٹ کر دیکھا جیسے کوئی اس کا تعاقب میں ہو۔ پھر اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔۔۔۔۔؟“

اس سے پہلے کہ ٹائیگر اسے کوئی جواب دے پڑا زری سرعت سے اندر کھسکی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

ٹائیگر کے کمرے سے جو روشنی آ رہی تھی وہ لڑکی پر پڑ رہی تھی۔ وہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ بارش میں بری طرح میٹھی ہوئی تھی اور اس کا لباس بھگ کر اس کے بدن سے چپک گیا تھا جس نے اسے بے لباس کر دیا تھا۔ وہ درختوں سے بے نیاز تھی۔ اس پر سر آگئی سی طاری تھی اور آنکھوں سے خوف بھائی رہا تھا۔

”بد معاش۔۔۔۔۔ میرا تعاقب کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”پھر وہ تیزی سے اس کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ کمرے میں آیا تو لڑکی تھی۔ اس کے ملحق غسل خانے میں کھس گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ

لڑکی اس کا لباس اس کے بائیں ہاتھ میں تھامے اس نے پھر دیکھا تھا۔

”صاف سمجھو گا۔۔۔۔۔ میں نے لباس اس لئے اور لیا کہ کہیں مونیہ نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ غسل خانے میں ڈوبا نہ تھا جس سے میں بدن پونجھتی اور بال خشک کر لی۔ اس وقت مجھے بڑی زور کی سروی بھی لگ رہی ہے۔ اس لئے میں اس حالت میں غسل خانے سے نکل آئی ہوں۔۔۔۔۔ آپ ٹھا کر دیکھیں۔۔۔۔۔ میں بد معاشوں کے جنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ کل تین روزے اور میں۔۔۔۔۔“

”ایک منٹ۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”میں تو لیا اور تمیز دے رہا ہوں۔۔۔۔۔ تم اپنے بال اور بدن خشک کر کے۔۔۔۔۔ کپڑے پہن کر کمرے میں آ جانا۔۔۔۔۔ پھر میں تمہاری کہانی سنوں گا۔۔۔۔۔“

اس نے تو لیا کمرے میں رکھی کرسی پر ڈالا ہوا تھا۔ اس نے الماری میں سے اپنا ایک جوڑا نکال کر اسے ڈالا۔ وہ تو لیا اور کپڑے لے کر غسل خانے میں کھس گئی۔ پھنسی زیر میں وہ بال اور بدن خشک کر کے کپڑے پہن کر آئی ٹائیگر نے چار انڈے ابال کر اور کالی بنا کر رکھ دی۔ نہانے اور یہاں پناہ ملنے سے لڑکی کے پیچھے پر طمانیت سی آگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور ہشت تھی اس کا شاہیہ تک نہ تھا۔

”پہلے تم یہ انڈے کھا لو۔۔۔۔۔ پھر کافی پی لینا۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”تمہارے جسم میں نہ صرف توانائی ہے بلکہ تمہارے دل میں جو خوف و ہشت ہے وہ اتر جائے گی۔۔۔۔۔“

”چار انڈے۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائی۔ ”وہ انڈے ہی انڈوں کی بڑی بات ہے۔۔۔۔۔ البتہ ایک اور کپ کافی پانی کی۔۔۔۔۔ دوسرے کپ کے لئے آپ کو زحمت نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں خود بناؤں گی۔۔۔۔۔ مجھے جانے کافی کافی طلب ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ ایٹور کی بڑی گرپا ہے کہ یہ جیسا نیک انسان مل گیا۔۔۔۔۔ دروازے پر دستک دینا وقت میرا خیال تھا کہ اس میں شاید مرد اور عورتیں

رہتی ہوں گی۔۔۔۔۔ آپ کے دروازے کھولنے پر میں آپ کے کمرے میں آئی اور میرا اٹھا۔۔۔۔۔ ٹھنکا۔۔۔۔۔ جب میں بے لباس اندر آ گئی تو میرا خیال تھا کہ اب میری مجبوری سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔۔۔۔۔“

”انڈے اور کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے انڈوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

لڑکی نے انڈا اٹھا کر کھانا شروع کیا اور کافی کا ٹھنڈ بھی ساہ لینے لگی۔ ٹائیگر نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ نہایت خوب صورت تھی۔ ابھی وہ مسکرائی تھی تو اس کی مسکراہٹ بھی اسی کی طرح دل کش تھی۔ اس کا سراپا بھی بہکا دینے والا تھا۔ اس کی عمر تترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”وہ کل تین بد معاش تھے جو مجھے اغوا کر کے ایک مکان میں لے گئے۔ وہ مسلح تھے۔ دو کے پاس چاقو اور ایک کے پاس پستول تھا۔۔۔۔۔ پستول والے نے پستول کی نال میری پھنسی پر رکھ کر کہا۔ پاس کا حکم ہے کہ تمہیں ہر قیمت پر جزیرے پر لایا جائے۔ وہ بڑا غضبناک ہو رہا تھا۔ غصے میں بھی تھا کہ تم فرار ہونے میں کامیاب کیسے ہو گئیں۔ تمہیں وہاں چل کر قلم میں اپنا کام مکمل کرنا ہے۔ اس کی ریبہرسل کرنا ہے۔۔۔۔۔ ذرا ہم یہ جام پی لیں۔۔۔۔۔ ویسے جان من۔ اس قلم میں حقیقت کا رنگ بھرتا اور جان ڈالتا ہے۔ دیسے تمہیں دیکھ کر نشہ طاری ہو رہا ہے۔ وہ نہ جانے کیا کیا بکواس کرنے لگا تھا۔۔۔۔۔ خش۔۔۔۔۔ لغو۔۔۔۔۔ اور بے ہودہ قسم کے اشارے۔۔۔۔۔ میں نفرت اور غصے سے اندر ہی اندر کھولتی رہی۔۔۔۔۔ پھر وہ متیوں شراب پینے لگے۔۔۔۔۔ ان دونوں نے وہ درد جام ہے۔ ان پر نشہ طاری ہونے لگا۔ سرخہ اٹھا تا کہ مجھے دیوچ کر ریبہرسل شروع کر دے۔ وہ قدم بھی نہیں چلا تھا کہ لڑکھڑا کر فرش پر گرا۔ وہ دونوں بھی نشے میں تھے اور ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ میں نے شراب کی بوتل اٹھائی۔ وہ بڑی

مضبوط تھی۔ پہلے تو میں نے پوری طاقت سے اس کی کھوپڑی بجا دی۔ اس کا سر کھل گیا اور خون چہنے لگا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ پھر میں نے دوسرے اور تیسرے کا بھی باجا بجا دیا۔ وہ دونوں بھی زخمی ہو گئے۔ اور پھر مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ مجھے دو پٹالینا یاد نہیں رہا۔ باہر آئی تو دیکھا کہ زبردست موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ میں جھرمٹا اٹھا ادھر بھاگی۔ بارش میں بھٹکتی گئی۔ جب میں مین روڈ پر آئی تو ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ اسے ایک تیس برس کا مرد چلا رہا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا کہ۔۔۔۔۔۔ شرمیتم کہاں جا رہی ہیں۔ اس تیز بارش میں۔۔۔۔۔۔ کیا سواری کی تلاش میں۔۔۔۔۔۔؟ آپ تو پوری طرح بھگ چکی ہیں۔ پہلے۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دوں۔۔۔۔۔۔ جب میں بیٹھ گئی تو اس نے کہا کہ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ جائیں۔۔۔۔۔۔ کیوں کہ اس تیز بارش میں امکان ہے کہ میں آپ پھسل نہ جائیں۔ پھر وہ تہتہ مار کر ہنسا۔ کیوں نہ آپ میرے غریب خانے چلیں۔ میری بیوی اپنے سینے لٹی ہوئی ہے۔ آپ میرے گھر چل کر یہ کپڑے اتار دیں۔ میں آپ کو اپنی جتنی کا اچھا لباس پہننے کے لئے دیدوں گا۔ میں کافی بھی پلاؤں گا۔ بارش میں مرد اور عورت کا مزا اور کیف اور ہی ہوتا ہے۔ اس وقت میں نے ایک گاڑی کو تیزی سے گزرتے دیکھا۔ اس میں اندر روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے تینوں کو گاڑی میں دیکھا تو میرا خون جم گیا۔

جب وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اسکو ٹوڑنے کو کہنے کے لئے کہا۔ اس نے گاڑی روک کر پوچھا کہ کیا بات ہے جان! کیا گھر جل کر دل خوش نہیں کر دی؟ میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہا کہ میرا گھر اس جلی میں ہے۔ اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر فاصلہ کم کر کے کہا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تمہارے کپڑے بھگ تو گئے۔ لیکن اس نے تمہیں شعلہ جسم بنا دیا ہے۔ بے لباس لگ رہی

ہو۔۔۔۔۔۔ اس نے میرے چہرے پر جھک کر مجھے چومنا چاہا تو میں نے دونوں ہاتھ سے اس کو اتارنے سے روک دیا کہ وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکا۔ وہ سڑک کے کنارے گر گیا۔ اس کے سر پر شاید بڑے زور کی چوٹ لگی تھی۔ وہ جھلٹاٹھڑکا۔ میں مخالف سمت دوڑی۔۔۔۔۔۔ چہ قدم طے کئے ہوں گے کہ بد معاشوں کی گاڑی جو مخالف سمت سے آ رہی تھی اس کی ہیڈ لائٹس میں نہا گئی۔ وہ چپچپ کر رک جاؤ۔ گاڑی کو انہوں نے بریک لگا کر روکنے کی کوشش کی تو الٹ گئی۔ پھر میں سامنے والی گلی میں گھس کر دوڑنے لگی۔ پھر میں نے کچھ دیر بعد ان کی آواز سنی۔ اس گلی میں گئی ہے۔ پھر میں نے آپ کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔

”تم بڑی بہادر لڑکی ہو۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں اور کافی بنانا ہوں۔ ویسے تم بڑے اچھے دوں پڑھیں۔“

”کیا آپ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔؟ اگر ایسا ہے تو میں تیار ہوں۔“

”لیکن میں سننا چاہوں گا کہ اس شیطان مفت درندہ کے جال میں کیسے پھنسیں۔ اور کیسے نرا ہوئیں۔۔۔۔۔۔؟“

”وہ کس لئے۔۔۔۔۔۔؟“

”اس لئے کہ میں اسے صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہوں۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”میں تم سے اس کے ٹھکانے کے بارے میں سننا چاہوں گا۔ اس لئے کہ تم وہاں سے فرار ہو کر آئی ہو۔ مجھے تم سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔“

”مجھ سے جو بھی مدد، تعاون اور رہنمائی ہو سکتی ہے وہ میں ضرور کروں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”اگر اس شیطان درندہ مفت کو موت کی نیند سلائے تو میں ساتھ چلنے کو بھی تیار ہوں۔“

”میں تنہا یہ کام انجام دوں گا۔“ ٹائیگر بولا۔

”ویسے تمہاری پیشکش کا بہت بہت شکریہ۔ میں کافی بنالادوں۔ پھر میں تمہاری کہانی تمہاری زبانی سنوں گا کہ تم اس جزیرے پر کیسے پہنچیں؟“

نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں کافی بناؤں گی۔ میں اسے اپنی کافی بناتی ہوں۔ دو دو ہو گا؟“

ٹائیگر اسے باورچی خانے میں لے گیا۔ فریج میں سے اس نے کافی کے لئے جو دو دو نکال کر گرم کیا تھا۔ یہی وہ بارش تھی۔ پھر اس لڑکی نے کافی بنائی۔ کافی بہت اچھی اور ذائقہ دار بنائی تھی۔ ٹائیگر سے اچھی۔۔۔۔۔۔ جو کہ کڑا پیلی لڑکی نے کافی پیتے ہوئے کہا شروع کیا۔

”میرا نام بھلا کماری ہے۔ میں میسور یونیورسٹی میں انٹرنل ٹیچر میں ایم اے کر رہی ہوں۔ سال دوم میں ہوں۔ میرے بچاؤ ایک انجینیئر میں سپروائزر ہیں۔ ماما ایک انٹرنش میڈیم اسکول میں ہیڈ مسٹر ہیں۔ میں ان کی انگوٹی ادا دہوں۔ میں اس شیطان درندہ مفت کے جال میں جو پھنسی اس میں میرا پلانا دوش ہے۔

چوں کہ میں آپ کو اپنا مہربان، دوست اور محسن اور بے غلوں ساتھی سمجھ رہی ہوں اس لئے آپ کو جو کچھ بھی بتاؤں گی وہ بالکل سچ ہو گا۔ آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔ یونیورسٹی میں میرا شمار دو ایک حسین لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکیاں اور ہم جماعت مرے حسن کے شہنائی ہیں۔ حقیقت میں میرا جیسا حسن کسی بھی لڑکی کا نہیں ہے۔ میں دو برس سے بیوٹی گون کا خطاب پا رہی ہوں۔ میں شو بزنس کی دنیا میں جانے کے لئے نقص و موسیقی کی تربیت بھی حاصل کی ہوئی ہوں۔ ماما چاہی کی ایک ہی شرط ہے کہ میں ٹرینیشن کرنے کے بعد شو بزنس میں جاؤں یا شادی نہ کر لیاؤں۔

میں اپنے حسن و جمال کی تعریفیں۔۔۔۔۔۔ لڑکوں کے مشق خط و طے۔۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔۔ ایس ایم ایس نے میرے نہ پندار حسن میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے ڈیڈنڈی کے سالانہ اور درمیان میں جو درائی شہو ہوتے تھے ان میں میں اور شہر میں ہونے والے درائی شہو میں مجھے مدد کیا جاتا تھا۔ میں ایک فلمی اداکارہ کی طرح اس ملک کی لڑکیوں کے آئینہ کرتی تھی۔ فلمی رسائل و جرائد میں ان کے تصاویر چھاپتے تھے جن میں عریانیت ہوتی

انمول موتی

انسان کی تمام پریشانیوں کی وجہ تقدیر سے زیادہ چاہتا اور وقت سے پہلے چاہتا ہے۔

اس انسان سے ڈرنا چاہئے جو اپنی برائیوں کو فخر سے بیان کرتا ہے۔

بے بسی اتنا اداس نہیں کرتی، جتنا بے بسی کا احساس ادا کرتا ہے۔

ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لینے آتی ہے۔

(سنیل ماہین طے۔ سرگودھا)

تھی۔ جس نے مجھے بڑی شہرت بخشی۔۔۔۔۔۔ نی دی اور کرنا تک فلم انڈسٹری کے مینی فلم انڈسٹری سے بھی مجھے فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی۔ میں نے اپنے والدین کی شرط کی وجہ سے ان کی آفر ٹھکرا دینے پر مجبور تھی۔ دل کرتا تھا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ دوں۔

میں جو لباس پہنتی تھی وہ بے حجاب ہوتا تھا۔ اس میں میرا نہیں بلکہ ماحول کا اثر تھا جو بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا تھا۔ میری ماں مجھے ٹوکتی تھی کہ تم حد سے زیادہ فیشن پرست ہوئی جا رہی ہو۔ وہ ایک پرانے وقتاؤنی خیالات کی اور پرانی ڈگر پر چلنے والی عورت ہیں۔ حالانکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شہر کے سب سے بڑے انٹرنش میڈیم اسکول کی ہیڈ مسٹر ہیں۔ میں ان کی باتیں سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتی تھی۔

ایک روز ایسا ہوا کہ میں ایک سیکلی کی ساگرہ کی تقریب میں گئی۔ اتفاق سے میری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ مجھے ایک خالی ٹیکسی کھڑی نظر آئی۔ میں اس میں سوار ہو گئی۔ ٹیکسی کچھ دور چلی گئی کہ کسی خرابی کے سبب بند ہو کر رک گئی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کا پلٹ اٹھا کہ انجین ویکر ہاتھ کا ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس میں چار بد معاش تھے۔ ایک اسٹیرنگ پر بیٹھا تھا۔ اس میں سے تین بد معاش اترے

میں کپڑے اٹھا کر کہیں کی طرف لپکا۔ لیکن اس نے کہیں میں مجھے آیا..... وہ راز قد..... مضبوط کرتی بدن کا تھا..... اس نے صرف نیکر پہنی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دبوچ لیا۔

”کہیں میں سہتا تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔“ وہ
تہقہہ مار کر ہنسا۔ ”میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ بن مانگے
خزانہ مل گیا۔“

”مجھے چھوڑ دو.....“ میں اس کے بازوؤں میں
کسمکاتی ہوئی ہدیائی لہجے میں چینی۔

”یقیناً نہیں آ رہا ہے کہ حقیقت بھی اپنے سے کہیں حسین اور رنگین ہو سکتی ہے۔“ اس نے اپنی کرخت اور جھوٹی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں شیطیت نچ رہی تھی۔


Dar Digest 19

کوئی ان کی طرف دیکھتا بھی پسند نہیں کرتا
مجھے اغوا میرے حسن اور پرکشش ہونے کی وجہ
سے کہا گیا.....

میں اب اپنی نظروں میں ہی رسوا ہو گئی تھی.....
 بیل اور حقیر ہو گئی تھی..... گر گئی تھی..... میرے گھر

May 2015

مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔ لیکن میرے کپڑے ابھی
 ہونکے نہیں تھے۔ اس لئے مجھے بے لباسی کی حالت میں

Dar Digest 

اپنی جی بھر کے کرتے تھے۔ میری کزن آٹا نے مجھے
 شکستی چلانے کی تربیت دی ہوئی تھی۔ اس لئے میری

04 May 2013

Dar Digest 196 May 2013

اور نہ ہی کسی سے خود مصکھلا م ہوتا۔ وہاں سے گزرنے والے لوگ اس غیر معمولی حسین منیاسی کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ عمر تقریباً 36 سال، چہرے کی ساخت بہت خوبصورت آنکھیں نیلگوں، کشادہ پیشانی اور جسم سڈول تھا۔ جلد ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ کہیں یہ منیاسی بھودال جاگیر کا منجھلا راج کمار رامیندر نرائن تو نہیں ہے جو بارہ سال قبل مئی 1909ء میں سیاحت و علاج کے دوران وارجلینگ میں اپنی بیوی رانی بھوادتی دیوی اور رانی کے بھائی ستھندر ناتھ اور جاگیر کے بہت سے افسروں اور اہلکاروں کے سامنے پتے کے شدید درد کےعارضہ میں مر چکا تھا اور جس کی موت کی تصدیق کا شوقیت دارجلینگ کا سول سرجن لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر کال ورث جس نے راج کمار کا علاج کیا تھا، جاری کر چکا تھا۔ اس خوبصورت منیاسی کی شکل و شبہات، آنکھیں، ہتھ چال ڈھال اور خدوخال آنجنابی راج کمار سے کامل مشابہت رکھتے تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں لوگ منیاسی کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آنے لگے۔ بند کے قریب ہی مسٹر دیپال مگر جی، جج کا مکان تھا۔ صبح شام سیر کو جاتے ہوئے وہ بھی اس جواں سال منیاسی کو دیکھ کر متاثر ہوتے۔ انہوں نے لوگوں کی چہ میگوئیاں سن کر ایک دہ منیاسی سے کہا کہ لوگ اس پر آنجنابی راج کمار رامیندر نرائن ہونے کا شک کرتے ہیں۔ اسی طرح کئی آدمیوں نے اسی طرح اپنے شک کا اظہار کیا۔ مگر منیاسی کبھی انکار کرتا اور کبھی ٹال مٹول سے کام لیتا۔ مگر لوگوں کا تجسس اور اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ بالآخر 4 مئی 1921ء کو اس پراسرار منیاسی نے اقرار کر لیا کہ وہ بھودال جاگیر کا منجھلا راج کمار رامیندر نرائن ہی ہے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی نہ صرف تمام بنگال بلکہ پورے برصغیر ہندوستان اور اس کے باہر بھی تھلک مچ گیا۔ دنیا راج کمار کو بارہ سال سے مرا ہوا سمجھ رہی تھی اور جس کی موت کی تمام رسومات ایک مدت پہلے ادا کی جا چکی تھیں۔ ان وہ ان کی نظروں کے سامنے جیتا جاتا موجود تھا۔

منیاسی نے جلد ہی بھودال جاگیر میں اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے ڈھاکہ کے کلکٹر اور یونٹو بورڈ کے سامنے کارروائی شروع کر دی۔ جہاں ناکام ہوئے وہاں نے ڈھاکہ کی دیوانی عدالت میں استعراق حق اور مشترکہ حصہ پر قبضہ حاصل کرنے کا باقاعدہ دعویٰ دائر کر دیا اور بالآخر طویل قانونی کارروائی کے بعد اور ہزاروں گواہوں کے بیانات قلم بند کر کے اور مکمل دستاویزی ثبوت مہیا ہونے کے بعد منجھلا راج کمار کی بیوی بھوادتی دیوی اور اس کے بھائی رائے بہادر ستھندر ناتھ کی سخت مخالفت کے باوجود منیاسی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

پرنگہ بھودال۔ ڈھاکہ کے ٹیکس میل شمال میں اور مسن سنگھ کے پچاس میل جنوب میں واقع ہے۔ روایت ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں ایک پٹنار حکمران شام بہاول غازی نے اپنی بھتیجا زندگی یاد اپنی میں گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنا تمام علاقہ اپنے تین ماتحت افسروں کو بخش دیا۔ ان میں دو کا ستھ تھے اور ایک برہمن تھا۔ جو علاقہ برہمن کے حصے میں آیا وہ شاہ بہول غازی کی باد میں بہاول کے نام سے موسوم ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ بنگالی حلقہ کے زیر اثر بھودال شہور ہو گیا۔ بھودال راج کے تحت کئی بڑے بڑے تعلق دار تھے۔ برہمن افسر کی موت کے بعد اس کی اولاد نسل بہ نسل حکومت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ راجہ راجندر ناتھ حکومت کرنے لگا جو راج کمار رامیندر نرائن کا باپ تھا۔

بھودال جاگیر بنگال کی سب سے بڑی جاگیر تھی۔ اس کا رقبہ چھ سو مربع میل تھا اور صرف زمین کی لگان سے اس کی سالانہ آمدنی 1901ء میں دس لاکھ روپیہ سینے یا وہ تھی۔ وسیع جنگلات وغیرہ کی کثیر آمدنی اس کے علاوہ تھی۔ 1901ء میں راجہ راجندر ناتھ کا ڈھاکہ میں انتقال ہو گیا اور اس کی لاش انیشل ٹرین کے ذریعے جاگیر کے صدر مقام بے پور لائی گئی۔ موت کے وقت راجہ نے تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔

راجہ کے بعد ہندو قانون کے مطابق بیٹیوں راج کمار مشترکہ طور پر مساوی حقدار قرار پائے لیکن ان کے

ہونے کی وجہ سے ان کی ماں مانی بحیثیت گھرانہ کا سربراہ تسلیم کرنے لگی۔ یہ حکمران خاندان جاگیر کے سرستام جے پور میں ایک مشترکہ اور شامل حال خاندان کی حیثیت سے راج باڑی میں رہتا تھا۔ دستور کے مطابق راجہ کی بیٹیاں شادی کے بعد بھی اپنے ماں کے گھر میں شوہروں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس وسیع رقبہ میں عالی شان عمارت خاندان کی رہائش لے لئے کی شاندار مہمان خانے۔ زنان خانے اور دھڑری رہائش گاہیں۔ بے شمار خدمت گار اور ملازمین کے رہائش گاہیں بھی احاطہ ہی میں تھے۔ راج باڑی کے اندر میوہ بات کے وسیع باغ۔ شفا خانہ، چڑیا گھر اور ایک گہرا آب بھی تھا۔ راجہ کے اصطبل میں کئی بیش قیمت گھوڑے تھے اور راج باڑی سے تھوڑے فاصلے پر ایک نل تاج خاں جس میں تین ہاشمی بروقت جموئے رہتے تھے۔ باڑی کے متصل ہی دیوتا ایک مذہب کا ایک بڑا مندر تھا جہاں جاگیر کے لوگ پوجا کیا کرتے تھے اور ہر سال کئی مذہبی تقریبات بھی وہیں انجام پاتی تھیں۔ وہیں سامنے باب واقع میدان تھا جہاں دور دور سے ساہو۔ منیاسی نے قیام کرتے تھے۔

راجہ کے خاندان کے قیام کے لئے شہر ڈھاکہ میں رہائش پزیر کنگا کے کنارے ایک عالی شان حویلی تھی۔ بڑو ٹرین کے لئے دریا میں جاگیر کی کئی کئی کشتیاں تھیں رانی میں۔

بیٹیوں راج کمار بچپن ہی سے کھیل کود کی زندگی میں جتا ہو گئے اور ابتدائی تعلیم کے سوا کچھ حاصل نہ کئے۔ منجھلا راج کمار رامیندر نرائن ایک انتہائی شہسوار و عیاش نوجوان تھا۔ کلکتہ، ڈھاکہ اور دیگر شہروں میں اس نے کئی بازاری عورتوں سے تعلقات پیدا کر لئے تھے ان پر بے دریغ دولت خرچ کرتا تھا۔

1900ء میں بڑے راج کمار کی شادی رانی بھوادتی دیوی سے ہو چکی تھی جو کلکتہ کے ایک متمول خاندان اور معزز برہمن خاندان کی لڑکی تھی۔ 1902ء میں راج کمار کی شادی بھوادتی دیوی سے ہو گئی

اور 1904ء میں چھوٹے راج کمار کی شادی آنند کمار کی دیوی سے ہوئی تھی۔ منجھلا راج کمار کی بیوی بھوادتی دیوی کا باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ بھوادتی دیوی کے صرف ایک بھائی اور دو بیٹیاں تھیں۔ یہ چاروں بچے اپنی ماں پھول کمار کی کے ساتھ اپنے ماموں پر تپا بن نارائن کے سہارے زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ایک بہت متمول اور باعزت شخص تھا مگر بھگتی حکمران خاندان کا ہم پل نہ تھا اور منجھلا راج کمار کا رشتہ بھوادتی دیوی کے ساتھ اس کے بے نظیر حسن و جمال کی وجہ سے قرار پایا تھا۔ شادی کے بعد بھی منجھلا راج کمار نے اپنی بری عادتوں کو نہ چھوڑا اور بدستور طوائفوں کے کٹھوں میں شب و روز گزارتا رہا۔ رانی بھوادتی دیوی سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ اپنا شوق وہ کلکتہ اور ڈھاکہ کی بدنام گلیوں میں پامچرے میں مروا تھا۔ ان میں یا شکار میں گزارتا تھا۔ وہ جلد ہی آنکھ کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔

1907ء میں رانی بلاس کا انتقال ہو گیا اور بیٹیوں راج کماروں نے مشترکہ طور پر جاگیر کا انتظام سنبھال لیا۔ ہندو قانون کے مطابق بڑا راج کمار بطور کرتا دھرتا کے منتظم اعلیٰ تھا۔ ان ہی دنوں منجھلا راج کمار کے آنکھ نے کچھ شدت اختیار کر لی اور دونوں بازوؤں اور ٹانگوں پر چھوڑے نکل آئے اور اسے علاج کی غرض سے کلکتہ جانا پڑا۔ جہاں وہ دو ماہ تک بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں سے علاج کرواتا رہا۔ اسی قیام کے دوران اس حکمران خاندان نے لاہور کچر کو شکار کے لئے بے پور آنے کی دعوت دی۔

13 فروری 1909ء کو لاہور کچر انیشل ٹرین کے ذریعے اعلیٰ حکام اور ملٹری کے بڑے بڑے کمانڈروں کے ہمراہ بے پور پہنچے اور راج باڑی کے عالی شان مہمان خانہ میں فروکش ہوئے۔ دوسرے روز یہ پارٹی باقیوں پر سوار ہو کر منجھلا راج کمار کی معیت میں بھودال کے گھنے جنگلوں میں شکار کرتی رہی۔

کلکتہ کے اس قیام کے دوران رانی بھوادتی دیوی کا بھائی ستھندر ناتھ جو منجھلا راج کمار سے ایک سال چھوٹا تھا اور بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد قانون کا طالب علم تھا۔ منجھلا راج کمار کے پاس اکثر و بیشتر قیام

پڑ رہا اور پٹیلے راج کمار کو علاج اور جلدی آب دھوا کی غرض سے دارجلینگ کے پہاڑی مقام پر چلنے کی ترغیب دیتا رہا۔ لاڈلہ پتھر کے ٹکڑے کے بعد ستید راتھ پھر بے پور آیا اور ایک ماہ تک پٹیلے راج کمار کے پاس قیام کیا اور اسے دارجلینگ کے سفر کے لئے آہود کر لیا۔ دارجلینگ میں قیام کے انتظامات کرنے کے لئے ستید راتھ اور پٹیلے راج کمار کا پرائیویٹ سیکریٹری دارجلینگ گیا۔ جہاں اس نے پہاڑ پر ایک کوئی کرائے پر حاصل کر لی۔ اس کے بعد ستید راتھ پٹیلے راج کمار کو لے جانے کے لئے بے پور لوٹ آیا۔ رانی بھادوی دیوی نے اب تک اپنے شوہر کے ساتھ اکیلے سفر نہیں کیا تھا۔ رواج کے مطابق نوجوان بھوکا اپنے شوہر کے ساتھ اکیلے سفر کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے وہ جب بھی شوہر کے ساتھ سفر پر جاتی تھی تو اس کے ہمراہ ستیہ بھالیا راج کمار کی ہمیش بھی جاتی تھیں۔ مگر اس دفعہ ستید راتھ نے بتایا کہ کوئی میں رہائش کی ہے اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ رانی بھادوی دیوی کے ساتھ خاندان کی کوئی دوسری عورت نہیں جائے گی۔

18 اپریل 1909ء کو پٹیلے راج کمار اور رانی بھادوی دیوی دارجلینگ کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ رانی کا بھائی ستید راتھ خاندان کا ڈاکٹر آشتوش داس۔ راج کمار کا ایک پرائیویٹ سیکریٹری کئی محافظ چار خاندانے نوکر تھیں خدمت گار اور دیگر عملے کے ارکان تھے۔ 20 اپریل 1909ء کو بے پور کی دارجلینگ پہنچ گئی اور مذکورہ کوئی میں قیام پذیر ہوئی۔ پٹیلے راج کمار کی ہمسفر اس پارٹی کے افراد کے بیان کے مطابق 5 مئی 1909ء کو رات کو پٹیلے راج کمار کے پیٹ میں سخت درد اٹھا اور دارجلینگ کے سول سرجن اور ڈاکٹر آشتوش داس کے علاج کے باوجود 8 مئی 1909ء کو آدھی رات کے وقت پتے کے شدید عارضہ میں پٹیلے راج کمار کا انتقال ہو گیا اور دوسرے روز صبح یعنی نو بجے کو اس کی آخری ایک جلوس کی شکل میں دارجلینگ کے شمشان میں لے جا کر جلا دی گئی۔ 10 مئی 1909ء کو رانی بھادوی دیوی۔ اس کا

بھائی ستید راتھ اور دیگر لوگ دارجلینگ سے کل ٹرین میں بے پور کی طرف روانہ ہوئے۔ بے پور میں 6 اور 7 مئی کو دارجلینگ سے بھیجے ہوئے کچھ تارے تھے۔ جن میں ایک میں پٹیلے راج کمار کو خفیف سا بخار دوسرے میں پیٹ میں کچھ تکلیف اور مرض میں افادہ کی اطلاع تیسرے تارے میں کئی گئی۔ لہذا چھوٹا راج کمار بہت سے عزیزوں اور عملے کے ساتھ دارجلینگ پہنچنے کے لئے 9 مئی کو صبح کے وقت بے پور۔ ریلوے اسٹیشن کے لئے روانہ ہوا۔ مگر راستے میں اسے نوبے صبح دارجلینگ سے دو تارے ایک میں پٹیلے راج کمار کی شدید علامات اور دوسرے میں اس کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ جب دارجلینگ میں پورہوا جنکشن پہنچی تو رانی بھادوی دیوی اور اس کے ہمراہ پارٹی کو بے پور جانے کے لئے گاڑی بدلنے کی غرض سے میل سے اتر پڑا۔ وہاں ان کو بے پور سے آئی ہوئی ایک پارٹی مل گئی۔ جس میں راج کمار کے بھائی اور کچھ عزیزوں کے علاوہ بہت سے محافظ اور دربان تھے۔ بڑے راج کمار کو ستید راتھ پر اعتماد تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ ستید راتھ کہیں اپنی بیوہ بہن رانی بھادوی کو بھانے بے پور لانے کے براہ راست کلکتہ نہ لے جائے۔ رانی بھادوی کا ستید راتھ کے قبضہ میں چلے جانا جاگیر کی ملکیت اور آمدنی کے تیسرے حصے سے محروم ہونے کے مترادف تھا کیونکہ وہ اس کے آنجنابی شوہر کی ملکیت کی مالک تھی۔ بڑے راج کمار نے یہ بڑی پارٹی رانی بھادوی کو ہر حالت میں بے پور لانے کے لئے بھیجی تھی ان حالات میں ستید راتھ کو بھی یہ یقین کے ساتھ بے پور آنا پڑا۔ بے پور میں رانی بھادوی دیوی اپنے شوہر کے سوگ میں آہو بکا کرتے ٹھہرا ہوتی چلی گئی اور جب بھی ستید راتھ اس سے ملنے کی کوشش کرتا تو وہ منہ موڑ لیتی اور ایک دفعہ تو ایک ملازم نے یہ کہنے ہوئے بھی سنا۔ ”میرے قریب مت آؤ۔ تم ہی نے مجھے ایک رانی بنایا تھا اور تم ہی نے مجھے اب ایک بھکار بنادیا ہے۔“

بار بار کوشش کی گئی کہ وہ دارجلینگ میں پٹیلے راج

کمار کی بیماری کی تفصیل بتائے۔ مگر پٹیلے راج کمار کا نام آئے ہی وہ زار و قطار رونے لگتی۔ اور سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ پاتی تھی کہ..... ”مجھ بڑے نصیب کو نہ تو جادواری کا موقع ملا اور نہ عالم نزع سے پہلے میں راج کمار کے پاس زیادہ جا سکی۔“

بڑا راج کمار اور چھوٹا راج کمار ہر طرح سے اس کی دیکھتی کرتے تھے۔ اور دارجلینگ سے آنے کے بعد ہی سے ستید راتھ ہر ماہ اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح رانی بھادوی کو اپنے قبضہ میں کر لے مگر بظاہر دونوں راج کماروں سے محبت سے ملتا رہا۔ کچھ دنوں بعد اسے یہ مدد بھی میسر آ گیا۔

جاگیر کے منیجر مسٹر سین کے خلاف زمین کا الزام لگایا گیا اور یقین تھا کہ اسے نوکری سے برطرف کر کے قید کر دیا جائے گا ستید راتھ نے اسے دلاسا دیا کہ اگر وہ رانی بھادوی دیوی کو ہوا کر لے تو سین کو ہر طرح سے بڑے راج کمار کو سمجھا بھگا کر بچا لیا جائے گا۔ سین اپنے بھی دونوں راج کماروں سے ناراض ہو چکا تھا۔ وہ اس کام میں لگ گیا اور رفتہ رفتہ اس نے رانی بھادوی دیوی کا دل توڑے ستید راتھ کی طرف سے صاف کر دیا۔ یہ سن کر ستید راتھ کی ہمت بندھی اور اس نے اپنی ماں اور بیوی کو تار پازہ سے ڈھاکہ منتقل کر دیا۔ جہاں سب بے گھر ہو گئے۔ ڈھاکہ کل میں میل کے قریب پر تھا اور رانی بھادوی اب اپنی ماں کے پاس اکثر و بیشتر آنے لگی اور رفتہ رفتہ ستید راتھ کے ہاتھوں میں ایک ٹھکانہ بن کر رہ گئی۔

4 نومبر 1909ء کو اس نے اپنے بھائی

رئیس وصول کرنے لگا۔ اس کے علاوہ بیوہ رانی کا الالہ نلس جو بڑے بڑے ہتے سات ہزار روپیہ ماہوار ہو گیا تھا۔ وہ بھی وصول کرنے لگا۔

وقت گزرتا گیا۔ ستمبر 2010ء میں بڑے راج کمار کا انتقال ہو گیا اور اپریل 1911ء میں رانی بھادوی دیوی نے بے پور کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہا اور ستید راتھ کے ساتھ کلکتہ میں رہنے لگی۔ 1913ء میں چھوٹا راج کمار بھی مر گیا اور اس کی بیوہ رانی آئندہ کماری بھی راجپاڑی چھوڑ کر اپنے بھائیوں کے ساتھ ڈھاکہ میں رہنے لگی۔ مرنے سے پہلے چھوٹے راج کمار نے رانی آئندہ دیوی کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے رام نرائن کو گود لے لیا۔

پٹیلے راج کمار کی موت کے بعد ہی بے پور دیپور پورے بنگال میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ اس کی لاش جلائی نہ جا سکی تھی عام طور سے یہ خبر پٹیلے راج کمار کے ایک وفادار نوکر شریف خان سے منسوب کی جا چکی تھی جو راج کمار کے ساتھ دارجلینگ گیا تھا۔ مگر خود شریف خان بھی دارجلینگ سے آنے کے بعد مر گیا تھا۔ ابھی یہ افواہ گرم تھی تھی کہ چار مہینے بعد ہی ایک منیسی گھوڑا پھرتا ہے پورڈا نکلا اور مذہب باڑی والے میدان میں مقیم ہوا۔ اس میدان میں دور دور سے سادھو منیسی آ کر قیام کرتے تھے اور ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھووال جاگیر کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ ایک رات وہ نووارد منیسی ایک دوسرے منیسی سے جو گفتگو تھا تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں کا پٹیلے راج کمار دارجلینگ گیا تھا جہاں وہ مر گیا اور کہتے ہیں کہ اس کی لاش شمشان سے غائب ہو گئی تھی اور جلائی نہ جا سکی تھی یہ سن کر نووارد منیسی نے کہا کہ کچھ ہی دن ہوئے اسے سیاحت کے دوران چار منیسی ملے تھے ان کے ساتھ ایک مخروطی الجھاس نوجوان تھا جس کے متعلق وہ کہتے تھے کہ اسے وہ دارجلینگ کے شمشان سے اٹھائے تھے۔ منیسی نے کہا کہ صبح جاگیر کے ملازم سادھو منیسیوں کا ناشتہ لے کر آئیں گے تو انہیں یہ بات بتادی جائے گی۔ نووارد گھبرا کر بولا۔ ”تاب بابا۔ یہ راجاؤں کے

محالات ہیں۔ میں مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔ معلوم ہوا کہ نوجوان تھا۔ مگر سنیا سی کا اصرار تھا کہ اس بات میں کوئی ہرج نہیں۔ اس پر تو دارو سنیا سی خاموش رہا۔ رات زیادہ گزر رہی تھی میدان میں منیم سنیا سی ہو گئے۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نو دارو سنیا سی کا کہیں پڑنا تھا۔ وہ رات ہی کو غائب ہو گیا تھا جب راج باڑی کے ملازم ناشتہ لے کر میدان میں پہنچے تو اس سنیا سی نے نو دارو سنیا سی کی زبانی جو اجراما سنا تھا ان سے بیان کیا۔ ملازم اسی وقت راج باڑی پہنچے اور تمام حقیقت بڑے راج کمار کے سامنے بیان کی۔ نو دارو طرف ہر کار سے دوڑائے گئے کہ نو دارو سنیا سی کو تلاش کر کے لائیں مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس پر بھی چاروں طرف تلاش پارٹیاں روانہ کی گئیں تاکہ اس خبر کی صداقت معلوم کی جائے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا سنی ساہو جو ہمیشہ چپ رہتا تھا۔ آن کر مذہب باڑی والے میدان میں منیم ہوا۔ رانی ستیہ بھاما اور چوٹی دیوی کیلان میں منیم ہر ساہو سنیا سی سے اس افواہ کے بارے میں معلوم کرتی تھیں۔ اس سنی ساہو نے پوچھنے پر کاغذ پر کچھ ایسا جواب لکھا۔ جس سے ان کی کچھ ہمت بندھ گئی اور ان کے خیال کو تقویت ملی کہ شاید بھٹلا راج کمار بھی زندہ ہے۔

کئی سال گزر گئے مگر یہ افواہ گشت لگاتی رہی۔ ان سے متاثر ہو کر 3 ستمبر 1917ء کو رانی ستیہ بھاما نے مہاراجہ برودان کو حسب ذیل خط لکھا۔

عالی جناب! میری آشریاد۔ میں آنجنابی راجہ کالی نارائن کی بیوہ اور آنجنابی راجہ راجندر نارائن کی ماں ہوں۔ میرے تین پوتے تھے۔ تینوں عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ تینوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ اور اسی طرح ہماری نسل کا حرام گل ہو چکا ہے۔ آٹھ سال ہوئے میرا منہلا پوتا اپنی بیوی اور سالے کے ساتھ دارجلنگ گیا تھا۔ جہاں وہ خون کے دست کے عارضہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔ عرصہ سے یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ وہ زندہ ہے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد جب اس کی ارگشی شمشان لے

جائی گئی تو سخت بارش اور تورا کا طوفان آیا اور لوگ اس کی لاش کو بغیر جلانے کہیں پناہ لینے چلے گئے اس دوران وہاں ایک سنیا سی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آٹکلا اور میر سے پوتے کو اغوا کر لے گیا اور علاج محال ہے اسے سندھ میں کر لیا کہتے ہیں کہ میرا پوتا اب ان کے ساتھ وینا دیہا سے بے نیاز ہو گیا مگر رہا ہے جو لوگ دارجلنگ گئے تھے۔ ان کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ میرے بھٹلے پوتے کی موت کے وقت جو دارجلنگ میں قیام پذیر تھے اور آپ ہی نے ارگشی کے لئے لنگھال جل اور کئی کے چوں کا انتظام کیا تھا۔ اس لئے میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ یہ افواہ کہاں تک درست ہے۔ کیا بھٹلے راج کمار کی لاش واقعی جلادی گئی تھی؟ اگر آپ مجھے اس امر سے واقف کریں تو کچھ میرا کامان ہو جائے گا۔

مہاراجہ برودان نے جواب میں تحریر کیا کہ ان کی کوٹھی شمشان سے کچھ ہی فاصلے پر پہاڑ کی بلندی پر تھی جہاں سے شمشان نظر آتا تھا انہوں نے لوگوں کا مجمع تو ضرور دیکھا تھا اور انہیں بتایا گیا تھا کہ بھودال کے بھٹلے راج کمار کی ارگشی لائی گئی ہے مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے خود دارو میں شریک ہونے کے لئے شمشان نہ جاسکے تھے نہ انہیں اتنے سال بعد یہ افواہ کہ ارگشی رات میں ہادن میں لائی گئی تھی اس کے علاوہ انہیں کچھ اور معلوم نہیں۔

اس طرح کئی سال گزر گئے تینوں راج کمار مر چکے تھے ان کی بیوہ رانیاں اور راج باڑی سے اپنے عزیزوں کے ہاں منتقل ہو چکی تھیں 1920ء تک تمام جاگیر کا انتظام کورٹ آف داروڈ نے سنبھال لیا تھا۔ بیوہ رانیاں کو ان کے شوہروں کے حصہ کی آمدنی ملتی رہی۔ اور اس وقت رانی بھوادنی دیوی کو کتر بیا بیس لاکھ روپیہ مل چکا تھا جو سب کا سب سمیٹ کر تاجہ کے کام آ رہا تھا۔ اپنے نام پر ٹکٹے میں اس نے کئی کوٹھیاں خرید لی تھیں۔ اب وہ ایک بہت بڑا آدمی بن چکا تھا اور سلطنت برطانیہ نے اسے رائے بہادر کا خطاب بھی عطا کر دیا تھا۔

پرستہ وہ حالات جب دسمبر 1920ء میں وہ تک دھڑنگ دیسی جٹا سیں دیسی داڑھی اور تمام بدن پر بھوت

لنے والا ساہو ڈھاکہ کے بک لینڈ بندر نمودار ہوا تھا۔ اپریل 1921ء تک یہ خبر تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی کہ ڈھاکہ میں ایک خوبصورت سنیا سی نے دریا کے کنارے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ جس کے متعلق افواہ ہے کہ وہ بھودال جاگیر کا بھٹلا راج کمار ہے۔ جو بارہ سال قبل دارجلنگ میں مر چکا تھا۔ دور دراز علاقوں سے ہزاروں لوگ اسے دیکھنے کے لئے آنے لگے۔

12 اپریل 1921ء کو یہ سنیا سی اس جگہ سے اٹھ کر راج باڑی کے مذہب باڑی والے میدان میں ایک آم کے درخت کے نیچے بھوتی را کر بیٹھ گیا یہ خبر بھٹلے راج کمار کی بہن چیتو دیوی تک پہنچی چکی تھی۔ لیکن حکومت کی تدارکشی کے خیال سے وہ اب تک کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ لیکن جب سنیا سی مذہب باڑی کے میدان میں آن بیٹھا تو دوسرے روز ہی اس نے سنیا سی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

غروب آفتاب کے بعد سنیا سی چیتو دیوی کے گھر پہنچا اور گھر کے برآمدے میں ایک چٹائی پر نگاہ نیچے کر کے بیٹھ گیا اس کے قریب ہی چیتو دیوی اُٹکی داوی رانی ستیہ بھاما اور چیتو دیوی کی دو بیٹیاں اور کچھ عزیز بیٹھ گئے اور سب لوگ سنیا سی کا چٹائی غور سے دیکھنے لگے۔ لیکن تمام جسم پر بھوت دیسی داڑھی اور دراز جٹا سیں اور شام کے عہد لکے کی وجہ سے وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے کہ آیا بھٹلا راج کمار وہی ہے۔ قد وہی تھا چال ڈھال وہی تھی۔ چہرے کے خدوخال وہی تھے مگر اندھیرے کی وجہ سے آنکھوں کا رنگ نہ دیکھا جاسکتا تھا۔ چیتو دیوی نے سنیا سی سے پوچھا۔

”ساہو بابا۔۔۔ تم یہاں کتنے دن قیام کرو گے؟“ ”بہر حال دریائے برہم پتر میں اشنان کرنے چلے جائیں گے۔“ سنیا سی نے دم آواز میں کہا۔

اس شام گھر والوں نے کچھ چل دی اور خبر سنیا سی کے سامنے رکھا۔ مگر اس نے سوائے تھوڑے سے خبر کے کچھ نہ پوچھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ گھر والوں نے مشورہ کیا کہ اسے روز سنیا سی کو پھر دعوت پر بلایا جائے اور دن کی

روشنی میں اسے شناخت کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن گاڑی بھیج کر سنیا سی کو بلوایا گیا۔ دن کے بارہ بجے وہ پھر چیتو دیوی کے گھر پہنچ گیا۔ اس دفعہ اسے بیٹھک میں کرسی پر بٹھایا گیا گھر کے سب لوگ وہاں آ گئے۔ چیتو دیوی اور ستیہ بھاما بھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ قریب ہی ایک قیمتی مرصع چوٹی چوٹی رکھی تھی۔ جس کے ایک سرے پر چیتو دیوی کا بہنوئی بیٹھ گیا سنیا سی نے رانی ستیہ بھاما کو ہندی زبان میں کہا۔ ”تم کو چوٹی پر بیٹھنا چاہئے۔“ رانی ستیہ بھاما کھسک کر چوٹی کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔ مگر سنیا سی پھر بولا۔ ”اٹھ کر آرام سے چوٹی پر بیٹھو۔“ رانی ستیہ بھاما اٹھ کر چوٹی پر سنیا سی کے مقابل بیٹھ گئی۔ سنیا سی نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر رانی ستیہ بھاما کا پاؤں پکڑ کر اپنی طرف کھینچا آہستہ سے گردن ہلا کر کہنے لگا۔ ”بڑھی کو بردلا دکھا ہے۔“

اس کے بعد اس نے چیتو دیوی کی دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیتو دیوی سے کہا۔

”یہ دونوں تمہاری بیٹیاں ہیں؟“ اور اس لڑکے کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ تمہارا بیٹا ہے۔“

پھر اس کے بھانجوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ دونوں تمہاری بہن کے بیٹے ہیں۔“ آخر میں چیتو دیوی کی بھانجی کشی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”کیون ہے؟“

چیتو دیوی نے جواب دیا۔ ”یہ میری بڑی بہن کی بیٹی ہے۔“ یہ سنتے ہی سنیا سی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے نوجوان کشی دیوی اس وقت تک بیوہ ہو چکی تھی۔ اتنے میں چیتو دیوی کا بھانجا سنیا سی کے مقابل آکر اسے بھٹلے راج کمار کا فوٹو دکھانے لگا۔ جوں ہی سنیا سی کی نگاہ فوٹو پر پڑی اس کے آنسو بہنے لگے اور اس نے فوٹو کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس کے بعد چیتو دیوی کا بھانجا پھر اسے چھوٹے راج کمار کا فوٹو دکھانے لگا۔ آنجنابی بھٹلے راج کمار کو چھوٹے راج کمار سے بہت محبت تھی۔ فوٹو پر نظر پڑتے ہی سنیا سی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور پھر اس نے اپنی آنکھوں پر اپنی ہتھیلی رکھی۔ یہ دیکھ کر چیتو دیوی سنیا سی سے مخاطب ہوئی۔

”سنیاسی تم تو تیا کی (تارک الدنیا) ہو۔ پھر اتنا کس کے واسطے دوتے ہو؟“

”ہم بایا (فلس) کی وجہ سے دوتے ہیں۔“

”لیکن تم تو تیا کی ہو۔ پھر فلس کس کے لئے دوتے پر مجبور کر دیا ہے۔“ چیترو دیوی بولی۔

سنیاسی خاموش رہا۔۔۔ تو چیترو دیوی پھر بولی۔

”کہتے ہیں کہ میرا منٹھلا بھائی دارجلینگ میں مر گیا اور جب اسے جلانے کے لئے ششمان لے گئے تو ہوا اور بارش کا ایک خوف ناک طوفان آیا۔ تو لوگ اس کی اثری چھوڑ کر پناہ لینے کی غرض سے کہیں چلے گئے۔ اور جب طوفان ٹھنے پرواپس لوٹے تو لاش عائب تھی۔ جو لوگ میرے بھائی کے ساتھ دارجلینگ گئے تھے۔ ان میں کچھ تو کہتے ہیں کہ لاش جلادی گئی تھی اور کچھ کہتے ہیں کہ جلانی نہ جا سکی تھی اور۔۔۔۔۔“

ابھی چیترو دیوی اپنا جملہ پورا نہ کر سکی تھی کہ سنیاسی بول پڑا۔

”نہیں نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ اس کی لاش نہیں جلانی جا سکی تھی۔ وہ ابھی زندہ ہے۔“

اس پر سب لوگوں نے انتہائی انہماک سے سنیاسی کو گھورتا شروع کر دیا۔ اور پھر سنیاسی کو جانچنے کے لئے چیترو دیوی نے بنگالی زبان میں کہا۔

”سنیاسی! تمہارے جسم کا ہر حصہ۔ چال و حال اور تمہارے خدو خال ہو، ہر ہر حصے بھائی جیسے ہیں۔ کیا تم وہی ہو؟“

سنیاسی نے بھی ہندی میں جواب دیا۔

”نہیں بابا۔ میں تمہارا کچھ نہیں لگتا۔“

اس کے بعد سنیاسی کے سامنے کھانا لایا گیا۔

چیترو دیوی نے دیکھا کہ سنیاسی کے ہاتھ کی شہادت والی انگلی ٹھٹھے راج کمار کی طرح دوسری تمام انگلیوں سے بڑی تھی اور ٹھٹھے راج کمار کی طرح سنیاسی فقرے لیتے وقت زبان کچھ باہر نکالتا تھا وہی سنگیوں آنکھیں۔ وہی انگلیوں کے ناخن، وہی آواز وہی قد تھا۔ لیکن تمام جسم پر بھوت، لمبی داڑھی، لمبی بٹاؤں نے ہیبت بدل کے رکھ دی تھی کہ اس

روز بھی کوئی حسی فیصلہ نہ ہو سکا۔ چیترو دیوی نے کوشش کی کہ سنیاسی کچھ روز اس کے گھر پر قیام کر لے مگر سنیاسی کوششی کے اصرار کے لئے چٹا گنگ ضلع میں چند راتھ کے مقام پر پہنچتا تھا۔ دس روز بعد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ شام کو چار بجے چلا گیا۔ 20 اپریل 1921ء کو چیترو دیوی کو خبر ہوئی کہ سنیاسی نے چند راتھ سے واپس لوٹ کر بک لینڈ بند پر آسن جمالیا ہے اس نے اپنے بیٹے کو اور ایک بڑے زمیندار رائے پرشاد کو ڈھاکہ بھیج کر سنیاسی کو جے پور بلوایا اور اسے بیٹھک میں ٹھہرا دیا گیا۔ جہاں پہلے ہی آنجنائی بڑے کمار دھوٹے کمار، راجہ راجندر ناتھ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے فوٹو آویزاں کر دیے گئے تھے۔ دروازہ کے سوراخ میں سے چیترو دیوی نے جھانک کر دیکھا کہ ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر سنیاسی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ دوسرے روز سنیاسی علی راج تالاب سے اصرار کر کے لوٹا اور کہنے لگا۔

”میری بیٹھک کی صفائی کر دو۔“

یہ سن کر سب کو یقین ہو گیا کہ سنیاسی کے بھیس میں سوائے ٹھٹھے راج کمار کے اور کوئی نہیں۔ کیونکہ جس بیٹھک میں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ چیترو دیوی کے بھائی بھیک کی بیٹھک تھی۔ ان کے بعد چیترو دیوی نے سنیاسی سے اصرار کرنا شروع کر دیا وہ اپنے جسم پر بھوت ملنا ترک کر دے۔ مگر اس نے اول کوئی پرواہ نہ کی لیکن چیترو دیوی اور سنیاسی کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔

3 مئی 1921ء کو جب سنیاسی اصرار کر کے تالاب سے لوٹا تو چیترو دیوی اور گھر کے دیگر افراد نے اس کے جسم کو پہلی بار بغیر بھوت ملے ہوئے اپنے اسلی پھرے میں دیکھا۔ وہی سفید سرخی آمیز رنگت، وہی دانی ٹانگ پر بچپن میں گاڑی کے پیسے پکھرجانے کا نشان وہی پائیں بازو پر چھوڑے کے زخم کا گول نشان موجود تھا۔ گھر کے تمام افراد نے بخوبی شناخت کر لیا کہ سنیاسی کے روپ میں بارہ سال قبل مرجانے والا بھووال کا منٹھلا راج کمار رامیندر ناتھن ہے۔ مگر سنیاسی اب بھی اس بات سے انکار کر رہا تھا۔ فوراً ہی گھر کے ملازمین اور خدمت

کاروں کے ذریعے یہ بات بے پور اور قریب و جوار میں آگ کی طرح پھیل گئی اور 4 مئی 1921ء کو علی راج ہی انسانوں کا ایک جم غفیر بے پور آئے اور میدان میں جمع ہو گیا۔ سنیاسی اب بھی خود کو منٹھلا راج کمار تسلیم کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس پر چیترو دیوی نے سنیاسی سے بر ملا کہا۔ ”تمہارے جسم پر سارے نشانات تمہارا رنگ، تمہاری آنکھیں، تمہارا قد تمہاری آواز اور تمہاری ہر چیز میرے ٹھٹھے بھائی جیسی ہے۔ تم وہی ہو۔ سنیاسی تم اپنی اپنی شخصیت کا اظہار کرو۔ جب تک تم ایسا نہ کرو گے میں کھانا چنا بکھل کر کھادوں گی۔“

باہر لاتعداد انسانوں کا ہجوم جمع ہو کر سنیاسی کو دیکھنے کا اصرار کر رہا تھا۔ لہذا سنیاسی نے باہر لا کر جمع کے درمیان ایک اونچے چیتروے پر ایک کرسی پر بیٹھا دیا گیا تمام جمع التہا کرنے لگا کہ وہ اپنی اصلی شخصیت ظاہر کر دے۔ شام کو پانچ بجے سنیاسی نے آخر کار جمع کے سامنے تسلیم کر لیا کہ وہ منٹھلا راج کمار رامیندر ناتھن ہی ہے جسے دنیا بارہ سال سے مرا ہوا سمجھ رہی تھی۔ ”راج کمار کی ہے“ کا فلفل شکاف فخر اٹھا اور لوگوں نے وہیں ٹھہرانے پس کرنے شروع کر دیے۔

حکومت بنگال اور خصوصاً کورٹ آف وارڈز کے حالات روز بروز خدو خد تہوتے جا رہے تھے۔ جب سنیاسی نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ بھووال جاگیر کا منٹھلا راج کمار ہے تو مزاحمت نے بجائے کورٹ آف وارڈز کو زمین کا لگان دینے کے سنیاسی کو دنیا شروع کر دیا۔ حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے کورٹ آف وارڈز کے منیجر فریڈریم نے جن کے زیر انتظام جاگیر تھی 5 مئی 1921ء کو ہی ڈھاکہ کے کلکٹر کو ایک خفیہ رپورٹ تحریر کر کے روانہ کی جس میں ان تمام واقعات کی تفصیل دراطلاع دی گئی اور آگاہ کیا گیا کہ سنیاسی کا طرف داری میں عوام کا جوش و خروش اتنا بڑھ چکا ہے کہ فوراً کارروائی نہ کی گئی تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے اسی قسم کی دوسری رپورٹ بے پور تھانے کے افسر علی کے حکام کو ارسال کی۔

لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ جوت و جوت ہزاروں کی تعداد میں بے پور میں روزانہ اٹھتے چلے آ رہے تھے۔ مجورا ایسٹ بنگلا ریلوے کو اس بے پایاں ہجوم کو بے پور پہنچانے کے لئے دو دور کے مقامات سے ایکٹل ٹرینیں چلائی پڑیں 15 مئی 1921ء کی سہ پہر تک لاکھوں انسانوں کا جم غفیر راجپاڑی کے قریب میدان میں جمع ہو چکا تھا اور سنیاسی کو دیکھنے کے لئے نعرے لگا رہا تھا۔ چار بجے شام سنیاسی ایک باقی پر سوار ہو کر انسانوں کے اس سیلاب کے درمیان سے گزرا۔ لوگوں نے سنیاسی کو اس کے حقوق دلانے کی غرض سے ایک ایسی انیشن قائم کر دی اور لاکھوں روپیہ چندہ جمع ہو گیا راج کمار کی ختیوں ہمیشہ اس کی وادی ملی ستیہ بھما، بڑے راج کمار کی بیوہ رانی سرجو بالا اور دوسرے تمام عزیز سنیاسی کو اچھی طرح پرکھنے کے بعد منٹھلا راج کمار تسلیم کر چکے تھے۔ مگر ٹھٹھے راج کمار کی بیوی رانی بھادوی دیوی اور اس کے بھائی رائے بہادر ستیہ راتھ نے اسے منٹھلا راج کمار تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ منٹھلا راج کمار بارہ سال پہلے دارجلینگ میں نصف شب کے قریب ان کی نظر کے سامنے فوت ہو چکا تھا اور دوسرے دن صبح دس بجے اس کی لاش جلا کر رکھ کر دی گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ یہ سنیاسی دراصل بختاب کے قصبہ اچلا کا رہنے والا شخص مال سنگھ ہے جسے چند باڑی لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر فرضی منٹھلا راج کمار بنا کر رکھ کر دیا ہے۔

ادھر راج کمار کی ختیوں بہنوں نے ڈھاکہ کے کلکٹر کو ایک عرض داشت پیش کی کہ تحقیقات کرائی جائے کہ آیا یہ سنیاسی منٹھلا راج مار رامیندر ناتھن ہی ہے اور اگر تحقیق سے یہ بات ثابت ہو جائے تو پھر ٹھٹھے راج کمار کو اس کے حقوق واپس تفویض کئے جائیں۔ مگر اس عرض داشت پر کوئی کارروائی مکمل نہیں ہوئی۔

ادھر ستیہ راتھ نے سنیاسی کو مکمل سازنا ثابت کرنے کی تک دو شروع کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر سنیاسی کو منٹھلا راج کمار تسلیم کر لیا گیا تو وہ خود جاگیر کی تیسرے

جسے کی آمدنی سے محروم ہو جائے گا جو وہ اپنی بہن رانی بھادی دیوی کے ذریعے وصول کر رہا تھا۔ یہ بھی یقینی تھا کہ ایسی صورت حال میں دارجلینگ میں اس نے اور ڈاکٹر آشوتوش نے سازش کر کے پھیلے راج کمار کی جان لینے کی جو کوشش کی تھی۔ اس کا پروردہ چاک ہو جائے گا۔ رانی بھادی دیوی پورے طور پر اپنے بھائی کے ہاتھ میں کھ پتی بن چکی تھی۔ اس کو اندیشہ تھا کہ بھائی قانون کے شکنجے میں کس لیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اس نے پھیلے راج کمار کے ساتھ جو زندگی گزاری تھی۔ وہ بھی نہایت ناخوشوار تھی۔ لہذا اس نے ہر حالت میں اپنے بھائی کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علاوہ ازیں حکومت بنگال بھی کورٹ آف وارڈز کے ذریعے سنیا سی کی پوری مخالفت کر رہی تھی۔

29 مئی 1921ء کو سنیا سی نے ڈھاکہ کے کلکٹر سے ملاقات کر کے اپنے حقوق کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ اس نے اول تا آخر اپنی سرگزشت کے تفصیل وار واقعات بتائے۔ مگر کلکٹر نے جواب دیا کہ ”اگر سچ ہو تو عدالت میں باقاعدہ دعویٰ کر کے اپنے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔“ پھر 3 جون 1921ء کو کلکٹر ڈھاکہ نے حسب ذیل نوٹس جاری کیا۔

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ بورڈ آف ریونیو بنگال کے پاس اس امر کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ بھووال کا منجھلا راج کمار 8 مئی 1901ء کو دارجلینگ میں مر گیا تھا اور اس کی لاش جلا کر رکھ کر دی گئی تھی۔ یہ سادھو جو خود کو منجھلا راج کمار ظاہر کرتا ہے محض ایک جعل ساز ہے۔ جو کوئی اس کو گناہ پا چندہ وے گا وہ اپنے اس فعل کا خود مددگار ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور نوٹس جاری کر دیا جس کی رو سے سب پور میں سنیا سی کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا اور وہ کئی سال سے پور نہ جاسکا۔ اس عرصہ میں وہ اپنی وادی ستہ بھاد اور بہن جیو دیوی کے ساتھ ڈھاکہ میں سکونت پذیر رہا۔

مگر حکومت بنگال اور ستہ بھاد راجہ کی مخالفت، عوام

کے جوش کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔ پختہ ہزاروں کی تعداد میں شائع کئے گئے۔ شاعروں نے سنیا سی کے متعلق کئی غزلیں کہیں۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر خوش الحان لڑکے یہ نظمیں اور گیت گا کر پختہ اور کتا ہیں بیچتے رہے۔ بھووال ایسوسی ایشن کے پرجوش کارکن دیہاتوں اور شہروں میں لیکچر دیتے پھرتے تھے۔ اس عرصہ میں سنیا سی نے کئی مرتبہ رانی بھادی سے ملاقات کرنے کی کوشش کی مگر کام رہا وہ سنیا سی کو اپنا شوہر ہی تسلیم نہ کرتی تھی۔ 22 جولائی 1922ء کو رانی ستہ بھاد نے ڈھاکہ سے اپنے پوتے کی بیوی رانی بھادی دیوی کو حسب ذیل خط لکھ کر بھیجا۔

”خوش نصیب بھادی دیوی!“

میرے بیٹے راجہ راجندر نارائن کا منجھلا پینا رامیندر نارائن زندہ ہے ایک برس سے زیادہ عرصہ ہوا کہ جو ایک سنیا سی کے روپ میں ڈھاکہ میں وارد ہوا تھا اور جس کو سب بھاد مرزا رحمن اور شرفا نے منجھلا راج کمار تسلیم کر لیا تھا۔ اسے میں نے اپنی آنکھوں سے نہایت غور سے دیکھا ہے میں نے اسے سب پور میں بھی دیکھا تھا اور اب کئی روز سے روزانہ ہی اسے کھ دیکھتی ہوں اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ میرا منجھلا پوتا رامیندر نارائن ہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے دیکھتے ہی پہچان لو گی جب سے وہ ڈھاکہ میں وارد ہوا ہے تم لوگوں میں سے کسی نے آ کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی ہے۔ لہذا میں تمہیں مشتاقانہ طور پر دعوت دیتی ہوں کہ آ کر خود حقیقت اپنی نظروں سے دیکھ لو۔ ضرور آ جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خاندان کی شہرت اور عزت کو دھرم اور انصاف کے مطابق بچاؤ!

رانی بھادی دیوی نے اس خط کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ 15 دسمبر 1922ء کو رانی ستہ بھاد کا انتقال ہو گیا۔ آخر کوشش کے طور پر دسمبر 1926ء میں سنیا سی نے بنگال کے بورڈ آف ریونیو کے سامنے اپنے حقوق کی بازیابی کی درخواست پیش کی مگر بورڈ نے اسے بھی مسترد کر دیا۔

پلا خر ہر طرف سے مایوس ہو کر 24 اپریل

1932ء کو سنیا سی نے ایک دیوانی دعویٰ ڈھاکہ کی عدالت میں جاگیر کے قبضے اور بازیابی کا دائرہ کر دیا۔ لہذا بارہا مدعا علیہ بذریعہ اس کے فریق بنائے گئے۔ سنیا سی کی طرف سے چودہ ہیر ستر اور دھکاؤ نے اور مدعا علیہ کی طرف سے وکیل سرکار رائے بھادو سسداکار کمار آشوتوش۔ رحمن دوسرے ہیر ستر اور وکٹوں نے مقدمہ کی پیروی کی۔ دراصل مقدمہ میں اصل مخالفت کرنے والا فریق رانی بھادی دیوی ہی تھی۔ رانی سرجوبالا دیوی نے نہ صرف سنیا سی کی کوئی مخالفت نہ کی بلکہ اس نے عدالت میں سنیا سی کو اپنا دیور رامیندر نارائن تسلیم کر کے اس کے وقت کی پوری پوری حمایت کی۔ باقی مدعا علیہ نے مدعا سے اس کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ سنیا سی نے عدالت میں بیان دیا۔

”میں بھووال کا منجھلا راج کمار رامیندر نارائن ہوں مدعا علیہ رانی بھادی دیوی میری دھرم بنتی ہے جو کل طور پر اپنے بھائی رائے بھادو ستہ بھاد راجہ کے زیر اثر ہے۔ 18 اپریل 1909ء کو میں اپنے سالہ رائے بھادو ستہ بھاد راجہ کی ترغیب پر سیاحت کے لئے سب پور سے دارجلینگ کے لئے روانہ ہوا۔ اس وقت سوائے آننگ کے مجھے کوئی دوسرا عارضہ نہ تھا۔ میرے ساتھ میری بنتی رانی بھادی دیوی ماس کا بھائی ستہ بھاد راجہ ڈاکٹر آشوتوش نامہ خاندانی ڈاکٹر اور میرے غلے کے لوگ تھے۔ 20 اپریل کو ہم سب ہاسٹس سائیڈ“ گوئی میں دارجلینگ میں تمام پذیر ہوئے۔ دارجلینگ پہنچنے کے چودہ پندرہ دن ہوا ایک رات مجھے پیٹ میں گرانی اور دم محسوس ہوا۔ اس میں نے اپنے ڈاکٹر آشوتوش سے اس کا ذکر کیا۔ میرے دن ایک یورٹین ڈاکٹر نے آ کر میرا معائنہ کیا۔ اس نے میرے لئے ایک نسخہ تجویز کیا تھا کہ میں دوا لیتا رہا مگر کچھ اتفاق نہ ہوا۔ اس رات آٹھ یا نو بجے ڈاکٹر آشوتوش نے ایک گھاس میں بیٹھ دوا پلائی۔ دو اگے جتنی میرے سینے میں جلن شروع ہو گئی اور تین بار منٹوں بعد میں سخت بے چینی محسوس کرنے لگا۔ مجھے تپ ہو گئی۔ تکلیف کی شدت سے میں چیخنے لگا

اور میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”آشوتوش تم نے مجھے کیا پلایا ہے؟“

8 مئی 1909ء کی صبح مجھے یکے بعد دیگرے کئی دست خون کے آنے اور شدید نفاہت مجھ پر غالب آ گئی اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اپنے آپ کو چار سنیا سیوں کے درمیان جنگل میں ایک جمبو پڑی میں پڑا ہوا پایا۔ ڈاکٹر آشوتوش نے مجھے جوہر دیا تھا وہ دماغ میں کچھ اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ ہوش ہونے پر مجھے یہ بھی یاد نہ تھا کہ میں کون ہوں۔ کہاں رہتا تھا میرے عزیز واقارب کون تھے۔ مختصر یہ کہ میں اپنی گزشتہ تمام زندگی کو قطعی فراموش کر چکا تھا۔ ہر چند اپنے دماغ پر کئی دفعہ زور ڈالا۔ مگر کچھ یاد نہ آیا۔ اس کے ساتھ مجھے دنیا اور اس کی کسی شے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ان سنیا سیوں کے ساتھ میں ملک ملک، شہر شہر اور دوا در دوا ہجیری لگا تا رہا۔ گھومتے پھرتے چار پانچ سال بعد ہم کشمیر کے مقام امرتا تھ جا پہنچے۔ وہاں بیچ کر دھرم داس نے مجھے اپنا چیلہ بنالیا اور اس کا نام میرے بازو پر داغ دیا گیا جواب تک موجود ہے۔ کشمیر سے گزر کر ہم تبت اور آخر کار نیپال جا پہنچے۔ ایک مقام نیپال میں ایک مقام جس کا نام ہرا ہو پوچھتے ہیں کہ جا کر مقیم ہوتے وہاں مجھے یاد آیا کہ میں کبھی ڈھاکہ میں رہتا تھا سوائے اس بات کے مجھے مزید کچھ یاد نہ آیا۔ میں نے اپنے گرد بایا دھرم داس سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے کہا۔

”اب تم جا سکتے ہو۔ تمہارا وقت آ گیا ہے۔ اپنے گھر واپس لوٹ جاؤ۔ اگر آئندہ کبھی تم ملایا پرتابو پاسکو اور سنیا سی لینا چاہو تو میں تمہیں ہر دور کے مقام پر ملوں گا۔“

یہ سن کر میں نے سنیا سیوں کو خیر باد کہا اور دھندلا ہوا سے روانہ ہوا۔ سفر کی صعوبتیں اٹھاتا اور کئی مقامات سے گزرتا ہوا آخر کار ایک روز آدھی رات کے قریب ڈھاکہ کے ریلوے اسٹیشن آ پہنچا۔ جوں ہی میں اسٹیشن پر اترا مجھے ہر چیز مانوس سی محسوس ہونے لگی۔ حالانکہ سنیا سی کے دوران ہم کبھی ڈھاکہ کی طرف نہیں گزرے تھے وہ رات میں نے اسٹیشن پر گزاردی۔ صبح صدر گھاٹ پہنچ کر دوا

ہے مگر لاش قابض تھی۔

سب لوگ خوف سے سسم گئے گو بارش تو بہت ہو چکی تھی مگر بجلی کی کوند اور بالوں کی گرج اب بھی جاری تھی کچھ دیر اور احمد دیکھا مگر لاش کا کوئی سراغ نہ ملا۔ مجبوراً اگر ہم لوٹ آئے۔

اور راج کمار کی پارٹی کے لوگوں کو خوف ہوا کہ بڑے راج کمار اور حکمران خاندان کو کیا جواب دیں گے۔ یہ تو بہت ہی بڑا پاپ اور بے عزتی تھی کہ ایک راج کمار کی لاش بغیر جلانے ہی لوگ اڑی کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے اس شرمناک اور پر خطر صورت حال سے غصے کے لئے سچیدر ناتھ نے یہ ڈرامہ کھلایا کہ دوسرے روز ایک فرضی اڑی تیار کر کے دن کے وقت شمشان میں جلائی گئی۔ اس اڑی کی لاش کی شکل وغیرہ کسی کو نہ دکھائی گئی تھی۔ اس لئے مقدمہ کے دوران یہ موقف اختیار کیا گیا کہ تھیلے راج کمار کی موت آدھی رات میں ہوئی تھی اور اس کی اڑی دوسرے دن صبح دس بجے جلائی گئی تھی۔

کافی تلاش کے بعد نیسیائی ورثن داس کا سراغ مل گیا۔ وہ ان چار منیسیائیوں میں سے ایک تھا جن کے ساتھ ڈھاکہ میں وارد ہونے والا نیسیائی برسوں رو کر ملک ملک پھر تار پاتا ورثن داس نے عدالت کے درمیان دیا۔

”میں اور ہم داس ناگا ایک ہی گروہ نام داس کے چیلے ہیں ہم دونوں دو منیسیائیوں کے ساتھ کھوٹے پھرے دار جیلنگ جا پہنچے تھے وہاں پہنچ کر حسب معمول دن تو بازار دن میں پھیری لگا کر گزار دیا کرتے اور رات ایک پہاڑی کی کھوہ میں گزارا کرتے تھے جو شمشان کے قریب شیب میں تھی۔ جب ہم دار جیلنگ میں تھے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

اس رات اپنی کھوہ میں بیٹھے ہوئے ہم چاروں ساہو مذہبی امور پر جانور خیال کر رہے تھے کہ ایک چہرہ رات گزرے آسان پر گھنگھور گھنگھار چھا گئی اور پھر بجلی بارش ہونے لگی۔ اس وقت ہم نے کھوہ کے باہر۔ ”ہری بول۔ ہری بول۔“ نکارنے کی آواز بھی سنیں۔ گرو نے مجھے کہا۔

”نیکو باہر جا کر دیکھو کیا بات ہے۔“ وہ مجھ میں عمر میں کافی بڑے تھے اور پیارے مجھے نیکو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ میں کھوہ سے باہر نکلا تو شمشان میں لوگوں کا مجمع نظر آیا۔ ان کے ساتھ ہی لائینیں تھیں۔

گرو نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”شمشان میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔“

اس پر گرو نے کہا۔ ”آگتا جاؤ وہاں تمہارا کیا کام؟“ میں کھوہ میں داخل ہو گیا۔ باہر ہوا کے جھکڑ بہت زوروں سے چل رہے تھے۔ ہم کیاں دھیان کرنے بیٹھ گئے۔

جب کافی وقت ہو گیا تو گرو کہنے لگے۔ ”باہر ایک مجمع ”ہری بول۔ ہری بول۔“ پکار رہا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ اب کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے تم میں سے ایک جا کر معلوم کرے کہ کیا اجڑا ہے؟“

میں ہی قبل میں باہر نکلا۔ دیکھا کہ ہوا کا طوفان کم ہو چکا ہے۔ مگر بارش ہو رہی تھی۔ مجھے شمشان سے ایک خفیف سی آواز سنائی دی۔ میں احمد دیکھنے لگا۔ آواز پھر سنائی دی۔ میں غور سے سننے لگا اس دھند پھر آواز سنائی دی۔ میں نے گرو سے کہا کہ شمشان سے کوئی آواز سنائی دے رہی ہے انہوں نے اعد سے پوچھا۔

”آواز کیسی؟“ میں نے جواب دیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ ہر مانی کر کے آپ بھی باہر آ جائیں۔ گرو باہر نکل آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے۔ ”آواز کدھر سے آ رہی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”شرق سے سنائی دے رہی تھی۔“ شرق میں ہی ہماری کھوہ سے کچھ بلندی پر شمشان تھا۔ انہوں نے کہا۔

”جلدی کرو لائین باہر لے آؤ۔“ میں لائین باہر لے آیا تو انہوں نے کہا۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔ ہم شمشان پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک کھاٹ پڑی ہے اس کی آواز کی آواز کا پتہ نہ تھا۔

گرو کہنے لگے۔ ”لائین اوپر کرو۔ میں کپڑا ہٹا کر دیکھتا ہوں۔“ میں نے لائین اوپر کر لی۔ گرو نے گرو کھول کر لاش کے منہ کے اوپر سے کپڑا نیچے پاؤں کی طرف سرکا دیا۔ لاش ایک جوان آدمی کی تھی گرو نے لاش کے منہ اور تھنوں پر ہاتھ رکھا اور چونک کر کہنے لگا۔

”نیکو! یہ آدمی تو ابھی زندہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اسے جلدی میں مردہ سمجھ کر یہاں اٹھا کر لائے ہیں۔ جاؤ اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی بلا لاؤ۔“ میں نیچے اتر کر کھوہ تک پہنچا اور دونوں ساتھیوں سے کہا جلدی چلو گرو جیسوں بلارہے ہیں وہ دونوں میرے ساتھ فوراً شمشان چلے آئے۔ تو گرو نے کہا۔

”یہ آدمی تو ابھی زندہ ہے مگر ہم اسے کہاں لے جائیں ہماری کھوہ میں تو اتنی گنجائش نہیں کہ اسے وہاں رکھ سکیں خیر ابھی تو اسے وہاں لے چلو۔“ ہم نے لاش کے اوپر کی چادریں اور کھٹات تو وہیں چھوڑ دیں۔ گرو بولے۔

”پھر کئی کرو۔ بارش تیز ہے۔“ ہم جب اس آدمی کو اٹھا کر چلے تو دیکھا کہ پہاڑ اور بارش کی سرودی کی وجہ سے اس کا جسم کچھ کانپ رہا تھا اور کبھی کبھی خفیف سی کراہنے کی آواز بھی نکل جاتی تھی۔ گرو کہنے لگے۔

”یہ آدمی سردی سے کانپ رہا ہے اس کے گلے کپڑے اتار دو۔“ ہم کھوہ کے اندر داخل ہو گئے اس شخص کے بدن پر ایک بنیان اور کچھ دوسرے کپڑے تھے ہم نے وہ سب اتار دیے اور اسے ایک کبل میں لپیٹ دیا۔ اس کے بعد گرو کہنے لگے۔

”اس پہاڑی کے نیچے جو گھر نظر آ رہا ہے اسے وہاں لے چلو۔ بارش ہو رہی ہے راتے میں یہ پھر گیا ہو جائے گا اس کے اوپر ایک اور کبل ڈال دو۔“ اس کے بعد ہم تینوں ساتھیوں نے اس شخص کو اٹھایا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ جب ہم اس

کو پار کیا اور بک لینڈ بند پر پہنچ کر میں آسن جہاں کھٹہ گیا لوگ بند پر سے گزر رہے تھے۔ چند شکلیں مانوس معلوم ہونے لگیں اور چند کے نام بھی یاد آ گئے لیکن اب بھی یہ یاد نہ آیا کہ میں ایک راجہ کا بیٹا ہوں۔ اسی طرح میں بند پر چار بیٹے تک بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ لوگ مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ تو محمودال کا بیٹھلا راج کمار معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح میری یادداشت خود کراچی کے میں ہی بھٹلا راج کمار ہوں۔ پھر قاسم پور کا زمیندار اٹے پر شاد بند پر پہنچا۔ وہ مجھ سے بخوبی واقف تھا وہ مجھے قاسم پور لے گیا۔ جہاں میں نے چار پانچ دن گزارے اس کے بعد اٹے پر شاد نے مجھے ایک ہاتھی پر سوار کر کے سب پور پہنچا دیا اور میں مذہب باڑی کے متصل میدان میں ایک درخت کے نیچے آسن جہاں بیٹھ گیا۔ جہاں آہستہ آہستہ مجھے اپنی راجہ باڑی گھر، دروازہ اور عزیز واقارب بھی یاد آ گئے۔

عدالت کے روبرو کئی ایسے معزز اور قابل اعتماد گواہان نے بیان دیے جو مئی 1909ء میں تھیلے راج کمار کی معروضہ موت کے وقت دار جیلنگ میں سکونت رکھتے تھے ان کے بیان کے مطابق جب انہیں اطلاع ملی کہ محمودال کے راج کمار کی موت واقع ہو گئی ہے تو اڑی کے جلوس میں شریک ہونے کے لئے ”اسٹیٹ سائیڈ“ پہنچے رات نو بجے اڑی کا جلوس روانہ ہوا۔ جلوس میں راج کمار کی پارٹی کے لوگوں کے علاوہ کوئی شخص دوسرے آدمی بھی تھے ان میں بابو پندی موہن نیوگی جھڑیت اور کئی دوسرے معزز زمین بھی تھے۔

شمشان کوئی سے کوئی دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک گھنٹہ میں اڑی کا جلوس شمشان پہنچ گیا۔ ابھی اڑی کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھی ہی تھی کہ بارش اور ہوا کے شدید طوفان نے آن کھیرا۔ بجلی کی بے پناہ چمک اور بالوں کی گرج سے لوگوں کے دل دہلنے لگے۔ سب لوگ اڑی کو وہیں چھوڑ کر پناہ لینے کی غرض سے پہاڑی پگڈنڈی پر چڑھ کر اڑی کی موڑ کاٹ کر کچھ دور ایک غنچ خانہ میں چلے گئے ایک گھنٹہ بعد جب یہ طوفان تھما تو لوگ واپس لوٹے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کھاٹ تو رکھی ہوئی

گھر کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ گرو کہنے لگے۔

”مولادھار بارش میں ہم چائی کہاں سے لائیں۔ چٹے سے تالا توڑ دو۔ چٹے سے تالا توڑوٹ سکا البتہ ابھی سے کنڈے کی زنجیر مرد دروازہ کھول لیا گیا۔ ہم اس آدمی کو اٹھائے کرے میں داخل ہو گئے۔ اندر دیوار کے سہارے ایک دو چار پائی رکھی تھی۔ اس پر اسے لٹا دیا۔ رات ہم نے اس کمرے میں گزاری صبح مکان کا مالک آیا تو اس نے جو ہم چار سادھوؤں اور اس آدمی کو دیکھا تو پوچھا۔

”کیا ہاڑ ہے؟“

ہم نے جواب دیا۔ ”ہمارا ساسی بیمار ہو گیا ہے برسات کی وجہ سے ہم نے تمہارے گھر میں پناہ لے لی ہے۔“ اس شخص کا نام گرجا بھون تھا اس نے ہمیں ایک کبل اور مہیا کر دیا اور کہیں سے ایک حکیم سے کچھ یونانی دوائیں لا کر دیں۔ شیشان سے لایا ہوا آدمی ابھی بے ہوش تھا۔ کچھ دیر اور گھر کے باہر لوگ جمع ہونے لگے ہم اس شخص کو اٹھا کر پہاڑی کے شیب میں اترتے چلے گئے یہاں تک کہ گھنٹیاں جنگل میں جا پکے۔ وہاں ہمیں ایک غیر آجھو پیڑی نظر آئی اور ہم اس میں ٹھہر گئے۔ تین دن بعد اس شخص کو ہوش آ گیا مگر وہ بالکل بخوب الحواس اور نیم پاگل انسان کی طرح حرکتیں کر رہا تھا۔ جھوپڑی میں ہم نے چھوہ دن قیام کیا۔ اس عرصہ میں اس شخص کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اس نے ہماری محبت اختیار کر لی۔ مگر اپنے بارے میں اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کون تھا اور اس پر کیا زہری تھی؟ اس کے بعد ہم پانچوں بستی بستی اور ملک ملک گھومتے رہے۔ خیال پہنچ کر وہ شخص ہم سے جدا ہو کر چلا گیا۔ اور آج جس شخص کو میں عدالت میں دیکھ رہا ہوں یہ وہی آدمی ہے جسے ہم وارجلیک کے شیشان سے اٹھا کر اپنی کھوہ میں لے گئے تھے۔“

گرجا بھون رائے جس کے گھر میں سنیاسیوں نے رات گزاری تھی جنگلات کا ایک بڑا ٹھیکیدار تھا وہ اور اس کے بہت سے بڑی عدالت میں حاضر ہوئے

اور سب نے بیان دیا کہ جو کچھ درشن واس نے بھون رائے کے گھر میں ایک بیمار آدمی کے ساتھ قیام کرنے کے بارے میں کہا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔

اس حرم المثل مقدمہ میں ایک ہزار اور ستر گواہوں جن میں پچھلے راج کمار کی تینوں بہنوں نے اور اس کی بڑی بھانج رانی سرجوبالا اور کئی قریبی رشتہ داروں نے اور خود مدعا علیہ رانی بھوانی کی مہمانی سرجوینی دیوی جس کے ہاں اس نے پرورش پائی تھی اور اس کی ماموں زاد بہن نے اور سینکڑوں منزور گواہوں نے عدالت میں سنیاسی کے حق میں بیان دیا کہ وہ مجھلا راج کمار رامیندر رائے ہے۔

مدعا علیہ کی جانب سے چار سو اسی گواہوں نے بیانات دیے۔ گمران میں سوائے رانی بھوانی دیوی کے بھائی سیتھدر ناتھ کے حکمران خاندان کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ خود سنیاسی کا بیان کئی دن جاری رہا۔ اس نے اپنی تمام سرگزشت تفصیل وار بتائی۔ ثبوت کے طور پر اس نے راجپاڑی کے زمانہ کربوں کی اندرونی تفصیل اپنے بچپن کے واقعات اور خود رانی بھوانی کے جسم پر تین شاکھی نطامات کی نشان دہی کی۔ ان نشانہ میں سے ایک نشان کا سوائے رانی بھوانی کے شوہر کے کسی کو علم نہ ہو سکتا تھا۔ مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے ہزاروں لوگ ڈھا کہ کی عدالت اور اس کے باہر جمع ہوتے رہے۔

24 اگست 1936ء کو سٹریٹ لال پوس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ڈھا کہ نے اس تاریخی مقدمہ کا فیصلہ سنایا، ہزاروں کی تعداد میں لوگ دور در دور کے علاقوں سے آ کر عدالت کے باہر جمع ہو گئے تھے۔ دنیا کے کئی ملکوں کے اخباروں کے نامہ نگار اس موقع پر خاص طور پر آئے تھے۔ فیصلے کی رو سے سنیاسی کو بھووال کا مجھلا راج کمار رامیندر رائے قرار دے دیا گیا اور اس کے تمام حقوق بحال کر دیے گئے اور یوں ایک تارک الدین سنیاسی پھر سے راج کمار بن کر کاروبار دنیا میں مصروف ہو گیا۔



قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

میری فرستیں جو نصیب ہوں، چلے آنا میرے پاس تم ہیں اچھوڑے کتنے معاملے میری ذات سے تیری ذات تک (ملیق خان۔۔۔ پشاور)

اے دبیر تیری رخ بستی میں کیوں طلب اس کی محمد نہیں ہوتی (ساجد راجہ۔۔۔ سرگودھا)

میرے مرنے کے بعد میری ایک کہانی لکھتا کیسے برباد ہوئی میری جوانی لکھتا یہ بھی لکھتا کہ کس طرح میرے ہونٹ خوشی کو ترسے کیسے بہتا رہا میری آنکھ سے پانی لکھتا (قاریہ نسیم۔۔۔ ٹھیک موڑ)

میں نے اپنی فحاش زندقہ غلوں کے نام کر دی اپنے دل کی ہر اک آرزو ناکام کر دی یہ بھی نہ سوچا کیسے گزرے گا تیرے بن اک اک پل بس بنا سوچے ہی یہ اک خوشی تیرے نام کر دی (عبدالمحکم۔۔۔ گوجرانوالہ)

اس سے بچھڑے ہیں تو جاتے ہیں دنیا کی حقیقت ہر سانس یہاں آت ہے، ہر گھڑی مصیبت کون کہتا ہے کہ بچھڑنے سے آتی ہے یادوں میں کمی مارے دل کو تو اس سے ہے پھر دنیا عقیدت (اقصی رباب۔۔۔ فیصل آباد)

یوں تو ہیں بے شمار دقا کی نشانیاں لیکن ہر اک شے سے زلے تمہارے خط جیسے ہو عمر بھر کا اثاثہ غریب کا کچھ اس طرح سے میں نے سنبھالے تمہارے خط (شبانہ نسیم۔۔۔ لاہور)

جس طرف نظر کروں اسی کا پر تو ہے میرے دھیان کے سب راستوں میں رہتا ہے

پھن کر اس سے پریشان بہت ہوں میں بھی سنا ہے وہ بھی بڑی اکھنوں میں رہتا ہے (فائزہ احمد۔۔۔ کراچی)

وہ میرا ہے اس کا نام کوئی اور نہ لے ان بیگنی آنکھوں کا جام کوئی اور نہ لے کچھ اس لئے بھی میں نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا وہ مگر گیا تو اسے تمام کوئی اور نہ لے (شرف الدین جیلانی۔۔۔ ٹنڈوالیار)

نگال دے دل سے خیال اس کا یادیں کسی کی تقدیر کو بدلا نہیں کرتیں (انتخاب: محسن عزیز حلیم۔۔۔ کوشہ کلاں)

جتنی شدت سے مجھے غم دیئے ہیں اس نے اتنی شدت سے تو میں نے اسے چاہا بھی نہیں (انتخاب: حمزہ دراز۔۔۔ کھنڈیاں خاص)

اس شخص سے میرا اتنا تعلق ہے وہ اگر پریشان ہو تو مجھے نیند نہیں آتی (انتخاب: محمد اسحاق انجم۔۔۔ کلکتہ پور)

عجیب تماشا گر ہیں یہ مٹی کے پتلے بھی بے وفائی کرو تو روتے ہیں اگر وفا کرو تو لاویتے ہیں (انتخاب: نعمان شاہ۔۔۔ الد آباد)

پھر اتنے مایوس کیوں ہو اس کی بے وفائی پر تم خود ہی تو کہتے تھے کہ وہ سب سے جدا ہے تا (انتخاب: حسنین اقبال۔۔۔ کھنڈیاں خاص)

بھولی ہوئی صدا ہوں مجھے یاد کیجئے تم سے کہیں ملا ہوں مجھے یاد کیجئے منزل نہیں ہوں خضر نہیں راہزن نہیں منزل کا راستہ ہوں مجھے یاد کیجئے (پروفیسر راجدگنی۔۔۔ کراچی)

ہوا تھمی تھی، موسم تھا ہرکا میرے دل میں تیرا خیال تھا ہرکا کچھ ایسے پراسرار سا موسم تھا کچھ تیرے قربت کو تھا میں ہرکا (عثمان غنی۔۔۔ پشاور)

☆☆



اپنے ہونٹوں پر وہ حرف راز آیا بھی نہیں لاکھ چاہا دل نے لیکن کچھ بتایا بھی نہیں جو شب بھراں کے ہر غم کی طغیانی کر سکے والے محرومی قسمت دن وہ آیا بھی نہیں ان کا آنا غیر ممکن ہو گیا جس روز سے دل کے دیرانے کو دوبارہ بسایا بھی نہیں آنے والوں کو بھلا کیوں میرے گھر تکلیف ہو اس قدر چھوٹا تو دروازہ لگایا بھی نہیں اس کی جھولی میں گریں گے کیا دعاؤں کے کنول جو مصیبت میں کسی کے کام آیا بھی نہیں لوگ کترا کے گزر جاتے ہیں کہیں جانے کس لئے آج تک ہم نے کسی کا دل دکھایا بھی نہیں آج بھی لوگوں سے کرتے ہیں محبت ٹوٹ کر ہم نے خاطر اپنا یہ مسلک چھپایا بھی نہیں (رانا حنیف عاطر.....جمدو)

جو خواب مسلسل سے رہائی نہیں دیتا وہ چہرہ کہیں پر بھی دکھائی نہیں دیتا مجھ کو تو تری چپ کا بھی مقبوم ہے معلوم تو ہے کہ تجھے شور سنائی نہیں دیتا اتنی ہے فراغت کہ فراغت ہی نہیں ہے جو کام ہے کرنا وہ بھائی نہیں دیتا جو آگ کے دریاؤں میں ہنستا ہوا اترے وہ جرم محبت کی صفائی نہیں دیتا حسرت ہے تجھے تو مرے آنسو کہیں دیکھے میں ہوں کہ عذابوں کی دہائی نہیں دیتا دشوار زمینوں کے سفر اتنے کئے ہیں اب وشت مجھے آبلہ پائی نہیں دیتا امتیاز جو رہے اپنے گریباں سے الجھتا وہ ہاتھ کسی کو کبھی کھائی نہیں دیتا (ایک امتیاز احمد.....کراچی)

صحرا میں کھڑا باد نسا مانگ رہا ہوں ناداں ہوں میں محبت کا صلہ مانگ رہا ہوں دل میں ہے گناہوں کی ککھ آکھ میں آنسو سجھے میں پڑا فضل خدا مانگ رہا ہوں دشمن کو میں اپنے نہیں بھولا ہوں پس مرگ قاتل سے میں خون بہا مانگ رہا ہوں صحرائے غم بھر ہے فرقت کی کڑی دھوپ محبوب کے دامن کی ہوا مانگ رہا ہوں جس دور میں عربانی کوئی عیب نہیں ہے اس دور میں آنکھوں کی حیا مانگ رہا ہوں جس شخص کے ہاتھوں سے واجد ذم لے ہیں کیوں اس سے میں زخموں کی دوا مانگ رہا ہوں (پروفیسر ڈاکٹر واجد یگونی.....کراچی)

اپنے چہرے کو کوئی گر آئیے میں دیکھا کون مانتے کی سطر پھر زائچے میں دیکھا آپ گر تفسیر خال و خد کی بتلاتے اسے یہ وہ عبارت چھوڑ کر کیوں حاشیے میں دیکھا دونوں عالم کی حقیقت کا وہیں کھلا بھرم خود کو اپنی ذات کے گر آئیے میں دیکھا کہ ہمیں آزاد کر دیتا تو یارب فکر سے کون روز و شب کے پھر دائرے میں دیکھا وہ جو اک دنیا بنا بیٹھا تھا اپنی ذات میں سمجھ کر پکارا اس کو زوایے میں دیکھا (چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

تجھے بھولا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکتے اپنی آنکھوں کے آنسو ہر روز چھپا نہیں سکتے دل میں بسی ہے اک پیاری سی تصویر تیری وہ تصویر ہم لوگوں کو دکھا نہیں سکتے پیار تو ہم صرف اور صرف تم سے کرتے ہیں لوگوں کے سامنے وہ پیار ہم جتنا نہیں سکتے ہم جانتے ہیں تمہیں ہماری جدائی کا کوئی رنج نہیں تمہیں تو اپنے دل کی بات بھی ہم بتا نہیں سکتے

تم نے کیا تھا وعدہ کہ تمہیں بھول جائیں ہم انہوں کہ وہ وعدہ ہم بھلا بھی نہیں سکتے (سجاد احمد سلم.....گوجرانوالہ)

رہنکے میری آنکھوں کا مقدر ظہیرے خلک پلکوں پہ آکر سمندر ظہیرے پوچھا رہا جس بت کو دل میں بٹھا کر میرا قاتل اب دیا، میرا دلدار ظہیرے دے زندگی، یا موت مقدر کردے ہم ہر حال میں ظالم ترے پرستار ظہیرے جگر خون ہو تب جا کر اک شمع بنے پھر دی تو زمانے میں سدا شاہکار ظہیرے ازل سے چلا آیا ہے دستور یہی جہاں کا یہاں جو بھی بچ بولے دی سنگار ظہیرے (انسارہ نوشین.....فیصل آباد)

آنکھوں سے میری اس لئے لانی نہیں جاتی یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی تو جان بھی مانگے تو بن مانگے دے دوں اس لئے تیری جو کوئی بات بھی ٹائی نہیں جاتی اب عمر نہ موسم نہ وہ دستے کہ وہ چلے اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی معلوم ہمیں بھی ہے بہت سے تیرے قصے ہر بات تیری ہم سے اچھائی نہیں جاتی براہ تیرے پھول کھلاتی تھی جو دل میں لب شام وہی درد سے خالی نہیں جاتی ہم جان سے جاکینگے تجھی بات بنے گی تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی (انتخاب.....بلقیس خان-پشاور)

پھول اور خوشبو، چاند، ستارے، سارے ساتھی تیرے تھے ننھلیاں، جگنو، کلیاں، بھنورے، سارے ساتھی تیرے تھے کھادے کون لگاتا میری بھنور میں ذلی کشتی کو خود سمندر، ساری لہریں دھارے ساتھی تیرے تھے

کچھ میرے اپنے کچھ بیگانے اور خود میرا دل میری جان کے دشمن جاناں، سارے ساتھی تیرے تھے محبت کی اس بازی میں، میں نے پار ہی جانا تھا اجماعت "خود محبت اور مقدر" سارے ساتھی تیرے تھے میں اپنی فریاد لے کر جاتی تو کس کے پاس کنول حاکم "قاتل" اور معصف، سارے ساتھی تیرے تھے (مس فوزیہ کنول.....منڈلی نکلن پور)

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن سجاؤں گی سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں اپنے گھر کے اندھیروں میں لوٹ آؤں گی بدن کے کرب کو وہ بھی نہ سمجھ سکے گا میں دل میں روؤں گی آنکھوں میں مسکراؤں گی وہ کیا گیا رفاقتوں کے سارے لطف گئے میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی جواز دھوٹ رہا تھا وہ نئی محبت کا وہ کہہ رہا تھا میں اسے بھول جاؤں گی (ساجدہ راجہ.....ہندواں سرگودھا)

بھیکے ہوئے موسم میں تیری یاد بھی ستائے کس کے جوڑے میں پھول کون سجایا کرے قاصطے بہت ہیں تیرے میرے درمیاں میں یہ دریاں دل سے پھر منایا کون کرے بند ہیں میرے لئے وفا کی ساری راہیں دیران راہوں میں چراغ جلایا کون کرے غلامت ہوئی ہے تیری بے وفائی پہ ہمیں بیگانوں سے پھر ہاتھ ملایا کون کرے دل کو غم رہے گا تیری کم نگاہی کا جاوید گزری ہوئی قسمت سے پھر سمجھو کون کرے (محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

تو میری روح کے اندر ہے کئی صدیوں سے جیسا میرا جسم تو گھماں ہے کئی صدیوں سے

میں کہ ایسا تو نہیں تم کو بھول جاؤں گا
تو میرے ذہن پہ نقش پارہے کئی صدیوں سے
تو میرے رگ و جال میں سیایا ہوا ہے
تو میرے ذات کا قیدی ہے کئی صدیوں سے
میں تیرے جسم کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہوں
تیری خوشبو میرے اندر ہے کئی صدیوں سے
میں تیرے پیار کو پاکر ہی جیت جاؤں گا
ورنہ یہ ہار مقدر ہے کئی صدیوں سے
(عطار غنی..... پشاور)

اے ساقی بن فریاد میری
کبھی دنیا تھی آباد میری
میں پریم مگر کا باسی تھا
اور پیار کا اتنا عادی تھا
سانس بھی پیار سے چلتی تھی
ڈھکن بھی گیت سناتی تھی
نہ کھانا پینا عشق سدا
نہ چلنا پھرنا عشق سدا
جب اپنوں نے دل توڑا ہے
اپنا کہ ہم کو چھوڑا ہے
کیا کسی سے ہم فریاد کریں
دن رات اسے ہی یاد کریں
اب ایسا اپنا ہال ہوا ہے
کہ جینا بھی دشوار ہوا ہے
اے ساقی بن فریاد میری
کبھی دنیا تھی آباد میری
(ایم ارشد..... جھڑو)

لمس کے ہما بھڑبھڑاتی تیرے مای کو سارا کرتے ہی تھے
وہ ہوتی بن کر جذباتی شعروں کا کبڑا کرتے تھے
ہم سا ہر دور کے عاشق ہیں سوئیٹ پڑوئیں مارتے ہیں
وہ دن گئے جب راتجے میاں بھینوں کا بازار کرتے تھے
یہ بزرگ جو بن کر بیٹھے ہیں اور ہم پر دمب بھاتے ہیں
کوئی پوچھتا ہے دقتوں میں جن کیسے، چارھا کرتے تھے
ہائے کیسے چالیں یہ چلتے تھے عشق پرانے....
پیٹا مرسائی کو اگر بچوں کو بگاڑا کرتے تھے
بچپن اور بارش کا پانی، پانی میں جہاز چلانے کو
اک دو بجے کی کالی سے چمپ کر دوتے چھاڑا کرتے تھے
جانے کیوں ہمارے ہم سے نالاں رہتے تھے
آتے جاتے اکھوں سے وہ خوب لڑا کرتے تھے
مشرک میں ہر بار علی ہم چند ہر دس سے رہ جاتے تھے
فادر ہمارے جوتوں سے پھر کپڑے جھاڑا کرتے تھے
(محمد علی چغتائی..... خیر پور تائیوالی)

حادثہ یہ ہوا میری زندگی میں
وہ تنہا چھوڑ گیا مجھے میری زندگی
آج غموں کا ڈیرا ہے اس لئے
کبھی خوشیاں تھیں میری زندگی میں
سارے غم اپنے دے گیا وہ مجھے
دو پل کی خوشیاں بھی نہ چھوڑیں میری زندگی میں
یوں تو پیار کم نہ تھا میرا اس کے لئے
پھر کیوں وہ آنسو چھوڑ گیا میری زندگی میں
☆☆

تجہائی کے لئے سارے
میری یاد سے مجھے سارے
انہانے سے نکلتے ہیں کیوں
دیکھتے بھالے چہرے سارے
خوشیوں کے سب رنگ تمہارے
خواب دکھوں کے میرے سارے
کون کسی کا اس دنیا میں
انسانے دودھیلے سارے
اڑ گئے دھوپ میں نکل بن کر
رانا میرے سنے سارے
(قدیر رانا..... راولپنڈی)

دقت کی بے رخی سے ڈرتا ہے
ہر کوئی دوستی سے ڈرتا ہے
ہو گیا ہوں امیر فرقت کا
دل مرا روشنی سے ڈرتا ہے
موت سستی ہے شہر میں میرے
آدی آدی سے ڈرتا ہے
دن اذیت کے بھی گزرے ہیں
دل مرا غفلتی سے ڈرتا ہے
روز مرے میں بھوک سے کتنے
کون اب خودکشی سے ڈرتا ہے
ایسے کتنے ہیں دکھ مجھے ایسے
جیسے کوئی خوشی سے ڈرتا ہے
کون کبھے خلاف جرم، حکیم
دل ہرا شاعری سے ڈرتا ہے
(حکیم خان حکیم..... ایک)

میں تمہارے درقوں میں بکھرا ہوں
کبھی کتناہیں کھولنا تو یاد کرنا
میں قطرہ قطرہ برسات میں برسوں کا
کبھی بارش میں بیٹھتے تو یاد کرنا
میرا سانس تیری یادوں میں
کبھی سانس اکھڑے تو یاد کرنا
میں لمحہ لمحہ تجھے یاد کرتا ہوں دوست
کبھی خود کو خود سے غفا پاؤ تو یاد کرنا
تم میری ہر دعا میں شامل ہو دوست
کبھی تم بھی ہاتھ اٹھاؤ تو یاد کرنا
(ایم عبداللہ..... ایک)

بھائی کے لئے سارے
میری یاد سے مجھے سارے
انہانے سے نکلتے ہیں کیوں
دیکھتے بھالے چہرے سارے
خوشیوں کے سب رنگ تمہارے
خواب دکھوں کے میرے سارے
کون کسی کا اس دنیا میں
انسانے دودھیلے سارے
اڑ گئے دھوپ میں نکل بن کر
رانا میرے سنے سارے
(قدیر رانا..... راولپنڈی)

خونی سفر

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

شبنوں برف کے نیچے مردہ لاش بے گور و کفن پڑی تھی، زندگی سے اس کا ناطہ ٹوٹ چکا تھا، اس کے نزدیک ہی ایک تھیلی میں ایک انگوٹھی پڑی تھی، ایک نوجوان نے وہ انگوٹھی اس لاش کی انگلی میں پھنادی، انگوٹھی کا انگلی میں جانا تھا کہ.....

سوچ کی وادی میں مجھے پرواز دل و دماغ کو فرحت بخشی دل غریب اور تیرا گلیز کہانی

سانے آئیں۔ وہ ایک مارشلس فیکٹری میں منجری پوسٹ پر تھا۔ فیکٹری سے شام چھ بجے چمکی ہوتے ہی کلب چلا جاتا۔ جہاں وہ علاقے کے نوجوانوں کو مارشل آرٹ کی تربیت دیتا تھا۔ وہاں سے رات دس بجے گھر پہنچتا۔ اس کے علاوہ اس کا مشغلہ موہاں فون پر لڑکیوں سے کپ شپ بھی کرنا تھا۔ وہ اگلے سیدھے منبر خانی کرنا اگر کوئی مرد کال اینڈ کرنا تو رات گیارہ بجے نہ صرف کر لیتا۔ اور اگر کال اینڈ کرنے والی کوئی لڑکی ہوتی تو کپ شپ لگاتا۔ اس کی باتیں اس قدر دل نشین اور دلچسپ ہوتیں کہ اکثر لڑکیاں متاثر ہو کر اس سے دوستی کر لیتیں۔ اس کی یہ دوستی صرف موہاں فون کی حد تک رہتی۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔

لیکن اس کا یہ سلسلہ بھی رک گیا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ ایک روز گھر سے فیکٹری جاتے وقت سگنل کی بتی سرخ ہونے پر اس نے موٹر سائیکل روک دی، اچانک اس کی نظر قریب کھڑی کار پر پڑی، کار کی پچھلی نشست پر موجود لڑکی کو دیکھ کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ لڑکی کیا تھی۔ ”حسن و جمال کا شاہکار“ تھی۔ ٹریفک سگنل کی بتی گرین ہوتے ہی اس نے موٹر سائیکل کار کے تعاقب میں دوڑادی اس کا یہ تعاقب شہر کے ایک مشہور کالج تک

سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے تیری ہنسنے سو بارہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور لباس شگن آلود تھا۔ رات نصف سے زائد بیت چکی تھی۔ آج اس کی زندگی کی آخری رات تھی، ہائی کورٹ سپریم کورٹ کے بعد صدر مملکت کی طرف سے بھی اس کی رحم کی اپیل مسترد ہو چکی تھی۔ ہر گزرنے والا بل اس کی زندگی کی گھڑیاں کم کرتا جا رہا تھا۔ ساحل نای وہ نوجوان موت کے خوف سے بے چین نہیں تھا۔ وہ ایک بہادر انسان تھا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھے والا، اصل میں اس کی بے چینی کا سبب اس کے بوڑھے والدین، اس کا بڑا بھائی اعجاز تھا۔ بہن بڑبہ جو اس سے عمر میں پانچ سال بڑی تھی، مشاوری شدہ اور دو بچوں کی ماں تھی۔ سب کی امیدوں کا وہ واحد سہارا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی محبت شاز بیگی۔

اس کی موت کے بعد ان پر کیا گزرے گی۔ اس کا جرم محبت تھا جس کی سزا اکثر موت ہی ہوتی ہے، شیریں خرابادی کی مجبوں، سکی پنڈوں، ہیرا رانجا اور دوسرے بہت سے عاشق اس کی واضح مثال ہیں۔ ٹہلنے ٹہلنے تک کردہ ایک طرف گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ ماضی کی پرچھائیاں اس کی نگاہوں کے

جاری رہا۔ اس کا بیٹا میں امراء اور صاحب حیثیت لوگوں کی اولادیں زیر تعلیم تھیں۔

اس کے بعد اس کا یہ معمول بن گیا۔ روزانہ اس لڑکی کی کار کا چھڑا کرتا۔ جب تک وہ لڑکی کا بیٹا داخل نہ ہوتی وہ وہیں موجود رہتا۔ اس کی یہ بے قراری اس لڑکی سے چھپی نہ رہی، وہ مسلسل کئی روز سے اس کو اپنے گرد پروانے کی طرح چکر لگاتے دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام شازیہ تھا۔ اس کے والد سیٹھ واجد ایک بہت بڑے بلڈر تھے۔ ملک بھر میں ان کے کئی پروڈیکٹس چل رہے تھے۔ شازیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ شازیہ کی والدہ ذکیہ بیگم انتقال کر چکی تھیں۔ بیوی کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی سیٹھ واجد نے ایک مشہور کمرشل ماڈل ماریہ سے شادی کر لی تھی جو ان پر نہیں ان کی دولت پر فدا ہو گئی تھی۔

ایک روز وہ حسب معمول شازیہ کا پیچھا کرتا ہوا کالج پہنچا۔ ڈائریور شازیہ کو کالج کے گیٹ پر اتار کر واپس لوٹا، تو وہ ساحل کی طرف بڑھی۔ ساحل اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر گھبرا گیا، شازیہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ وہ بوکھلا گیا۔“

”آپ اتنے روز سے مسلسل میرا پیچھا کر رہے ہیں اب جبکہ میں آپ کے سامنے ہوں تو آپ کے چہرے پر ہنس کیوں آ رہا ہے؟“ وہ مسکرائی تو ساحل کو ایسا لگا جیسے پوری کائنات مسکرائی ہوئی۔ شازیہ کی مسکراہٹ سے اسے حوصلہ ملا۔

”اس روز آپ کو گاڑی میں دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری تلاش ختم ہو گئی ہو۔ میں روزانہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کی ایک جھلک دیکھنے یہاں آتا ہوں۔ سر راہ آپ کو مخاطب کرنے کی ہمت اس لئے نہیں کی کہ آپ برآمدہ مان جائیں۔“

”آپ نے اتنا سب کچھ تو کہہ دیا، پر اپنا نام نہیں بتایا، جلیس سب سے پہلے میں اپنا تعارف کرا دیتی ہوں، میرا نام شازیہ ہے اور میں تحفہ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔“

”میرا نام ساحل ہے اور میں، اے ایم گارنشن فیکٹری میں جاب کرتا ہوں۔“

”ساحل صاحب آنے جانے والے عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں ایسا کرتے ہیں پھر ملیں گے، آپ میرا سوا بٹل نمبر لوٹ کر لیں۔“ شازیہ نے اپنا نمبر لوٹ کر دیا اور کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ ان کی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ شازیہ نے ساحل کے کہنے پر اپنے گھر پر اس کا ذکر کیا۔ لیکن جس طرح ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، دو بیچارے والوں کے بیچ سراج دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شازیہ پر سختی کی انتہا کر دی گئی۔ سوتیلی ماں نے جو اس سے کچھ سال ہی بڑی تھی سیٹھ واجد کو کہہ کر اسے کالج جانے سے روک دیا۔

اس روز وہ اپنی سیکلی کے گھر جانے کے بہانے گھر سے نکلی، ساحل کو فون کر کے ایک پارک میں بلایا، وہ دونوں وہاں سے ساحل کی بہن کے گھر پہنچے۔ صورتحال سے آگاہ ہوتے ہی زبیدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں تھی صورتحال کی نزاکت کو سمجھتی تھی۔ اس نے ان دونوں کو سمجھانا چاہا مگر وہ نہیں مانے اور اسی روز کورٹ میرج کرنی۔ کورٹ سے وہ دوبارہ زبیدہ کے گھر پہنچے، شازیہ نے فون پر اپنے والد کو بتایا کہ اس نے ساحل سے کورٹ میرج کر لی ہے، پہلے تو انہوں نے اسے بے نقطہ سنائیں پھر بولے۔

”میری ساحل سے بات کراؤ۔“

”السلام علیکم انکل!“ ساحل نے شازیہ کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کہا۔

”دیکھو ساحل بیٹا تم میرے آفس آ جاؤ، مل جینے کر اس مسئلے کا حل نکالتے ہیں۔“ دوسری طرف سے سیٹھ واجد نے کہا تو اس نے اچھا جی کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور اسی وقت موٹر سائیکل پر ان کے آفس جا پہنچا۔

”بیٹا اگرچہ تم دونوں نے غلط قدم اٹھایا ہے لیکن اب جو ہونا تھا ہو چکا، بہتر یہی ہے کہ تم شازیہ کو میرے گھر بھیج دو، اپنے گھر والوں کو رشتہ طے کرنے کے لئے میرے گھر بھجواؤ اور رخصتی کروا کر شازیہ کو لے جاؤ تاکہ معاشرے کے سامنے ہماری عزت رہ جائے۔ بیٹا تم اتنا تو جانتے ہو کہ کسی بیٹی اس طرح گھر سے چلی جائے تو

معاشرے اسے عزت سے جینے نہیں دیتا۔“ واجد صاحب کو کھیر لیجے میں بولے۔

”ٹھیک ہے انکل! میں چند گھنٹوں بعد شازیہ کو آپ کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔“ وہ بولا اور اپنی بہن کے نہ بیچ کر شازیہ کو اس ملاقات کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ”وہ تیار ہو جائے تاکہ وہ اس سے والد کے گھر پہنچا دے۔“ اسی دوران کھانا تیار ہو چکا تھا، کھانا کھاتے اور شازیہ کے تیار ہوتے ہوتے میں کھٹے گزر گئے۔

اچانک گھر کا دروازہ زور سے دھڑکایا گیا۔ ”کون ہے؟“ زبیدہ دروازے کی طرف لگی۔ جیسے ہی دروازہ کھولا نصف درجن پولیس اہلکار گھر میں گھس گئے۔ ”ساحل کہاں ہے؟“ انپکڑنے پر پوچھا۔

”میں ساحل ہوں، کیا ہوا افسر؟“ ساحل شور و فک کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

”مسٹر ساحل سیٹھ واجد کا کچھ گھنٹے قبل قتل ہو چکا ہے۔ ان کے پرسل سیکریٹری آفاق نے آپ پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنی موت سے قبل سیٹھ واجد نے آخری ملاقات آپ سے کی تھی۔ آپ کے رہائے سے نکلنے کے کچھ دیر بعد جب وہ کسی کام سے ان کے آفس میں داخل ہوئے تو ان کی خون آلود لاش ملی۔ آفاق صاحب اور مقتول کی بیوی نے آپ پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔ ہم آپ کو سیٹھ واجد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتے ہیں۔“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جب میں ان کے گھر سے نکلا تو وہ زندہ تھے؟“ ساحل گھبرا گیا۔ ”یہ سب عدالت میں کہیے گا۔“ اسے ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ ان کی نشست کے دوران شازیہ کمرے سے باہر آ چکی تھی۔ وہ حتمی سے آگاہ ہوتے ہی وہ رونے لگی۔ ساحل کو رونا کر لیا گیا۔ اس پر کیس چلا رہا، عدالت میں آفاق سناں کے خلاف گواہی دی۔ چہرہ اسی کی گواہی نے اسے اپنی طرح پھنسا دیا۔ چہرہ اسی خان افسر کا کہنا تھا کہ ”معاشرے کے سامنے ساحل گھبرا ہوا نکلا اور بھاگنے

کے سے انداز میں وہاں سے نکل گیا۔“

واجد سیٹھ کو یمن دل کے مقام پر پھر گھونپ کر قتل کیا گیا تھا۔ آٹھ لاکھ پولیس کوٹھیں ملا تھا۔ ساحل کو چھائی کی مرزا سنا دی گئی۔

”جو ان تمہاری زندگی کے آخری چند گھنٹے باقی ہیں، اس طرح بیٹھے رہنے سے بہتر ہے نماز پڑھو، قرآن پاک کی تلاوت کرو اور گناہوں کی معافی مانگو۔“ اس کی سماعت سے ایک بھاری بھر کم آواز نکل رہی، آنکھیں کھول کر دیکھا تو سلاخوں کے پار راہداری میں گشت کرنے والا سلیم نامی سنتری کھڑا تھا۔

”سلیم بھائی کیا نام ہو رہا ہے؟“

”رات کا ایک بج رہا ہے، ٹھیک پانچ بجے تھیں پھانسی گھاٹ لے جایا جائے گا۔ گویا تمہاری زندگی کے صرف چار گھنٹے باقی ہیں۔ انہیں قیمتی بنانے کے لئے اللہ کو یاد کرو۔“ سنتری اسے نصیحت کر کے آگے بڑھ گیا۔

ساحل ایک طرف بیٹھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔ ”یا اللہ تو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ تو ہی میری بے گناہی کا گواہ ہے۔ جس طرح تو نے بے گناہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل میں مدد فرمائی تھی، یا اللہ میری مدد کر، یا اللہ تو جو چاہے کر سکتا ہے۔“ وہ آنکھیں بند کر کے صدق دل سے دعا کر رہا تھا، اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”آنکھیں کھولو بیٹا! اس کی سماعت سے ایک شیریں آواز نکل رہی، ساحل نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے ایک نورانی چہرہ والے بزرگ موجود تھے۔

”آپ کون ہیں اور یہاں کیسے پہنچے؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا اور بخور کال کوٹھری کے مقفل دروازے کو دیکھا۔

”ان باتوں کو چھوڑو، میں تمہیں صحیح سلامت اس کال کوٹھری بلکے اس جیل سے باہر نکال دوں گا، لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”کیوں مذاق کر رہے ہیں؟ میری زندگی کے صرف ساڑھے تین گھنٹے باقی ہیں۔ ان سنگناخ

سلاخوں کے درمیان سے چڑھا بھی باہر نہیں جاسکتی، میں کیسے یہاں سے نکلوں گا۔“ انتہائی پریشانی کے باوجود ساحل بڑس پڑا۔

”ہنسو مت! جب میں یہاں آسکتا ہوں تو تمہیں باہر نکال بھی سکتا ہوں۔ یہ سب تقدیر کے کام ہیں۔ تمہارا اس جیل میں قید ہونا۔ پھر پھانسی سے پہلے یہاں سے عائب ہونا اس میں بھی کوئی مصلحت ہے۔ جو آنے والے وقت میں تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“ بزرگ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

اسی وقت قدموں کی چاپ سنائی دی، راہداری میں گشت کرنے والا سنتری سلاخوں کے پار کھڑا ساحل کو حیرت سے گھور رہا تھا۔ ساحل گھبرایا ہوا بزرگ کے سامنے سے اٹھا اور سلاخوں کے قریب جا پہنچا۔ ”خیریت تو ہے کس سے باتیں کر رہے تھے۔“ سنتری اس پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

”یہ بابا پراسرار طریقے سے اندر آئے ہیں انہی سے باتیں کر رہا تھا۔“ ساحل بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”لگتا ہے تم دماغی توازن کھو چکے ہو، اسی لئے ہلکی ہلکی باتیں کر رہے ہو، ان سلاخوں کے پیچھے تمہارے علاوہ دوسرا کوئی موجود نہیں۔“ سنتری اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھتا ہوا چل دیا۔

”وہ بزرگ کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ بزرگ کے قریب جانے کی اب اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”ذرو مت! میرے قریب آؤ، میں تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ وہ جھجکتا ہوا ان کے قریب جا پہنچا۔ ”میرے ساتھ آگے بڑھو۔“ بزرگ نے اس کا ہاتھ تھاما اور سلاخوں کے قریب جا پہنچے۔ کٹھری کا منقل دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وہ حیرت زدہ سالن کے ساتھ کال کٹھری سے باہر نکلا۔ ان کے باہر نکلنے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ ”پیچھے مڑ کر دیکھو۔“ انہوں نے کہا تو ساحل نے پلٹ کر دیکھا۔ کال کٹھری کے فرش پر ایک

فخس قیدی خبریں سوار کی دردی پہنے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ ہنسنا تھا۔ ساحل کا منقل اسے دیکھ کر مسکرایا اور فرش پر لپٹ کر آنکھیں موند لیں۔

”بابا جی یہ سب کیا ہے؟“ ساحل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ تمہارا ہمزاد ہے۔ کچھ دیر بعد جب گشت پر معذور سنتری لوٹے گا تو یہ اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرے گا، اس کا معائنہ کرنے والا ڈاکٹر بھی اس کی طبی موت کی تصدیق کر دے گا۔ تم قانون اور دنیا کی نظر میں مردہ کہلاؤ گے۔ لیکن درحقیقت زندہ رہو گے۔ اس کی لاش تمہارے دروازے کے حوالے کر دی جائے گی، لحد میں اتارنے کے بعد ہمزاد وہاں سے عائب ہو جائے گا، اب یہاں سے چلو میرے پاس وقت کم ہے۔“ وہ راہداری میں چلتے ہوئے گشت پر معمول سنتریوں کے پاس سے گزرے۔ حیرت انگیز طور پر ان سنتریوں نے انہیں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

”کیا یہ؟“ انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور ندی روکا؟“ ساحل نے حیرت سے پوچھا۔

”جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے نہ ہی تمہیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی مجھے دیکھ سکتے ہیں۔“ وہ مختلف راہداریوں اور بیرکوں سے ہوتے ہوئے نیل کے مین گیٹ پر جا پہنچے۔ حیرت انگیز طور پر راستے میں موجود کئی سپاہیوں نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ مین گیٹ پر ایک حوالدار اور نصف درجن سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں تھامے چوکے کھڑے تھے۔ ان کے نزدیک پہنچتے ہی ہماری بھر کم گیٹ خود بخود کھل گیا۔ وہ دونوں جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلے، گیٹ دوبارہ خود بخود بند ہو گیا۔

”ساحل بیٹے اب میرے جانے کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ تم یہاں سے سیدھے شاداب نگر جاؤ گے۔ وہاں مسند حسین کی حویلی پر جا کر کہنا کہ ”تم نوکری کی تلاش میں ہو۔“ اگر کسی نے پوچھا کہ ”کیا کام جانتے ہو تو تم کہنا کہ میں ڈرامیڈر ہوں۔“ ان کا ڈرامیڈر نوکری چھوڑ

کر جا چکا ہے۔ تمہیں ڈرامیڈر کی نوکری پر رکھ لیا جائے گا۔“

اس حویلی میں مشعل نام کی لڑکی ہے، تم یہ لاکٹ اسے دے دو کہ وہ کہو گے کہ یہ لاکٹ بابا نور جلال نے دیا ہے۔“

ہاتھ ایک لاکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ساحل نے لاکٹ جیسے ہی ان کے ہاتھ سے لیا۔ وہ تب ہو چکے تھے۔

رات کے چار بجے کا وقت تھا۔ اسی لئے سناں سنسان تھیں۔ اکاڈکا گاڑیاں سڑک سے گزر رہی تھیں۔ ساحل سوچنے لگا۔ ”نیل سے باہر تو آچکا ہوں۔ پر وعدے کے مطابق شاداب نگر کیسے پہنچوں گا۔ اور قیدیوں کے لباس میں مجھے کسی نے دیکھ لیا تو مشکل میں پھنس جاؤں گا۔“ سوچتے سوچتے اس کی نظر اپنے لباس پر پڑی تو وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کے جسم پر قیدی کی دردی کے بجائے سفید رنگ کا کرتا ظاہر موجود تھا۔ اس نے کرتے کی سائیکل کی جب کو ہماری محسوس کرتے ہوئے ہاتھ ڈالا تو اسے حیرت کا ایک دور چھوٹا لگا۔ اس کے ہاتھ میں پانچ سو کے نوٹوں کا ایک گڈی موجود تھی۔ اسے یہ سب کچھ الف لیلی کی کہانی کی طرح لگ رہا تھا اس نے سوچا کہ میں وہ خواب دیکھ رہا ہوں، نہ ہو کہ کھلنے پر خود کو دوبارہ جیل کی نگاہ سلاخوں کے پیچھے پائے، یہ سوچ کر زور سے اپنے درمیان ہاتھ کی پٹ پر چٹکی کاٹی، تکلیف ہوئی تو کھابہ بایہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔

مشعل گہری نیند سے بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی سردی میں بھی اسے خوف سے پسینے آ رہے تھے۔ اس نے خوف کا سبب وہ خواب تھا۔ جو کبھی کبھار وہ دیکھتی تھی۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اور وال کلاک کی طرف دیکھا رات کے دو بج رہے تھے، ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں اور مونا چاہا مگر خند اس کی آنکھوں سے بہو زور تھی۔ خواب میں دیکھے گئے ہاتھ پوری جذبات سے اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ خوف ناک خواب کئی ماہ سے اسے مسلسل دکھائی دے رہے تھے۔

وہ خواب میں اکثر دیکھتی۔ وہ ایک برف پوش پہاڑی علاقے میں موجود ہے۔ برف میں ایک انسانی جسم دفن ہے۔ جس کا صرف سر اسے دکھائی دیتا ہے۔

”ہاتھ برف تلے دفن ہوتا ہے، برف میں دفن مردہ شخص کا چہرہ نہایت ہی ہمایاںک ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کا ایک طرف کا حصہ جلا ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ ایک آنکھ صحیح سلامت اور دوسری آنکھ کا صرف گڑھا تھا۔ مشعل کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس قدر سرخ ہوتی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہو، وہ مردہ شخص برف سے باہر آ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن درآئی کی طرح مڑے ہوئے اور لمبے ہوتے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے مشعل کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا ہے۔ ”میں پچاس سال سے برف میں دفن تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ میں تیرے خون سے اپنی پیاس بجھاؤں گا۔“ اس کے ساتھ ہی مشعل کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

مشعل کے خوف زدہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بزدل تھی۔ وہ جدید دور کی لڑکی تھی جس نے سیلف ڈیفنس کی باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی تھی۔ اس کے والد مسند حسین شاداب نگر میں وسیع زمینوں کے مالک تھے۔ شہر میں دو گارمنٹ فیکٹریاں اور کاروں کا شوروم بھی تھا، وہ بخشنی، ایماندار اور نیک سیرت انسان تھے، ان کا چھوٹا بھائی اصغر حسین موقع پرست اور لاپرواہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ عیاش اور جوئے کا شوقین بھی تھا۔ ان کے والد فدا حسین کی تین اولادیں تھیں۔ مسند حسین، اصغر حسین اور نو جوان بیٹی آسیہ جو ایک وحشی انسان کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔ ان دونوں اصغر حسین اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ بیٹی کے صدمے سے فدا حسین کی حالت بہت نامناسب ہو چکی تھی۔ اصغر حسین کے تعلیم مکمل کر کے لوٹنے ہی زمین، جائیداد اور بینک اکاؤنٹس میں موجود رقم اور بڑس دونوں بھائیوں میں

براہی کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا۔ تقسیم کا یہ عمل ان کے خاندانی وکیل محمد اسلم کی نگرانی میں ہوا۔ جو صفدر حسین کا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایماء اور اصول پرست انسان تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد صفدر حسین نے پر نکالنے شروع کر دیئے۔ دونوں بھائی صاحب اولاد اور شادی شدہ ہو چکے تھے، صفدر حسین کا ایک بیٹا آٹھ سالہ منور حسین اور دس سالہ بیٹی مثل تھی جبکہ صفدر حسین کا ایک بیٹا رضوان تھا۔ صفدر حسین نے آدمی سے زائد دولت اور جائیداد جوئے میں ہار دی۔ باقی کی کسر اس کی عیاش طبیعت نے پوری کر دی۔ بازاری عورتوں کی بری لت نے اسے نکال کر دیا۔ وہ بیوی اور بچے کے ہمراہ تنگ دستی سے زندگی بسر کرنے لگا۔

بڑے بھائی صفدر حسین نے اس کڑے وقت میں اس کا ساتھ دیا۔ اپنی ایک گارنٹن ٹیکری میں جنرل منیر کی پوسٹ پر اسے رکھ لیا۔ اپنی حویلی سے کچھ فاصلے پر شاندار قسم کی ایک حویلی اسے بھی بنا کر دی۔ رفتہ رفتہ صفدر حسین کی پوزیشن مستحکم ہونے لگی۔ ان دنوں مثل بارہ سال کی اور منور دس سال کا تھا۔ جب ان کے گھر المناک حادثہ رونما ہوا۔

اس دن وہ پرسکون نیند سو رہے تھے، آدمی رات کے وقت کھٹکے کی آواز سے صفدر حسین کی آنکھ کھل گئی اور پھر یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ ان کے بیٹے منور میں دو رائفل بردار ان کی طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزاحمت کرتے ایک رائفل بردار نے گولی چلا دی۔ جو سیدھی ان کے دل میں بیوست ہو گئی۔ ان کی بیوی بلیٹس نے ڈر اور خوف سے دلدوز چیج ماری تھی کہ دوسری گولی نے انہیں بھی ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

مثل اور منور حسین پہلی گولی کی آواز سن کر جاگ اٹھے تھے وہ اس وقت اس بیٹے منور سے ملحقہ کمرے میں موجود تھے جس کا ایک دروازہ صفدر حسین کے بیٹے منور میں کھلا تھا، اس نے دروازے کی ہول سے

نظریں جمادیں۔ صفدر حسین کے بیٹے منور کے منظر نے مثل کو خوفزدہ کر دیا۔ خون میں لت پت صفدر حسین بیٹے پر بے حس و حرکت پڑے تھے ان کے بیٹے کے قریب دو رائفل بردار رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ دونوں کے چہرے سامنے رخ پر تھے، کی ہول سے وہ انہیں واضح طور پر دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک وہ پتلا اور پست قامت تھا جبکہ دوسرا خاصا قوی نیکل اور دراز قد تھا۔ مثل کے دیکھتے ہی اس دراز قد شخص نے اس کی ماں کو بھی گولی مار کر نکل کر دیا۔

اس بار قاتر کی گونج دار آواز پر منور خوف سے چیخ پڑا۔ اس کی چیخ سن کر دونوں قاتل ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے دروازے کو دھکیلتا چاہا مگر دروازہ لاک تھا۔ مثل نے بائیں سمت دالدار دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ کور بیروں میں کھلا تھا۔ اسی وقت گولی جلنے کی آواز سنائی دی، قاتلوں نے گولی مار کر دروازے کے لاک کو ناکارہ بنا دیا تھا۔

خونخیز مثل باہر بھاگی، گھبراہٹ میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کمرے میں اس کا بھائی بھی موجود ہے۔ قاتل کمرے میں داخل ہو چکے تھے، مثل نے باہر نکلتے ہی کور بیروں میں دوڑ لگا دی۔ اسی وقت ایک قاتر ہوا اور منور کی دلدوز چیخ سنائی دی۔

وہ پانگوں کی طرح کور بیروں میں بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اسے اپنے عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی بے درپے چند قاتر ہوتے چلیاں اس کے ارد گرد سے شوشوں کی آواز کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا۔ گیٹ کے سامنے چوکیدار کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ دلہہ بھر کھٹکی، پھر لاش کو پھلانگ کر گیٹ سے باہر نکلی اور ایک طرف دوڑتی ہوئی نکل گئی، اسے اپنے عقب میں دوڑتے قدموں اور گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بے درپے قاترنگ سے ارد گرد کے گھر میں موجود نفوس جاگ اٹھیں اور گھروں سے باہر نکل آئے، چاروں طرف شور و غل مچ گیا۔ سامنے

اس کے پڑوسی وینو چاچا اور چند افراد دوڑتے چلے آ رہے تھے اور پھر قاتلوں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ شاداب عمر میں گھرام بچ چکا تھا ہر آنکھ اٹک رہی تھی۔ صفدر حسین ان کی بیوی اور بیٹا منور حسین، غنیمت جلد آدروں کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ انہوں اور سسکیوں کے ساتھ ان تینوں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

مثل کی حالت بہت خراب تھی وہ دن رات روتی رہتی، اگرچہ اس کی رہائش صفدر حسین کے گھر تھی، پر اس کا دل دہاں بھی نہیں لگ رہا تھا، اسے رہ کر اپنے والدین اور بھائی کی یاد آتی تھی، قاتلوں کا قد و قامت چہرہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ یہ دیکھ کر صفدر حسین کے دیکھنے اور دوست محمد اسلم اسے شہر اپنے گھر لے گئے۔

آٹھ سال اس نے وہیں گزارے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کے دل میں آتش انتقام بھڑک رہی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ تنہا لڑکی کا انسانوں کے اس جنگل میں رہنا مشکل ہے، اس نے شہری کے ایک آرٹ آرٹ کلب سے سیلف ڈیفنس کی تربیت حاصل کی، کچھ شوق بھی تھا، اور دل میں بھڑکنے والی آگ کی بدولت وہ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کرتی چلی گئی، وکیل صاحب سے کہہ کر لائسنس بنوایا۔ پٹل فریڈا اور نشانہ بازی کی مشق شروع کر دی۔ انہی دنوں محمد اسلم کا امریکہ جانے کا پروگرام بن گیا۔ ان کا بیٹا دسیم کچھ پیشکش تھا۔ انہوں نے مثل کو بھی ساتھ لے جانا کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ محمد اسلم نے اپنے بیٹے کی پامیاں اسے سونپ دیں اور خود اپنے بیٹے کے پاس چلے گئے۔ کچھ روز بعد مثل نے بیٹے کو تالا لگایا اور اپنی ملازمہ منیرہ اور ادھیڑ عمر ملازمہ ابراہیم چاچا کے ہمراہ شاداب عمر ہائی آبادی حویلی میں جا پہنچی۔

صفدر حسین مکاری سے تمام دولت و جائیداد اور نوٹس پر نگرانی کے نام پر قابض ہو چکا تھا۔ مثل کی انجی سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ رضوان سے شادی

کے لئے اسے آمادہ کرنا چاہا مگر مثل نے انکار کر دیا، اب اس کی زندگی کا مقصد اپنے گھرانے کی برہادی کا انتقام لینا تھا۔

ماضی کی برچھائیوں میں گم ایک رات مثل ایسی سوئی کہ اس کی آنکھ رضیہ خالہ کے گھجھوڑنے سے کھلی۔ ”بی بی جی آنکھیں کھولیں دن چڑھ آیا ہے۔“

دو سست روی سے جمائیاں لگتی ہوئی اٹھی اور داس روم میں جا کھسی کچھ دیر بعد جب وہ اپنے روم میں پہنچی تو ناشتہ لگ چکا تھا۔ ”خالہ ڈرائیور چاچا چند دنوں کی چھٹی پر گئے تھے اب تک نہیں واپس لوٹے کیا مسئلہ ہے؟“ ناشتہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”بیٹا سننے میں آیا ہے کہ اس کا بیٹا جوان ہو چکا ہے اور روزگار سے بھی لگ چکا ہے۔ اسی نے انہیں کام کرنے سے منع کیا ہے وہ کہتا ہے۔ ”ابا تم گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو، اب کمائے کی میری عمر ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے خالہ آپ ابراہیم چاچا سے کہیں کوئی یا ڈرائیور ڈھونڈیں، میں ذرا شہر چار دی ہوں کچھ کپڑے لینے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بیٹا ڈرائیور نہیں ہے اور تم گاڑی چلانے کی ماہر بھی نہیں ہو، شہر کی سڑکوں پر ٹریفک زیادہ ہوتا ہے کچھ دن رک جاؤ، جیسے ہی کوئی ڈرائیور ملے گا، تم چلی جانا۔“ خالہ نے اسے روکنا چاہا۔

”کچھ نہیں ہوتا خالہ میں گاڑی آہستہ چلاؤں گی۔“ وہ پرس شانے سے لٹکا کر چلتی ہوئی گیٹ پر جا پہنچی۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا ابراہیم چاچا کسی سے جو گفتگو تھے۔ وہ گیٹ سے باہر نکلی۔

دو درمیانی قد و قامت کا چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ جو چاچا ابراہیم سے بات کر رہا تھا۔ ”کیا ہوا چاچا یہ کون ہیں؟“

”بیٹا یہ لوکر کی کی تلاش میں آیا ہے اس کا کہنا ہے کہ ماہر ڈرائیور ہے۔ لیکن اس کا ہمارے علاقے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ ہم کسی انجی کو ملازم نہیں رکھ سکتے۔“ چاچا ابراہیم اس کی طرف

”چاچا جی کبھی کبھی اجنبی انہوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں، مجھے ویسے بھی شہر جانا ہے، ان کی ڈرائیونگ میں مہارت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور آپ کے انٹرویو میں جو کسر رہ گئی ہے وہ میں پوری کر لوں گی۔“ وہ ہنسی اور گندی ترنٹ کے اس کلین شید نو جوان کو اندر آنے کو کہا۔ اس کے باپا کی لینڈ کروزر ان دونوں اس کے زیر استعمال تھی، حویلی کے کیران میں موجود تھی، کچھ دیر بعد لینڈ کروزر شاداب نگر کی سڑک پر درمیانی رفتار سے چل رہی تھی۔

نو جوان کے گاڑی چلانے کا انداز اسے ماہر ڈرائیور ثابت کر رہا تھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“ اور اس سے پہلے آپ کہاں تھے؟“ مشعل نے پوچھا۔ ”میرا نام ساحل ہے، میرا تعلق فلاں شہر سے ہے اور اس سے پہلے میں سینٹرل جیل کے پھانسی گھاٹ میں تھا۔“ ساحل نے اطمینان سے جواب دیا اور مشعل بری طرح چونک پڑی۔ ساحل نے گاڑی روک دی اور مشعل کی طرف دیکھنے لگا۔ ”میں چاہتا تو آپ سے جھوٹ بھی بول سکتا تھا۔ لیکن جھوٹ سے مجھے نفرت ہے، مجھے بابا نور جلال نے یہاں بھیجا ہے اور یہ لاکٹ بھی آپ کے لئے دیا ہے۔“ اس نے لاکٹ حیرت زدہ مشعل کو دیا۔

”نور جلال تو میرے نانا کا نام ہے، انہیں تو فوت ہوئے عرصہ ہو چکا ہے، اسی کہتی تھیں وہ ماہر روحانیت تھے یعنی نورانی علم کے حامل۔ ان کی ایک تصویر بھی ہمارے گھر میں موجود ہے تم ان کا حلیہ بتاؤ؟“

ساحل نے بابا نور جلال کا حلیہ دہرایا اور بتایا کیسے انہوں نے اسے جیل سے آزاد کروایا۔

”یہ حلیہ تو واقعی نانا جان کا ہے، اس کا مطلب ہے آپ سے ان کی روح نے ملاقات کی تھی لیکن آپ کو یہاں بھجوانے کا کیا مقصد ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ ساحل نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ ”آپ مشکل سے تو سیدھے

سادھے گتے ہیں پھر آپ سے قتل کیسے ہوا؟“ مشعل نے پوچھا۔ اسے یہ نو جوان اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ ساحل نے اسے اپنی پوری روداد سنا ڈالی۔ ساحل کا شادی شدہ ہونے کا سن کر نہ جانے اسے کیوں جھکا سا لگا۔ وہ کم سم سی ہو گئی۔ ابھی وہ شاداب نگر کی حدود سے باہر بھی نہ نکلے تھے کہ انہیں روکنا پڑا، کچھ سڑک پر بنے گاؤں کی ایک شاعر ہنڈا اکارڈ آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ ساحل نے گاڑی روک کر ہارن بجانا شروع کر دیا۔

کار کے اگلے دروازے کھلتے پر دو صحت مند نو جوان باہر نکلے ایک نائٹ کا اور دوسرا دروازہ درزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر کتنی مونیخیں موجود تھیں۔ وہ دونوں لینڈ کروزر کے قریب پہنچے۔ ”مشعل یہ کون ہے، مجھے کسی اجنبی کے ساتھ تمہارا گھر ملنا پھرنا اچھا نہیں لگتا۔“ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے۔

”رضوان اپنی اوقات میں رہو، تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے کو نکلے والے۔“ مشعل کے چہرے کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”ڈیڈی نے ہمارا رشتہ طے کیا ہے، کیا تم نہیں جانتی۔“ رضوان فرمایا۔

”بکو اس بند کرو، میں ایسے کسی رشتے کو نہیں مانتی اگر آئندہ میرا رشتہ روکا تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“ مشعل نے اپنے لباس سے پھل نکال کر اس کی نال کا رخ رضوان کی طرف کر دیا۔

”مشعل اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ رضوان اسے دھمکیاں دیتا ہوا اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”تم تو بہت خطرناک لڑکی ہو، یہ پھل کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“ ساحل نے گاڑی چلانے ہوئے پوچھا۔

”میرے اصرار پر اسلم انکل نے لے کر دیا تھا، اس کا لائنس بھی ہے میرے پاس، مجھے نشانہ میں مہارت حاصل ہے، فارغ اوقات میں اکثر نشانہ بازی

کی شہین کرتی رہتی ہوں۔“

”اور میں نے تو زندگی میں کبھی بھی ہتھیار نہیں کیا۔“ وہ گاڑی کو شہر کی طرف جانے والی سڑک پر موڑتے ہوئے بولا۔

”کوئی بات نہیں میں جہیں بھل چلا تاں سکھا دوں گی۔ اس خاک معاشرے میں رہنے کے لئے سب کچھ بیکار پڑتا ہے۔“

وہ شخصین آمیز لگا ہوں سے اس باہت لڑکی کو کہنے لگا۔ ”سنو بکھی کبھی تم مجھے بہت اداس دکھائی دیتی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“ مشعل نے اپنی آپ بیتی اسے سنا ڈالی۔ ”میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“ مشعل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اسے اپنے والدین اور بھائی شہت سے یاد آنے لگے تھے۔ باتوں باتوں میں کافی بار اذیت کٹ گیا۔ شہر پہنچ کر مشعل نے اپنے لئے، اپنے خالہ اور چاچا ابراہیم کے لئے کپڑے خریدے اور ساتھ ہی ساتھ ساحل کے متع کرنے کے باوجود اس کے لئے بھی ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالی۔ انہیں نکواب گھر واپس لوٹنے شام ہو چکی تھی۔

ساحل چند ہی دنوں میں ان سے یوں مکمل مل گیا جیسے وہ اسی گھر کا ایک فرد ہو، اسے رہنے کے لئے ابراہیم چاچا کے برابر والا کمرہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے شب و روز وہیں گزرنے لگے۔ مشعل اس دوران سے بھی نشانہ بازی سکھاتی رہی، ویسے بھی روپے پیسے مشعل کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں بابا صفدر حسین کی اب بھی کروڑوں کی موجودگی۔

ساحل بے چین تھا اسے اپنے گھر والوں اور چھٹی کی فکری جو شادی کے پہلے روز ہی اس سے منچر چکی تھی وہ ہر وقت سوچتا رہتا، میری موت کی اطلاع سن کر نانا کیا حال ہوا ہوگا؟

ایک روز معمول کے مطابق وہ اپنے کمرے نما جا کر سو گیا۔ آدھی رات کے قریب اسے بے چینی کی تسکین ہوئی، چند لمحوں کے بعد اس کی طرف

کی بے چینی دور نہ ہوئی، تنگ آ کر وہ کمرے سے باہر نکل کر چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ چھت پر جا کر کھلی نفا میں ٹپل کر بے چینی دور کرنے کا تھا۔ چھت پر پہنچ کر ٹپلتے ٹپلتے وہ منڈیر پر جا پہنچا۔ اچانک اسے حویلی کے باہر عجیب قسم کی نقل و حرکت دکھائی دی۔ وہ چوکنہ ہو کر چھت پر ہی باؤٹھری وال کے پیچھے چھپ کر باہر دیکھنے لگا اسے چند افراد متحرک دکھائی دیئے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں وہ دھڑے دھڑے حویلی کے گرد گھبرا ڈال رہے تھے، وہ گھبرا گیا۔ اس قسم کی صورتحال سے اس کا کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ حویلی کے گرد گھبرا ڈالنے والوں کی تعداد تقریباً چھ یا سات تھی جو کہ سب کے سب ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ساحل نے یہاں آ کر مشعل سے پھل چلا نا سیکھا تھا۔ اس سے قبل اس نے کبھی بھی ہتھیار نہ اٹھایا تھا۔ وہ سوچنے لگا اگر اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھارہ تو اس سمیت اس حویلی میں موجود تمام افراد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان کے پاس واحد ہتھیار ایک پھل تھا جو کہ اس وقت مشعل کے پاس موجود تھا وہ تیزی سے چھت سے نیچا اترا اور مشعل کے کمرے کے مشعل دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پینے لگا۔

”کون ہے؟“ کچھ دیر بعد اندر سے مشعل کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

”مشعل جلدی باہر آؤ ہم سب کی زندگی خطرے میں ہے۔“ وہ گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا، کچھ ہی دیر بعد مشعل کمرے سے باہر نکلی، اس کے ہاتھ میں پھل موجود تھا۔ ”کیا ہوا ساحل خیریت تو ہے؟“

”اس حویلی کے گرد ہتھیاروں سے مسلح افراد گھبرا ڈال رہے ہیں۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ وہ دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے چھت پر جا پہنچے۔ انہوں نے محتاط انداز میں نیچے جھانکا، ایک شخص اچانک گر دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ حویلی کے احاطے کی دیوار کافی اونچی تھی۔ شاید اس نے اوپر چڑھنے کے لئے رسی کی مدد لی تھی۔ مشعل نے پھل کی نال کا رخ اس کی طرف

کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ حملہ آوروں کا ساتھی کریناک انداز میں چیخا ہوا اونچی دیوار سے نیچے گرا۔ حویلی سے باہر موجود افراد میں پہلے سی جی گئی۔ انہوں نے فوراً ہی پوزیشن سنبھال کر حویلی پر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ دونوں نیچے بیٹھ گئے۔ گولیاں ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ ”ساحل یہ ہم سے تعداد میں زیادہ ہیں اور ان کے پاس اسلحہ بھی موجود ہے اور یہ سب تربیت یافتہ ہیں جبکہ ہمارے پاس صرف ایک پبٹل ہے اور جس کی گولیاں محدود ہیں۔ یہ فائرنگ کی بوچھاڑ میں حویلی میں گھسنے کی کوشش کریں گے تم یہ پبٹل پکڑو اگر کوئی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی چلا دینا، میں خالہ اور چاچا کو چکا کر گاڑی میں سوار کرتی ہوں، ٹھیک پندرہ منٹ بعد تم بھی چھت سے نیچے اتر آنا، میں گاڑی سمیت حویلی کے پچھلے گیٹ پر موجود رہوں گی۔“ وہ ساحل کے ہاتھ میں پبٹل تھما کر جھکے جھکے انداز میں دوڑتی ہوئی چھت سے اتر گئی۔

حویلی پر فائرنگ بدستور جاری تھی۔ چاروں طرف گولیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ اسی فائرنگ کی آڑ میں ایک شخص نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی، ساحل نے اس پر فائر کیا۔ گولی اسے لگی تو نہیں لیکن وہ گھبرا کر دلپس اتر گیا۔ ساحل نے بے درپے چند فائر کئے اور پندرہ منٹ بعد چھت سے اتر کر بھاگتا ہوا حویلی کے عقبی سمت جا پہنچا۔ ”مشل، خالہ اور چاچا حویلی کی عقبی سمت گیٹ کے پاس لینڈ کروزر میں بیٹھے تھے۔ مشل نے اسے ذرا ٹیگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس سے پبٹل لے کر نیچے اتری۔“ یہ تم کیا کر رہی ہو۔“ وہ گھبرا گیا۔

”میں جیسے ہی گیٹ کھولوں گی، تم تیز رفتاری سے گاڑی باہر نکالنا، میری نگرمت کرو۔ چلتی گاڑی میں سوار ہونا میرے لئے مشکل نہیں۔“ مشل نے جیسے ہی گیٹ کھولا۔ گاڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی۔ مشل دوڑتی ہوئی چلتی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ باہر دو افراد رانٹلیں ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ لینڈ کروزر ان پر چڑھ

دوڑی۔ انہوں نے نیچے کے لئے چھلانگ لگانا چاہی، مگر انہیں دیر ہو چکی تھی، گاڑی انہیں کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ حویلی سے کافی فاصلے پر پہنچ کر ساحل نے سائیز مرر میں دیکھا مبادا کوئی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا لیکن دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان تک نہ تھا، اس نے سکون کا سانس لیا اور اپنی نظرسا سانسے مرکوز کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ تیز رفتاری کے سبب وہ جلد ہی شاداب ٹرکی کی حدود سے باہر نکل گئے۔ ”مشل اب کہاں جاتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اسلم انکل کی کوشی کی چابی میرے پاس ہے، ہم کچھ عرصہ وہیں رہیں گے۔ راستے میں کسی بھی پیٹرول پمپ پر گاڑی روک دینا ہمارا سرخوٹل ہے، فیول کم نہیں ہونا چاہیے۔“

تقریباً ایک گھنٹے بعد پیٹرول پمپ دکھائی دیا۔ فیول ڈلووانے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز دوپہر گیارہ بجے وہ اسلم ایڈووکیٹ کے بیٹے پر موجود تھے۔ کافی عرصہ بندر بننے کی وجہ سے بنگلہ گروڈ لودر ہوا تھا۔ خالد رضیہ صفائی میں جت لگیں اس موقع پر ان کے متع کرنے کے باوجود ساحل اور مشل نے بھی ان کا ہاتھ بنایا۔ دن کا کھانا ہوٹل سے منگوایا۔ صفائی کرتے کرتے دن ڈھل چکا تھا۔ رات تقریباً آٹھ بجے صفائی سے فارغ ہوئے تو چھکن سے چور چور ہو رہے تھے، ہوٹل سے ہی کھانا منگوانا پڑا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

”ساحل بھائی آپ کی وجہ سے آپ کے گھر والوں کا یہ نہیں کیا حال ہوگا، آپ ایسا کریں جا کر اپنے گھر والوں اور خاص کر شازیہ بھابی کو یقینا لے آئیں، وہ بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے، آپ کی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی یہاں رونق بھی ہو جائے گی۔“ مشل بولی۔

”ہاں بیٹیا، درست کہہ رہی ہے۔ تم کل ہی انہیں جا کر لے آؤ۔“ خالہ نے اس کی تائید کی۔

اسی وقت ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ ”یا اللہ خیر!

دقت کون آ گیا یہاں تو میں کوئی جانتا بھی نہیں۔“ میرا تم۔“

”ہو سکتا ہے انکل اسلم کا کوئی جاننے والا ہو۔“ مشل پر خیال لیجے میں بولی۔

”ڈور بیل دوبارہ بجی۔“ میں دیکھتا ہوں کون ہے؟“ چاچا اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چل دیے۔

”اچھی! انہیں گئے ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی کہ چاچا کے چانے کی آواز سنائی دی۔“ تم لوگوں کے اس طرح تھکنا کیا مطلب ہے؟“ وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

مشل نے پھرتی سے اپنے لباس سے پبٹل ہاتھ کر ہاتھوں میں لے لیا۔ اچھی انہوں نے کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ تین سپاہی ایک انیسٹر کے ہمراہ چاچا کو دھکیلے ہوئے کمرے میں گھس گئے۔ انہوں نے رانٹلیں اٹھا رکھی تھیں۔ جن کا رخ ان کی طرف تھا۔ ”خبردار! تھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھاؤ، غلط حرکت کی صورت میں کوئی چلاؤں گا۔“ انیسٹر سانپ کی طرف پھینکا۔

”آفسر کسی شہری کے گھر میں اس طرح بلا

”میرا نام انیسٹر شمسٹ ہے، میں اس علاقے کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے دیکھل کے نام سے مت ڈراؤ، تمہیں جو کہتا ہے کورٹ میں کہنا۔ ان دونوں کو گرفتار کرو۔“ انیسٹر بڑے کدھر سے بولا۔

ان دونوں کو احتجاج کے باوجود ہاتھ پشت پر باندھ کر پھنکڑی پہنا دی گئی۔ چچا اور خالہ کے احتجاج کے باوجود وہ انہیں دھکیلے ہوئے کوشی سے باہر لے آئے اور پولیس موہاں میں بیٹھا دیا۔ انیسٹر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ پولیس موہاں تیزی سے سڑک پر چلنے لگی۔ ان کا یہ سفر تقریباً آدھا گھنٹہ جاری رہا۔ اب سنان علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ چونک پڑے، پولیس موہاں تھانے کے بجائے اس ویران علاقے میں موجود ایک عمارت کے سامنے جا رکی، ڈرائیور نے ہارن بجایا کیٹ کھلا اور ایک وحشت ناک اور گرائنڈیل صورت شخص باہر آیا وہ شکل و صورت سے ہی جرائم پیشہ نظائر ہوا تھا، ان دونوں کو تھمٹ کر پولیس موہاں سے اتار دیا گیا۔ وہ انہیں رانٹلوں کی زد میں لئے ایک بارہ بائی بارہ کے کمرے میں جا پہنچے اس کمرے میں کسی قسم کا ساز و سامان موجود نہ تھا۔ دیواروں پر جا بجا اویزت رسانی کے آلات لٹک رہے تھے۔ چھت سے ایک لوہے کی مضبوط زنجیر تالے کی مدد سے لٹک رہی تھی ساحل کو زنجیر کی مدد سے جکڑ دیا گیا۔ جبکہ مشل کو کمرے میں ایک طرف دھکیل دیا گیا۔ ایک سپاہی نے شمسٹ کے اشارے پر مشل کے پاؤں میں رکی باندھ دی۔ ”یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو اور ہم سے اس سلوک کا کیا مطلب ہے؟“ مشل نے پوچھا۔

”یہ میرا جی مار چہ سیل ہے۔ جسے اوپر پہنچانا ہوتا ہے اسے میں یہیں لے کر آتا ہوں۔“ شمسٹ ہنسا۔

”لیکن تمہاری ہم سے دشمنی کیا ہے؟“ مشل نے بے چینی سے پوچھا۔

”مجھے نہیں رضوان کو تم سے دشمنی ہے تمہارے مرے ہی تمہاری ساری دولت و جائیداد ان دونوں باپ بیٹوں کو مل جائے گی۔“

لیکن جیسے یہ ظلم ڈھانے سے کیا ملے گا، کیوں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہے ہو؟“ مثل بولی۔

”رضوان میرا دوست ہے دوسرا اس کام کے مجھے پانچ لاکھ ملے ہیں۔“ اس نے کہا اور ساحل کی طرف بڑھا۔ کچھ ہی دیر بعد شمت اور سپاہی سینڈ بیگ کی طرح ساحل پر لائیں گھونے مار رہے تھے کہ ساحل کی چیونٹوں سے گونجنے لگا۔ مثل چیخ چیخ کر انہیں اس ظلم و ستم سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ پہنچی۔ وہ خود ہاتھ پاؤں بندھی ہونے کی وجہ سے مجبور تھی۔ چیخے چیخے ساحل بے ہوش ہو گیا اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اسی وقت شمت کے موبائل فون کی تیل بجی۔ ”ہیلو شمت اسپیکر۔“ وہ کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔

”ایس بی اسفند یار بول رہا ہوں۔ فوراً میرے آفس پہنچو۔ میرے پاس ایک اوجڑ عمر شخص اور ایک بڑی بی بیٹھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ تم نے ایڈووکیٹ اسلم کے بچکے سے مثل ٹائی لڑکی اور ساحل ٹائی نو جوان کو اغوا کرنا معلوم مقام پر قید کر رکھا ہے۔“ دوسری طرف سے ایس بی نے کہا۔

”سریہ جھوٹ ہے الزام ہے مجھ پر، میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”تم لوگ ساحل کو زندگی کی قید سے آزاد کرنا کر بھیجک آؤ، میں جب تک ایس بی سے مل کر آتا ہوں اور ہاں خیال رکھنا کہ یہ تل حادثہ لگنا چاہئے۔ یہاں اس لڑکی کو راشد کی نگرانی میں چھوڑ جاؤ۔“ شمت تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سپاہیوں نے ساحل کو نیچے اتارا۔ ”اب اس کا کیا کریں؟“ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

”ایسا کرتے ہیں اس کی جھکڑی کھول کر ری باغ دے دیتے ہیں اور ریل کی پٹری پر بھیجک آتے ہیں۔ آنے والی ٹرین اس کے جسم کے پرچے اڑا دے گی

ویسے بھی ریلوے لائن یہاں سے نزدیک ہے۔“ دوسرے نے کہا اور ساحل کو کتہے پر لاد کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے کا دروازہ باہر سے منقل کر دیا گیا۔ ”راشد لڑکی کا دھیان رکھنا ہم اسے ٹھکانے لگا کر آتے ہیں۔“ باہر موجود شخص سے کہہ کر وہ تیزی سے چلے ہوئے عمارت سے باہر نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

”یہ تم نے کیا باگلوں ساحل بنا رکھا ہے۔ کسی کے مرنے سے اس کے ساتھ کوئی مرا نہیں جاتا۔ ساحل مر چکا ہے، اس حقیقت کو تسلیم کر لو اور اداسی، غم کی کیفیت سے باہر نکلو۔ اب تو اسے بچانی چڑھے میچے گزرتے ہیں۔“ شازیہ کے قریب بیٹھے ہوئے اس کی کزن مہوش بولی۔

”خبردار جو تم نے ساحل کو مردہ کہا، وہ زندہ ہے۔ جب میں زندہ ہوں تو وہ کیسے مر سکتا ہے۔“ شازیہ نے مہوش کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت اپنے باپ کے شاندار بنگلے میں اپنے کمرے میں موجود تھی۔ یہ وہی کمرہ تھا۔ جہاں اس نے لڑپن سے لے کر نو جوانی تک کے دن بتائے تھے۔ جیل سے ضروری کارروائی کے بعد لاش ورتا کے حوالے کر دی گئی تھی۔ وہ ساحل کا چہرہ دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس کو ہٹاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ”یہ ساحل نہیں کوئی اور ہے، ساحل تو زندہ ہے۔“

سب نے کہا۔ شازیہ یہ صد سے دعا کی تو اذن کو ٹیٹھی ہے۔ وہ کئی کئی دن ایک ہی لباس پہنے رہتی، بکھرے بالوں اور اجازت چرے کے ساتھ ساحل کے نام کی مالا جوتی رہتی، کھانا پینا سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اس کے چہرے کے گلاب ساحل کی جدائی میں مر چکے تھے، اس وقت بھی مہوش نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی جس پر اس نے بچہ کر مہوش کو برا بھلا کہہ دیا تھا۔ اب وہ بینہ پر بیٹھی دوبارہ ساحل کے نام کی گردان کر رہی تھی کہ کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ مہوش نے سر اٹھا کر دیکھا، اس کا بھائی کا خاص عرف و کی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ”کیا ہوا کزن یہ کون سا پہاڑا پڑھ رہی

”شازیہ یہ نہ اسے گھو کر دیکھا۔“ میں نے پیار اور محبت کی بہت سی کہانیاں سنی ہیں مگر شوہر کے شش میں بیوی کو پاگل ہوتے جیسی بار دیکھ رہا ہوں۔“ وہ بیڈ کے قریب آ کر بولا۔

”پاگل تم ہو گے تمہارے بڑے ہوں گے، ساحل زندہ ہے، وہ ایک دن ضرور آئے گا۔“ وہ پر لیتین بچے میں بولی۔

”آئے گا نہیں آچکا ہے، ہم وہیں جا رہے ہیں تم ہی ہمارے ساتھ چل کر ساحل سے مل لینا۔“ وکی گہری سانس لے کر بولا۔

”یہ تم کون سا شوشا چھوڑ رہے ہو۔“ مہوش نے کچھ کہہ رہا ہوں تم آؤ میرے ساتھ، ماریہ آئی کے کمرے میں چلتے ہیں جب تک شازیہ تیار نہ جاتے گی، تمیں گھنٹے بعد ہماری روانگی ہے، وہ مہوش کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”یہ کیا چکر ہے بھی؟“ وہ ماریہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”ماریہ صوفے پر پاؤں دھو کر بیٹھی تھی۔“ اصل بات یہ ہے مائی سسٹر کہ آج تم، شازیہ، حیدر اور شبیر، فانی علاقوں کی سیر کر جا رہے ہیں، ہمارا پروگرام بہت پہلے سے بننا تھا تمہارا اور شازیہ کا اتفاق اس لئے کیا ہے کہ سیر و تفریح سے ہو سکتا ہے اس کا دل بھل جائے، کیوں آئی؟ میں صحیح کہہ رہا ہوں یا نہیں؟“ وہ ماریہ کے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔

”وکی کچھ تو خیال کرو، میں تم سے سال دو سال پہلے آئی مت کہا کرو، میرا نام لیا کرو۔“ ماریہ اسے عجیب لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھیں آپ جا چاہے عمر میں مجھ سے کم ہیں لیکن ماریہ درمیان موجود رہتے کا تقاضا ہے کہ میں آپ کو سنی کہوں۔“ وہ رمان سے بولا اور ماریہ نے منہ بنالیا۔ ”اگر اصرار کی باتیں کرتے رہے جبکہ مہوش تیاری میں مصروف ہو گئی، اسی مصروفیت میں کالی وقت بیت گیا۔“ حیدر اور شبیر آن پہنچے۔ وہ سیر و سیاحت کے لئے ہائی

لیکس کے کرائے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہائی لیکس تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اس ہائی لیکس میں وکی، حیدر، شبیر، مہوش اور شازیہ کے علاوہ اوجڑ عمر ڈرائیور سمیت چھ افراد موجود تھے، حیدر اور شبیر وکی کے گھر کے دوست تھے۔

سفر کے دوران وہ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے، جبکہ شازیہ بدستور خاموش تھی۔ ایک پوش علاقے سے گزرتے ہوئے حیدر چلایا۔ ”گاڑی روکو۔“ ڈرائیور نے تیزی سے بریک پر پاؤں رکھے۔ ہائی لیکس ایک جھکے سے رگ گئی۔ ”کیا ہوا بھی؟“ وکی نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔

”یار یہ سڑک کے سامنے والے گرین گیٹ والے بنگلے میرے ایڈووکیٹ انگل اسلم کا ہے وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی اس بنگلے کے گیٹ سے ایک لڑکی اور نو جوان کو پولیس محسوس کر موبائل میں ڈال کر یہاں سے نکلی ہے۔“ وہ پریشان تھا۔

”تو ایسا کرتے ہیں پتہ کر لیتے ہیں۔ یہاں کون رہائش پذیر تھا، ہو سکتا ہے انہوں نے کوئی کمرائے پردے دی ہو۔“ شبیر نے تہمہ کیا اور گاڑی سے باہر نکل آئے۔ شبیر، حیدر اور وکی چلتے ہوئے بنگلے کے گیٹ پر پہنچے اور ڈور تیل، بجادی کچھ دیر بعد گیٹ کھلا اور ایک پریشان صورت بوڑھے کی شکل نظر آئی۔ ”کیا بات ہے بیٹا؟“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”باباجی دراصل یہ کوئی میرے انگل اسلم ایڈووکیٹ کی ہے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ پولیس اہلکار اس بنگلے سے ایک لڑکی اور ایک نو جوان کو گھسنے ہوئے بنگلے سے باہر لائے اور موبائل میں ڈال کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیسے رہتے ہیں۔“ حیدر نے پوچھا۔

”بیٹا ایڈووکیٹ صاحب میرے مرحوم صاحب کے دوست ہیں۔ انہوں نے اس بنگلے کی چابی ہماری چھوٹی بی بی کی مثل کو دے رکھی تھی۔ ہم آج ہی یہاں آئے تھے۔ پولیس نے پتہ نہیں کیا کہ ہماری بی بی اور اس کے

بھائی کو گرفتار کر لیا۔ بزرگ نے بتایا۔
 ”موسری بابا! آپ کو تکلیف دی۔“ وہ معذرت
 کر کے بٹنے اور بچنے کا گیت بند ہو گیا۔ چلتے چلتے اچانک
 حیدر ٹھٹک کر رکا اور جھک کر نیچے سے کچھ اٹھایا۔ ”کیا لیں
 گیا تمہیں؟“ شبیر نے پوچھا۔
 ”یاد یہ لاکٹ نیچے سے ملا ہے۔“ ہاتھ میں پکڑی
 سنہری چین اسے دکھائی، اس سنہری چین میں ایک خوب
 صورت لاکٹ تھا، جس پر باریک الفاظ میں آیت الکرسی
 لکھی تھی۔ ”شاید یہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے
 پہن رکھا ہو، پولیس کی چیھنا چھینی اور چھیننے سے بچنے لگی
 ہو۔“ وہ دوبارہ ہائی کس میں سوار ہو گئے۔

ڈرائیور نے حیدر کے اشارے پر گاڑی اسٹارٹ
 کی۔ ”کیا ہوا؟“ وہ نے پوچھا۔
 ”یاد یہ اٹکل کے کوئی واقف ہیں۔ انہوں نے
 بچنے کی جانی انہیں دے رکھی تھی۔ پولیس پتہ نہیں کیوں
 ان دونوں کو لگتی۔“ حیدر بولا۔
 ”ہوسکتا ہے ان سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔“
 مہوش نے کہا۔

”ہماری پولیس اتنی اچھی ہے کہ یہ ہمیشہ شریف
 شہریوں کو ہی شک کرتے ہیں اور ان کی مار کھا کر اچھا بھلا
 شریف انسان بھی جرائم کو تسلیم کر لیتا ہے جو اس نے کئے
 بھی نہ ہوں۔“

”تم نے وہ لطف تو سن رکھا ہوگا کہ ہماری پولیس
 جنگل سے ہرن کو باری ہوئی نکلی تو وہ کہہ رہا تھا میں ہاتھی
 ہوں۔“ وہی بولا اور سب ہنس پڑے۔

”یاد مجھے یہ لاکٹ نیچے سے ملا ہے۔“ اس نے
 لاکٹ دکھائی۔

”ڈرا دکھانا۔“ مہوش نے لاکٹ اس سے لے
 لیا۔ ”اس پر تو آیت الکرسی لکھی ہے ایسا کرتے ہیں اسے
 شاذیہ کو پہناتے ہیں شاید اس آیت کے سبب اس کی
 دماغی کیفیت پر کوئی خوشگوار اثر پڑے۔“ مہوش نے
 خاموش شبی کھوئی کھوئی سی شاذیہ کے گلے میں لاکٹ
 پہنایا۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ اپنے خیالات

میں گم مسمی۔ شاید سابل کو یاد کر رہی تھی۔ وہ مختلف
 مقامات پر گھومتے پھرتے آگے بڑھتے رہے۔ رات کو
 ایک رہائشی ہوٹل میں رکے۔ دوسرے روز صبح وہاں سے
 روانہ ہو گئے، گھومتے پھرتے وہ اس بلند و بالا پہاڑی
 علاقے میں جا پہنچے۔ بلند و بالا پہاڑ برقائی پہاڑ کہلاتے
 ہیں۔ وہ تینوں دوست کو یہ بتا بھی تھے۔ انہوں نے کئی
 پہاڑوں کی چوٹیاں سر کی تھیں۔ ان کا یہاں آنے کا ارادہ
 پہلے ہی سے تھا۔ اسی لئے موسم کی مناسبت سے ساز و
 سامان گرم کپڑے غرض کہ ضرورت کی ہر چیز ان کے
 ساتھ موجود تھی۔

مہوش چونکہ ایک دو مہماں میں پہلے ہی ان کے
 ساتھ آچکی تھی۔ اس لئے کوئی دشواری اسے پیش نہ آئی۔
 اس علاقے کی مناسبت سے گرم کپڑے اور سونے کے
 باوجود بھی انہیں سردی اپنے وجود میں گھسی ہوئی محسوس
 ہوئی۔ البتہ شاذیہ کچھ دیر کے لئے اپنی پرانی کیفیت سے
 باہر آچکی تھی شاید ایسا سردی اور اس دشوار گزار پہاڑی
 علاقے کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ بہت محتاط انداز سے آگے بڑھ رہے تھے۔
 ذرا سی غلطی انہیں زندگی سے محروم کر سکتی تھی۔ ”بھئی
 میں تو تھک گئی ہوں کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں۔“ مہوش
 نے کہا۔

”نہیں ابھی نہیں ہمیں رات ہونے سے پہلے کسی
 محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہئے۔ یہاں بعض اوقات
 ہواؤں کے جھکڑ چٹا شرع ہوجاتے ہیں۔ جو اپنی راہ
 میں آنے والی ہر چیز کو ٹکڑوں کی طرح اڑا دیتے ہیں۔“
 حیدر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”اچانک تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ ان کی
 قسمت اچھی تھی کہ قریب ہی ایک بڑی سی چٹان تھی۔ وہ
 سب چٹان کی لوٹ میں دبک گئے۔“ سب مضبوطی سے
 ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لو۔“ وہی چلا یا اور انہوں نے
 مضبوطی سے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے، ہوا کی
 شدت اس قدر تھی کہ چٹان کی آڑ میں ہونے کے باوجود
 انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے یہ ہوا انہیں اڑا کر

لے جائے گی۔ تیز ہوا کی وجہ سے چھوٹے موٹے برقائی
 درے لڑھکتے ہوئے بلندی سے پستی کی طرف جارہے
 تھے۔ وہ چٹان کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے محفوظ تھے۔
 ”بھائی آپ نے کہا تھا کہ ساحل سے ملوانے
 لے جا رہا ہوں، کب ملواؤ گے؟“ شاذیہ نے وہی سے
 پوچھا۔ اس خطرناک ترین پھینچ میں شاذیہ بوٹی۔ تو وہ
 سب مسکرا دیئے۔

”فکرمیت کرو ساحل یہیں کہیں ہوگا۔“ وہی نے
 اسے پکارا۔ کچھ دیر بعد ہواؤں کے جھکڑ رک گئے۔ وہ
 اپنے اپنے ایک کندھوں سے لٹکائے آگے کے سفر پر
 روانہ ہو گئے۔

”ارے یہ کیا۔“ چلتے چلتے شبیر ٹھٹک کر رک
 گیا۔ اس کی نگاہیں ایک جگہ پر مرکوز تھیں۔ ان سب نے
 اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو خوف سے ان
 کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک انسانی سر انہیں دکھائی
 دے رہا تھا۔ برف سے اٹا ہوا، وہ انسانی سر انہیں فٹ
 بال کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

”یاد یہ تو کوئی لاش ہے، آگے بڑھو۔“ وہی خوفزدہ
 لہجے میں بولا۔

”اگر کوئی لاش ہے تو تمہیں کھا تو نہیں جائے گی،
 براہ راست کئی لاشوں سے بڑچکا ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے تم
 نے کئی موسماں پرانی لاش کھنڈروں سے براہ کی تھی۔“
 شبیر برف میں دبے انسانی سر کے قریب جا کر بولا۔ شبیر
 آہستہ آہستہ کھانچا۔ اس نے اپنا ایک کھولا اور اس میں
 نے ایک خنجر نکال کر آہستہ سے احتیاط کے ساتھ برف
 کھودنے لگا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہی نے پوچھا۔
 ”یاد دکھائی کر کے اس لاش کو باہر نکال رہا
 ہوں۔ تاکہ یہ تو چلے یہاں نہ ہو سکتا ہے اس کے لباس
 میں کوئی ایسی چیز موجود ہو جس سے اس کی شناخت
 ہو سکے۔“ وہ ساتھ ساتھ کھدائی بھی کرتا جا رہا تھا اور
 انہوں ہاتھوں سے برف ہٹاتا جا رہا تھا۔

حیدر ہمت کر کے آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ

بٹانے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ لاش ان کے سامنے تھی۔ خستہ
 حال کپڑے اس کے جسم سے الگ ہو چکے تھے۔ شبیر
 نے جلدی سے اپنے بیک سے کپڑے نکالے اور لاش
 کے عریاں جسم پر ڈال دیئے۔ اس دوران دونوں
 لڑکیاں منہ پھیرے کھڑی رہیں۔ حیرت کی بات تھی کہ
 لاش صحیح سلامت تھی۔ اس کا جسم کہیں سے گھاسڑا یا
 خراب نہ ہوا تھا۔ شاید ایسا برف میں دبا رہنے کی وجہ
 سے ہوا تھا۔

لاش دیوبند کل شخص کی تھی۔ اس کے جسم پر سینے کی
 جانب گولی کے زخم کا نشان تھا۔ چہرہ سیاہ اور بھیا نک
 تھا۔ چہرے کے ایک طرف کا حصہ چلا ہوا ہونے کی وجہ
 سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے خوف آتا تھا۔
 ایک آنکھ صحیح سلامت اور دوسری آنکھ کا صرف گڑھا
 تھا۔ جو اس کے چہرے کو مزید خوفناک بنا رہا تھا۔

”لگتا ہے اس کے چہرے کی یہ حالت کسی
 حادثے میں جلنے سے ہوئی ہے اور موت گولی سے واقع
 ہوئی ہے۔“ جس کا نشان اس کے سینے میں نظر آ رہا تھا۔
 لیکن اسے مارا کس نے اور یہ یہاں کب سے دفن ہے؟“
 شبیر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا بولا اور اس کے خستہ حال
 لباس کی طرف بڑھا جو دھجیوں کی صورت میں پڑا تھا۔
 مختلف کپڑوں کی دھجیوں کو ٹھنڈا ہوا کپڑے کی دھجی کو غور
 سے دیکھنے لگا۔ بڑی سی جیب بنی ہوئی تھی۔ جس پر زپ
 لگی تھی اس نے زپ کو کھینچا۔ یہ بڑی سی جیب تھی جس
 میں ایک موٹی سی پلاسٹک کی جھلی میں ایک عجیب ساختہ
 کی انگوٹھی، شیشی کارڈ موجود تھا۔ شیشی کارڈ پر اس کا نام
 ارشاد احمد اور سن انیس سو پینتھن درج تھا۔ اس کا مطلب یہ
 ہے کہ یہ لاش تقریباً تیس سال سے اس برف میں دفن
 تھی۔ ”شبیر دیکھنے لگا۔

”یاد انگوٹھی یہ بہت بڑی ہے اس لاش کی انگلیاں
 بھی کافی موٹی ہیں۔ اسی کی ہوگی۔“ شبیر نے بولنے
 ہوئے انگوٹھی لاش کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنادی۔
 ”بات سنو بھائی، لاش پر یسرج کا کام بند کرو،
 دل ڈھل چکا ہے۔ سردی بھی بہت ہے کچھ دیر بعد اندر آ

چھا جائے گا۔ آگے چل کر خیرہ گازیٹے ہیں۔ صبح واپسی کی تیاری کریں گے۔

”تو اس لاش کا کیا کریں؟“ شبیر نے پوچھا۔
”ایسا کرو اسے اپنے گھر لے چلو۔“

”ابے پاگل کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، چلو یہاں سے۔“ وکی نے اسے آگے دھکیلا۔

”یارا اسے دوبارہ دفن تو کر لیتے دو۔ وہ رکائی تھا کر دی نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔

”ہم تمہاری طرح پاگل نہیں جو سردی میں دوبارہ اسے دفن کرتے رہیں۔ یہاں برف باری ہوتی رہتی ہے۔ رات بھر میں جاری برف باری دوبارہ اس کا جسم ڈھانپ دے گی۔“ کچھ دور چلتے کے بعد انہوں نے ایک مناسب جگہ خیرہ گازیٹے اور کبیلوں میں گھس گئے۔ مہوش نے قمر باس میں موجود جانے سب کو پیش کی۔ اس غضب کی سردی میں چائے انہیں بڑا مزہ دے رہی تھی۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد کھانا کھایا اور کبیلوں میں دیکھ گئے جسکے سے جلد نیند آگئی اور وہ سو گئے۔

ایک کریناک انسانی چیخ کی آواز سن کر ان کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ ایک دیوہیل شخص کسی کو کندھے پر ڈالے بجلی کی سی تیزی سے خیمے سے بھاگا۔
”کون تھا یہ؟ کسے اٹھا کر بھاگا ہے؟ اور چیخا کون ہے؟“ وکی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”حیدر خیمہ سے غائب ہے۔“ شبیر خوفزدہ لہجے میں بولا۔ مہوش اور شازیہ خوف کے مارے کانپ رہی تھیں۔

”چلو اسے ڈھونڈتے ہیں۔“ وہ ٹارچیں ہاتھوں میں لئے خیمے سے باہر نکلے۔ قدموں کے نشان ایک طرف جارہے تھے۔ وہ چند ہی قدم چلے تھے کہ مہوش نے انہیں روک دیا۔ ”رات بہت ہو رہی ہے سرد ہو جائیں چل رہی ہیں۔ یہ نہ ہو ہم حیدر کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی کھائی میں گر جائیں۔ ایسا کرو یہ رات کی طرح ہسٹرو، صبح حیدر کو ڈھونڈتے ہوئے واپس لوٹ جائیں گے۔“ وہ سب واپس خیمے میں آ گئے۔ ”یاروہ تھا کون؟ اس کا

چہرہ نہیں دیکھا لیکن لگتا تو انسان تھا۔“ شبیر نے کہا۔
”نہیں وہ بھوت پریت یا ڈریکولا کانپ کی کوئی چیز تو نہیں۔“ شبیر نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور سب خوف سے لرز اٹھے۔ ”یہ سب تمہارا تصور ہے شبیر جب سے تم اس لاش کے چکر میں پڑے اسی کے بعد سے مصیبتیں ہم پر ٹوٹ پڑی ہیں۔“ وکی غصے سے چلا با۔
”آپس میں مت لڑو، آپس میں لڑنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ اگر وہ کوئی بدروح یا بھوت پریت قسم کی کوئی چیز ہے تو ہو سکتا ہے ہمارے پیچھے پڑ جائے، ہمیں چوکنار ہونا ہوگا۔“ شبیر نے کہا۔

”وہ باتیں کرتے رہے جاگتے رہے، ڈر اور خوف کے عالم میں بھلا نیند کیسے آتی ہے۔ وہ جاگتے رہے اور صبح ہوگی۔

وہ سب حیدر کی پراسرار گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھے۔ ناشتہ بھی نہ کیا۔ سامان سمیٹ کر واپسی کے راستے پر چل دیئے، رات بھر ہونے والی برف باری نے قدموں کے نشان مٹا دیئے تھے۔

اچانک ایک غار کے دہانے کے پاس سے گزرتے ہوئے شبیر رک گیا۔ ”اس غار کو بھی دیکھتے چلتے ہیں۔“ وہ غار میں داخل ہو گیا۔

”دیکھو شبیر تمہاری تجسس کی عادت کے ہاتھوں پہلے ہی حیدر کی صورت میں نقصان ہو چکا ہے۔ چھوڑو غار کو واپس چلو۔“ وکی اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔

”ارے یہ دیکھو حیدر کا موبائل فون۔“ شبیر چیختے ہوئے بولا اور ایک طرف پڑا موبائل اٹھالیا۔ وہ غور سے موبائل کو دیکھنے لگے وہ واقعی حیدر کا موبائل تھا۔

”میری مانو تو آگے مت جاؤ ہمارے پاس کسی قسم کا ہتھیار بھی نہیں یہ نہ ہو کہ ہم خطرے میں گھر جائیں۔“ وکی کے لہجے میں تشویش تھی۔

”تو کیا ہم حیدر کو بھول کر یہاں سے لوٹ جائیں، ایک جیتا جاگتا انسان ہمارے درمیان سے غائب ہو گیا وہ ہمارا دوست تھا، ہم واپس لوٹ کر اس

کے گھر والوں کو کیا جواب دیں گے۔“ شبیر جذباتی ہو گیا اور اپنے بیک کی زپ کھول کر تیز و تیز نکال لیا۔ ”تم بھی اپنے بیک سے خنجر نکال لو، اس وقت ہم سوئے ہوئے تھے اس لئے وہ حیدر کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا اب جاگتے ہوئے دن کی روشنی میں ہم پر قابو پانا آسان نہیں ہم دوسروں ہیں ہمارے پاس خنجر موجود ہیں۔“ شبیر پر عزم لہجے میں بولا۔

غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ وہ چلتے رہے غار شیطان کی آنت کی طرح لمبا تھا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اب تک ان کے سامنے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کافی آگے جانے کے بعد اندھیرا ہونے لگا انہوں نے اپنی ٹارچیں روشن کر لیں۔

اچانک شازیہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ انہوں نے اپنی ٹارچوں کا رخ اس کی طرف کیا تو ڈر کے مارے انہیں سینے میں اپنا سانس رکھا ہوا محسوس ہوا۔ نیچے حیدر کی ادھڑی ہوئی لاش موجود تھی۔ اس کا سینا اس بری طرح لومبز ہوا تھا کہ لگتا تھا کسی خونخوار درند نے اسے اپنے پنچوں سے اڑھڑا ہوا، شہرہ رنگ کی ہوئی تھی۔

مہوش اور شازیہ خوف سے چیختے لگیں۔ شازیہ کے ہاتھ اور کپڑے حیدر کی لاش پر گرنے سے خون میں لت پت ہو چکے تھے۔

”شبیر اب بھی وقت ہے، ہمیں سے واپس لوٹ جاتے ہیں یہ بہت خطرناک جگہ ہے، اس غار کا خاتمہ ہو ہی نہیں رہا۔ نہ جانے یہ کتنا لمبا غار ہے، اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے۔“ وکی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

حیدر کی خونچکاں لاش دیکھ کر شبیر بھی ڈر چکا تھا۔ اس نے اس بار کوئی اعتراض نہ کیا اور واپس غار کے دہانے کی طرف پلٹ پڑے۔ شازیہ اور مہوش کے پیچھے وکی چل رہا تھا۔ سب سے پیچھے شبیر ہاتھ میں خنجر تھامے چل رہا تھا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ دھب کی آواز سنائی دی، یوں لگا جیسے کسی نے چھلانگ لگائی ہو، اور ساتھ ہی شبیر کی ولد کو چیخ سنائی دی، وہ تینوں تیزی سے

پلٹے اور خوف سے ان کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔
وہی بھیاں لاش جس کا جسم شبیر نے برف کے نیچے سے نکالا تھا۔ شبیر کو دو بچے ہوئے تھے۔ وکی کی ٹارچ کی روشنی لاش کے چہرے پر پڑی تو اس نے اپنا جلا ہوا خونخاک چہرہ اوپر کر کے اٹھائی آنکھ سے انہیں گھورا۔ وہ چیختے ہوئے غار کے دہانے کی طرف بھاگے۔ خونی لاش نے اچانک اپنے درانی نما ناخنوں سے شبیر کا سینا اور میٹر ڈالا، یہ دل دہلا دینے والا لرزہ خیز منظر تھا۔ وہ تینوں چیختے ہوئے غار سے باہر نکل آئے۔ ڈر اور خوف سے ان کے بیک ہاتھوں سے چھوٹ کر غار میں ہی گر چکے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے اس وقت کو کوکس رہے تھے جب انہوں نے اس پہاڑ پر آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ رک گئے۔ آگے راستہ نہا ہوا تھا۔ ان کے ارد گرد خطرناک قسم کی کھائیاں تھیں کہ پانی کا سامان بیگیوں سمیت غار میں رہ گیا تھا لہذا وہ محتاط انداز سے آگے بڑھنے لگے۔

انہیں چلتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اب بھی وہ کافی بلندی پر تھے۔ خونی لاش کے خوف سے وہ بار کے چلتے رہے۔

اچانک انہیں اپنے پیچھے کسی کے غرانے کی آواز سنائی دی مڑ کر دیکھا تو وہی خونی لاش ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

اسی وقت مہوش کی چیخ سنائی دی، پلٹ کر دیکھا تو وہ لاش مہوش کو دو بچے چکی تھی، وہ مہوش کو بھول کر چیختے ہوئے ایک طرف بھاگے۔ وکی کے ہاتھوں سے خنجر چھوٹ کر گر چکا تھا۔ شازیہ کافی دور آنے کے باوجود خوف سے چیخ رہی تھی۔

خونی لاش ان کے سامنے تعین انسانی زندگیوں کے چراغ گل کر چکی تھی۔ انہیں نشیب میں اپنی ہائی کلس تک پہنچنے کے لئے کافی وقت چاہئے تھا۔ ان کے ذرا نیور کی قسمت اچھی تھی جو اس نے ان کے ساتھ اس برفانی پہاڑی پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ گاڑی میں کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا سامان وافر مقدار میں تھا اس

لئے وہ مطمئن سا دہن رہ گیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ ٹھکن سے چر ہوئے تو ایک جگہ بیٹھ کر پانی پئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اٹھ کر چلے گئے۔

اچانک انہیں رکنا پڑا آگے بہت بڑی کھائی تھی۔ جسے بار کرنے کے لئے کوہ پانی کا سامان ضروری تھا۔ اگر کھائی سے پتہ چلتا تو ہوتا تو انہیں طویل چکر کاٹنا پڑتا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں انہیں اپنے پیچھے غراہٹ سنا دی مڑ کر دیکھا تو خوف سے انہیں بدن سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ ان کے پیچھے وہی خوفناک لاش کھڑی اپنی اگلی آٹھ سے انہیں گھور رہی تھی۔ ان کے سامنے خطرناک جھوٹن تھی، آگے کھائی اور پیچھے خوفناک موت وہ خوفزدہ نظروں سے لاش کو دیکھنے لگے۔ لاش نے جھپٹا مارا اور وہی کو دیوچ لیا۔ شازئیہ کی نگاہوں کے سامنے خوفناک لاش نے اپنے درستی نما لبے ناخنوں سے وہی کی شہرہ رگ اور میز ڈالی، وہی کا جسم اس کے بازوؤں میں ترپنے کے بعد سارکت ہو گیا۔ اس نے وہی کی لاش ایک طرف پھینکی اور شازئیہ کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ کہتے کے عالم میں کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ خوفناک لاش نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اچانک وہ پیچھے کی طرف لڑکھائی اور شازئیہ کے گلے میں پڑے لاکٹ کو گھورنے لگی۔ ”لڑکی یہ لاکٹ اتار دے۔“ خوفناک لاش نے کھر کھاتی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ دیکھ کر شازئیہ کا حوصلہ بڑھا کر لاش اس کے گلے میں پڑے لاکٹ سے خائف ہے۔ ”تم کون ہو اور تمہاری دم سے کیا دشمنی ہے؟“ شازئیہ نے است کر کے اس سے پوچھا۔

”میں اس پورے علاقے کا طاقتور ترین خان شے ہوں۔ میری ہر انسان سے دشمنی ہے۔ میں اس علاقے سے انسانوں کا خاتمہ کر رہی ہوں گا۔“ خوفناک لاش نے غیر انسانی آواز میں قہقہہ لگایا۔ ”خان شے کا کیا مطلب ہے؟“ شازئیہ نے پوچھا۔

”چلو مرنے سے پہلے میری کہانی سن لو۔ پھر

تجھے یہ لاکٹ گلے سے اتارنا پڑے گا۔ میرا تعلق ایک دین دار گھرانے سے تھا۔ میں اپنے والدین کی اگلی اولاد تھا۔ میں نے غربت اور تنگ دستی کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ میں اپنے باپ کی طرح صابر اور شاکر رہا تھا۔ میں راتوں رات امیر بننا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، میں نے جوان ہوتے ہی بمبکان شروع کر دیا۔ میری تلاش تھی دولت میں کسی کالے علم کے ماہر کی تلاش میں جنہوں کی خاک چھاننا رہا۔ ایک روز علاقے میں ایک عمارت دیکھی جس کے بیرونی دروازے پر عجیب قسم کی عبارت درج تھی۔ ”قسمت بدلنے کے لئے اندر تشریف لائیں۔“ میں بلا جھجک اندر جا گھسا۔ کوئی دوسرے گزرا تو آئے سامنے دو کمرے دکھائی دیے۔ ایک کمرے کے دروازے کے قریب تختی آویزاں تھی۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے شارٹ کٹ راستہ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ ”اندرا جاؤ۔“

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میز کے پیچھے کرسی پر ایک عجیب سا شخص بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سانپ کی طرح چمک رہی تھیں اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ارشاد احمد۔“

”اچھا تو تم مسلمان ہو، لیکن شارٹ کٹ سے دولت حاصل کرنے کے لئے میری کچھ باتیں ماننی ہوں گی۔“

”میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“

”سب سے پہلے یہ بیو۔“ اس نے شراب کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے بنا سوچے کچھ شراب اس کے ہاتھوں سے لی اور پی گیا۔ ”بہت خوب“ وہ خوش ہو گیا۔ ”سنو ابھی کچھ دیر بعد اس کمرے میں ایک لڑکی آئے گی تم نے اس کی عزت تار تار کرنی ہے۔“ اس نے دوسرا گلاس میرا شراب کاٹھ جھپٹا کر اٹھانے ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد واقعی ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوئی، اس شخص کے اشارے پر میں نے اسے

دھجک لیا اور اس کے سامنے اس لڑکی کو روند ڈالا۔ لڑکی ہنج چلائی رہی۔ ”اب اسے ذبح کر ڈالو۔“ اس نے ایک تیز و کار خنجر میری سمت پھینکا میں نے اس ہارس کا غم ہانے میں تامل کیا تو وہ چلا۔ ”جلدی کرو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“

میں نے خنجر اٹھا کر روٹی بلکتی لڑکی کو ذبح کر ڈالا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لڑکی کی گردن سے بہنے والا خون فرش پر گرنے کے بجائے غائب ہو رہا تھا۔

”شبابش اب مجھے سمجھ کرو۔“ دولت کی لالچ اس قدر مجھ پر حاوی ہو چکی تھی کہ میں نے اسے سمجھ کر ڈالا۔ ”آج سے تمہارا نام خان شے ہے، یہ انگوٹھی بہن لو۔“ اس نے ایک انگوٹھی میری طرف بڑھائی اور میں نے اسے پہن لیا۔

”تمہاری زندگی بدل چکی ہے۔ اب تم نے روزانہ ایک نو جوان لڑکی کا قتل کرتا ہے جس کا خون شاکلی بننے کی تمہاری طاقت بڑھتی جائے گی ایک بات کا خیال رکھنا اس انگوٹھی کو کسی پانی نہ لگنے پائے۔ اور خیال رکھنا کبھی بھی کوئی نیک کام مت کرنا۔ شاکلی تمہیں مال مال کر دے گی، جب تک یہ انگوٹھی تمہاری انگلی میں رہے گی وہ تمہاری مددگار رہے گی۔“

”آپ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ میں شیطان ہوں اب تم میرے چلے ہو اور تمہارا نام اب خان شے ہے۔“

”خان شے کا کیا مطلب ہے؟“

خان شے کو اٹ کر پڑھو تو لفظ شیطان بنتا ہے۔ دوسرے کہنے پر چلا ہے۔ وہ بھی شیطان کہلاتا ہے۔

”اب تم جاؤ۔“

میں اس کے حکم پر کمرے سے باہر نکل گیا۔ گھر پہنچا تو کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ماں سے کھانا مانگا تو وہ بولی۔ ”کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں۔“ میں غصے سے کھول کر رہ گیا اور گھر سے دوبارہ باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ راستے میں ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی انہا کو غور سے دیکھا تو سونے کی اینٹ تھی، جس کا وزن کم

ویش ایک کلو تھا انیس سو سیٹھ 1965ء کا دور تھا اس کے باوجود سونے کی اچھی خاصی رقم مل گئی۔ میں نے اپنے لئے اور اپنے والدین کے لئے اچھے اچھے مہنگے کپڑے خریدے، بازار سے کھانے پینے کی اشیاء سے لدا پھدا گھر پہنچا تو والدین حیران رہ گئے۔ میں نے بھانہ بنا کر کہا۔ ”میری لائری نکلی ہے۔“ میرے سیدھے سادھے والدین مجھے سمجھتے دیکھ گئے کہ لائری کا پیر حرام ہے وہ اس چپے کی کوئی چیز نہیں کھائیں گے، میں نے انہیں دل ہی دل میں کوسا۔

دوسرے روز میں شیطان سے کیا گیا وعدہ بھول گیا رات کو ایک خوب صورت لڑکی نے مجھے چمکایا۔ ”اشو جلدی سے میرے لئے خون کا بندوبست کرو تم نے اپنے آقا سے وعدہ کیا تھا۔“ اس کی بات سن کر میں گھبرا گیا، گویا یہ وہی شاکلی تھی جس کا ذکر شیطان نے کیا تھا۔

میں دیوار پھلانگ کر اپنے پڑوس میں واقع ماموں کے گھر میں داخل ہو گیا۔ میری ماموں زاد جیل جو کہ میری مکتبہ تھی اس کے کمرے میں گھس کر اس کی شہرہ رگ خنجر سے کاٹ ڈالی۔ وہ گہری نیند میں مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ اس کا خون بہنے کے بجائے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ میں وہاں سے لوٹ آیا۔ دوسرے روز ان کے گھر کھرام مچا ہوا تھا۔ میرے دل میں چور تھا اس لئے دھڑکا لگا رہا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اب میرا خون تو مکمل بڑھتا جا رہا تھا۔

اور ساتھ ہی میرے پاس دولت دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شہر کے ایک پوش علاقے میں ایک الگ تھلک بنگلے لے کر وہاں شفٹ ہو گیا۔ ماں باپ اور دیگر خونی رشتوں کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔

شاکلی دیوی نام کی پراسرار عورت نے مجھے خبردار کیا ہوا تھا کہ شیطان کی دی ہوئی انگوٹھی کو سوائے کبھی نہ ہانے کے وقت کے کبھی اپنی انگلی سے نہ اتارو ورنہ اس کا اور میرا ساتھ جھوٹ جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ انگوٹھی کو پانی کا لگنا میرے لئے نقصان دہ ہے۔ ویسے بھی

میرے لئے خون کا بندہ بست کر دو، مجھے پیاس لگی ہے، یہ نہ ہو کہ مجھے تمہارے ہی خون سے پیاس بجھانی پڑے۔“
مجھے چہرے پر جلن ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا جتے ہوئے بولا اور اس نے مجھ پر کچھ بڑھ کر پھونکا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے زخموں میں جلن ختم ہو گئی ہو۔

بزرگ نے سزا کے طور پر میرا چہرہ جلا ڈالا تھا۔ میری ایک آنکھ بھی خالص ہو چکی تھی۔ ہمت کر کے کچھ فاصلے پر واقع ایک حویلی میں جا کھسا۔ پہلے کمرے میں جاتے ہی میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کمرے میں ایک نوجوان لڑکی بے خبر سو رہی تھی۔ میں دبے قدموں اس کے پیٹ کے قریب جا پہنچا۔

اچانک نہ جانے کیوں اس لڑکی کی آنکھ کھل گئی، میرے ہمسایہ چہرے پر نظر پڑے ہی وہ خوف سے چیخ پڑی، میں نے اسے دبوچ کر اس کی شہرہ رگ پر بھر پھیر دیا۔ اس کی چیخ سن کر اس کے گھر والے جاگ پڑے۔ راہداری میں سے کسی عورت کے چمکنے کی آواز سنائی دی۔ ”مسند رحیم، بہن کو دیکھو اس کی چیخ سنائی دی ہے۔“ میں کمرے سے نکل کر بھاگا، ایک کمرے سے نکلنے والا نوجوان مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے اپنا گھٹنا میرے پیٹ میں مارا تو میں کراہ کر جھکا اور میں بھاگ نکلا، چیخ دیکار سے وہاں کے رہائشی جاگ اٹھے تھے، میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ چونکہ سب کی نظروں میں آ چکا تھا۔ اس لئے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا۔ میں نے کافی عرصہ شیطان کی پوجا کی۔ مختلف کالے جادو کے چلے کائے۔ اب میں طاقتور ہو چکا تھا۔ شیطان طاقتیں میرا ساتھ دے رہی تھیں۔

ان ہی دنوں میں نے شیطان کے کہنے پر بیشہ کے لئے امر ہونے کے لئے عمل شروع کیا۔ میں اس کے حکم پر برافانی پہاڑ کے اس غار میں کل کرنے لگا، جہاں میں نے تمہارے ساتھیوں کو مارا تھا، یہ عمل طویل مدت کا تھا، عمل کے خاتمے میں ایک روز رہتا تھا۔ میرا بدن کافی غلیظ ہو چکا تھا۔ کافی عرصہ سے نہایا نہیں تھا، بدن سے بدبو آنے لگی تھی، میل کی چمیں جسم پر جمی ہوئی تھیں، میں

نے شیطان کی دی ہوئی انگلی پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈالی اور نہانے کے لئے چشمے پر جا پہنچا۔ میں نے لنگوٹ باندھ رکھی تھی، لباس ایک طرف رکھا ہوا تھا، میں نہانے میں مصروف ہو گیا۔

اسی وقت کسی کی لٹکار سنائی دی۔ میں نے نہاتے ہوئے لپٹ کر دو کھٹا تو اپنی آنکھ پر یقین نہیں ہوا، وہی نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا، جس کی بہن کو میں نے ذبح کیا تھا اور شور مچانے پر بھاگ نکلا تھا۔

”تم یہاں کیسے پہنچے؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں مسند رحیم، بہن کا بدلہ لینے کے لئے تجھے ڈھونڈتا پھر رہا تھا، اسی دوران میری ملاقات بابا نور جلال سے ہوئی۔ انہوں نے میری مدد کی اور تیری اس پناہ گاہ کے بارے میں بتایا، انہیں یہ غرض تھا کہ تو اس عمل میں کامیاب ہوتے ہی انسانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ دے گا۔“

میں نے اپنے جادو کے کئی دواں پر آزمائے مگر ناکام رہا۔ اس نے بابا نور جلال کا دیا ہوا لاکھ بھین رکھا تھا۔ جس پر قرآنی آیت نقش تھی۔ میں اپنے لباس کی طرف بھاگا، میرا ارادہ انگلی نکال کر پہننے کا تھا مگر اس نے اپنے ہولسٹر سے پستول نکال کر مجھ پر فائر کر دیا۔ کوئی میرے سینے میں بیوست ہو گئی۔ میں چیختا ہوا اپنے لباس پر گرا اور ہوش کھو بیٹھا۔

سالوں بیت گئے اس دوران ہونے والی برف باری سے میں برف میں دفن ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی سال بعد تم لوگ یہاں گھومنے آئے، اس دوران تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے، میرے جسم کا کچھ حصہ ظاہر ہو گیا، جسے تمہارے ساتھی نے دیکھ لیا اور مجھے برف سے باہر نکالا اس کی سب سے بڑی بیوقوفی مجھے انگلی پہننا تھی۔

اس انگلی کی پراسرار قوت سے میں دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اب تیرے مرنے کی بات ہے۔ یہ لاکھ اتار دے دہرایا۔

”میں بیوقوف نہیں جوتہماری باتوں میں آ جاؤں تم خود ہی اسے اتار دو۔“ وہ بولی اور طمان شے بے ہوش

میں بیہوش ابند نہا تھا۔ شاکالی مجھے کالا جادو بھی سکھائی تھی۔ کالے جادو کے حامل صفائی اور پاکیزگی سے دور رہتے ہیں۔

مجھے شاکالی کے لئے روزانہ رات کو نوجوان لڑکی کے خون کا بندہ بست کرنا پڑتا تھا۔ اب تو میں بھی انسانی خون کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک روز نصف شب کے بعد میں دیوار پھلانگ کر ایک گھر میں داخل ہوا، وہ چھوٹا سا مکان تھا جس کے خستہ حال دروازے گھر کے کینوں کی منگنی کی داستان حیات سنار ہے تھے۔ چھوٹے سے صحن میں ایک طرف گائے بندھی ہوئی تھی، بائیں سمت دو کمرے بنے ہوئے تھے اس پر دروازوں کے بجائے پوند زدہ پردے لٹک رہے تھے، میں نے ایک کمرے کا پردہ ہٹا کر دیکھا اس کمرے میں دو چار پائیاں چھپی ہوئی تھیں، جن پر ایک بزرگ جوڑا خوب تھا، لال شین کی بجلی زرد روشنی میں بزرگ کا نورانی چہرہ جھلک رہا تھا، دودھ کی طرح سفید داڑھی ان کے چہرے پر بہت بھلی لٹک رہی تھی، جسمانی طور پر وہ دبے پتلے اور دراز قد تھے۔ دوسری چار پائی پر درمیانے قد و قامت کی بزرگ خاتون سو رہی تھیں۔ اس کمرے میں میرے مطلب کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں مایوس ہو گیا۔ وہ دن میرے لئے اچھا ثابت نہیں ہوا تھا اس سے پہلے بھی دو گھر دن میں مجھے ناکائی کا سامنا کرنا پڑا تھا اگر میں شاکالی کو سمجھتا چڑھانے میں ناکام رہتا تو میرا انجام برا ہوتا۔

شاید دوسرے کمرے میں میری امید برآئے یہ سوچ کر میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا پردہ ہٹاتے ہی یوں لگا جیسے اس کمرے میں چار پائی پر لیٹا دجود کوئی انسان نہیں بلکہ لاف سلی کی داستان کی پری ہو۔ میں بے خود سا اس کے بستر کے قریب جا پہنچا۔ پٹلی سے بندھا خنجر نکال کر ہاتھ میں لیا اور اس پر جھکنا چاہا۔

اسی وقت ایک بھاری بھر کم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”ناہجار تیری ہمت کیسے ہوئی، اپنے ناپاک وجود کے ساتھ اس گھر میں گھسنے کی۔“ میں بے اختیار پلٹا دو بے پستے بزرگ اپنی جلالی

نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے، میں خنجر تھامے خطرناک ارادے سے ان کی طرف بڑھا، انہوں نے کچھ بڑھ کر مجھ پر پھونکا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے ہوں، مجھے اپنے چہرے پر شدید قسم کی جلن محسوس ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا کہ میرے چہرے پر پیڑوں ڈال کر آگ لگادی گئی ہو، میں تکلیف کی شدت سے چیختے لگا۔ ایک آنکھ سے دکھائی دینا بھی بند ہو چکا تھا۔ میں لمبے چلنے کے قابل بھی نہ تھا۔

”ملعون تو نے شیطان کا پیروکار بن کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے اس فانی دنیا کی چند روزہ زندگی عیش و عشرت سے گزارنے کے چکر میں تو آخرت کی بیٹھکی کی زندگی فراموش کر بیٹھا۔ یہ نور جلال کا گھر ہے۔ جو خود کو اور اپنے گھر والوں کو اللہ کے حوالے کر کے سوتا ہے، کیا تو نے کبھی سوچا ہے، مرنے کے بعد اللہ کو کیا جواب دے گا۔“

نور جلال بولتے ہوئے چند لمحوں کے لئے رکے، اس شور شرابے میں چار پائی پر دراز حسین لڑکی جاگ کر وہاں سے دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ ”دیکھو مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ گھر نورانی علقی والے کا ہے، رہی بات مر مر کہ جینے کی تو مجھے اس پر یقین نہیں، بھلا کوئی مرنے کے بعد بھی زندہ ہوا ہے۔ مجھے تمہاری طرح زندگی بسر کرنے کا کوئی شوق نہیں بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، سسک سسک کر جیو۔“ میں زہر خند لہجے میں بولا۔

”لگتا ہے تیرے دل پر ہر لگ چکی ہے، میں تجھے چھوڑ تو رہا ہوں لیکن ساتھ میں تنہی بھی کر رہا ہوں، دوبارہ بھولے سے بھی اوھر کا رخ مت کرنا، شیطانی حرکتیں چھوڑ دے، اللہ کی لاشی بے آواز ہے۔“ انہوں نے کہا اور مجھ پر کچھ بڑھ کر پھونکا۔

میں جیسے ہی لمبے چلنے کے قابل ہوا تو وہاں سے بھاگ نکلا۔

کچھ ہی دور گیا تھا کہ شاکالی میرے سامنے ظاہر ہو گئی۔ وہ سخت غصے میں معلوم ہو رہی تھی۔ ”تمہیں کس نے کہا تھا نورانی علقی والے کے گھر میں گھسو۔ جلدی سے

سے اسے دیکھنے کو قرآنی آیات پڑھتی ہوئی راستہ بدل کر خبیث کی طرف پڑھی۔

خوبی لاش کافی دیر تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔ چیخ کر وہ اسے لاکھ اتارنے کو کہتا رہا مگر وہ گرتی پڑتی چلتی رہی۔ مایوس ہو کر طمان شے نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

کئی گھنٹوں بعد جب وہ اپنی گاڑی تک پہنچی تو تسکین سے اس کا برا حال تھا۔ ڈرائیور اسے تپتا آتے دیکھ کر چونک پڑا۔ ”آپ کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا تو شازیہ نے روتے ہوئے اسے پہاڑ پر پیش آنے والے سارے واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ سخت خوفزدہ حالت میں وہاں سے نکلے۔

رات گئے شہری حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ”گٹکا ہے فیول ختم ہو چکا ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”اب کیا ہوگا؟“ شازیہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”ہو سکتا ہے شاید کسی گاڑی سے لفٹ مل جائے۔“ اسی وقت دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں، سامنے سے کوئی گاڑی آ رہی تھی۔ ڈرائیور بولا۔

”نیچے اتریں ان سے لفٹ لیتے ہیں۔“ وہ دونوں گاڑی سے اترے کچھ دیر بعد گاڑی نزدیک آ گئی۔

ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ سیاہ رنگ کی ایک بڑی سی جیپ تھی۔ جس میں ڈرائیور سمیت چار افراد سوار تھے۔ تیز رفتار جیپ کے بریک چرچائے اور وہ ان کے قریب رک گئی۔

”بیتا ہمیں لفٹ چاہئے۔“ ڈرائیور بولا۔

”لفٹ تو مل جائے گی پر تمہیں نہیں اسے۔“

ایک موٹا سا شخص بستا ہوا جیپ سے اترا اور شازیہ کی طرف بڑھا۔ ”رک جاؤ خبیث۔“ ڈرائیور نے اسے روکنا چاہیجپ میں بیٹھے افراد میں سے ایک نے اپنے ہولشیر سے ریوالتور نکالا اور ٹیکہ دیا دیا۔ گولی ڈرائیور کے

سینے میں لگی۔ وہ چیخا ہوا سر تک پرگرا اور رتنے لگا۔ مرنے شخص نے خوفزدہ شازیہ کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ شازیہ چیختے چلاتے ہوئے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ اس نے شازیہ کو اٹھا کر جیپ کی کچل نشست پر بٹھا۔ ”نامر اسے سنبھالو۔ اور اپنے ٹھکانے پر لے چلو۔“

جیپ کی کچلی نشست پر موجود دو افراد نے اسے دبوچ لیا۔ وہ بے بسی سے ان کی گرفت میں جکڑ رہی تھی۔ اس پر وہی مثال صادق آ رہی تھی۔ آسمان سے گرا سمجھور میں اٹکا۔ وہ طمان شے کے ہاتھوں سے بچ کر ان لبروں کے ہتھے چاڑھی تھی، جو نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

☆.....☆.....☆

مشل اس تپتا کمرے میں بندھی پڑی تھی۔

ساحل کو بے ہوشی کی حالت میں لے جایا گیا تھا۔ اسے ساحل کی سلامتی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ شہر واپس لوٹنے کے بعد نجانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ اس کے لئے مزاحمت کرنا بھی ناممکن تھا۔

دونوں ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے تھے۔ پاؤں بھی مضبوطی سے بندھے تھے۔ اسے معلوم تھا اس وقت عمارت میں راشد نام کا آدی تنہا موجود ہے۔ اگر وہ

بندھی ہوئی نہ ہوتی تو اس اکیلے آدی پر قابو پانا اس کے لئے ناممکن نہ تھا۔ کچھ دیر ایسی طرح پڑے رہنے کے بعد وہ بمشکل کھینچی ہوئی باہر سے لاک دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے اس طرح آگے بڑھنے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ دروازے پر جا پہنچی۔

اس نے بندھے ہوئے پاؤں زور زور سے ٹکڑی کے دروازے پر مارنے شروع کیے اور ساتھ ہی ساتھ

چلائی جا رہی تھی۔ ”کوئی ہے؟“ کچھ دیر بعد دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ٹھک

کر دروازے سے کچھ دور ہو گئی۔ قدموں کی چاپ دروازے پر آ کر رک گئی۔ کی ہول میں چابی کھوی اور

دروازہ کھلا۔ گرائڈ مل راشد راتقل کندھے پر لٹکائے

اس کے قریب آ کر رک گیا۔

”کیا تکلیف ہے؟“ کس لئے شور مچا رہی ہو؟“

”زی میرے ہاتھوں اور پاؤں میں اس قدر سختی سے بندھی ہے کہ مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے پلیز! مجھے کھول دو۔“ وہ التجائے لہجے میں بولی۔

”تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے جو میں تمہیں کھول دوں۔“

”تم شکل صورت اور دل کے مجھے دکھائی دیتے ہو اور کافی ہنڈ سم بھی ہو، یقیناً جانو میں تمہاری دجاہت سے سخت متاثر ہوں۔ ویسے بھی میں ایک لڑکی ہوں ہاتھ پاؤں آزاد ہونے کے بعد تمہارا کیا کیا کر سکتی ہوں۔“

اس کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”نف ہے تمہاری مردانگی پر مرد ہو کر ایک نہتی لڑکی سے ذرتے ہو۔“ مشل نے اس پر طنز کیا۔

عورت اگر کسی مرد پر نظر کرے تو وہ ہوش کھو بیٹھتا ہے کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا۔ ”میں بڑے بڑے شیروں سے نہیں ڈرتا پھر تم تو ایک معمولی سی لڑکی ہو۔“ اس نے مشل کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے، وہ

بشمثل اپنے پاؤں پر کھڑی ہو پائی، کافی دیر سی سے بندھے ہونے کی وجہ سے اسے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ کمرے میں چھل قدی کرنے لگی۔ راشد وہ چکی

سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ چکی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد وہ راشد کے سامنے کھڑی

ہو گئی۔ راشد نے اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہی

تھے کہ اس کی نظروں کے سامنے بجلی کی کوندی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور اس کی لنگ پوری قوت سے راشد کی

کھنٹی پر پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے نظر آنے لگے۔ انہی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ فرٹ

لنگ اس کے سینے پر پڑی تو وہ الٹ کر گرا، اگر تے ہی

جیسے ہی اٹھا۔ ایک زوردار ٹک اس کے جڑے پر پڑا اور

کی ایک کھنٹی لہر اس کے تن بدن میں بھگری۔ اس نے کندھے سے راتقل اتار کر سیدی کرنا چاہی، مشل نے ایک پاؤں پر کھوم کر زوردار لنگ اس کے راتقل والے

ہاتھ پر ماری، راتقل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور

جا گری۔ مشل کو قریب پا کر اس نے مشل کے چہرے پر

کھ مارا مشل نے ایک طرف جھکا دی دے کر خود کو بچایا

اور اچھل کر اپنی دھننی گھنٹی کا وار اس کے سر پر کیا۔ راشد

کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ دھڑام سے منہ کے بل

کمرے کے فرش پر جا گرا۔ نیچے گرتے ہی مشل کی

ٹانگ پکڑ کر کھینٹ لی۔ مشل نے تیزی سے اپنا چہرہ

فرش پر گھٹنے سے بچایا۔ ورنہ وہ جس تیزی سے گری تھی

اس کے چند دانت لازمی ٹوٹ جاتے۔ مشل نے ٹانگ

جھٹکی مگر راشد کی گرفت مضبوطی تھی۔ مشل نے کروٹ لی

اور اس کے اوپر سوار ہو گئی اور زوردار کھنڈ اس کی ناک

پر مارا، راشد کی ناک خون آلود ہو گئی مگر اس کے باوجود

بھی اس نے اس کی ٹانگ نہ چھوڑی بلکہ اسے ایک

طرف جھٹک کر برق رفتاری سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے

ہاتھ میں پکڑا ہوا اس کا پاؤں مروڑ دیا۔ مشل کے جسم میں

تکلیف کی ایک لہریں دوڑ گئی وہ اگرچہ مارشل آرٹ کی

ماہر تھی، مگر جسمانی طاقت میں کم تر تھی راشد سے۔

رات کے اس سے اتنی سندر تھی، اس کھنڈر فیکٹری میں کہاں سے آگئی؟“ فرخ کٹ والے نے اپنے سامھی کو آنکھ مار کر کہا۔

”آنند لگتا ہے بھگوان ہم سے خوش ہے۔“ موہن بھونڈی آواز میں ہنستے ہوئے بولا اور مثل کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ مثل نے اس کی ناک پر بائیں ہاتھ سے گھونسا مارا۔ موہن پیچھے کی طرف لڑکھایا، اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ آگئی وہ سنبلابھی نہ تھا کہ جب فرسٹ کلب اس کے چہرے پر بڑی مدد الٹ کر گر آئے۔ آنند غضب ناک ہو کر مثل کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس نے اچھل کر فٹبالنگ کلب ماری وہ اچھل کر کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور اس تیزی سے واپس آیا جیسے اس کے جسم میں اسپرنگ لگے ہوں۔ مثل پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ اچھل کر جب سائیڈ کلب اس کے سینے پر ماری وہ پشت کے بل فرش پر جا گرا، اوپر آند بھرتی سے اٹھ کر اس کی طرف لپکا۔ مثل اس وقت کھلی بنی ہوئی تھی۔

پے در پے چار پانچ کلب اس کے جسم پر رسید کی۔ وہ دونوں ٹی کر اس کو فرش میں تے کہ کسی طرح مثل ان کے ہاتھ آ جائے مگر اس نے ان کی یہ کوشش ناکام بناتے ہوئے گھونٹوں اور لٹاؤں سے ان کی خاطر تواضع جاری رکھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی کے ہاتھوں بیٹے جارہے ہیں تو آنند نے اپنی پٹلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکال لیا جبکہ موہن نے اپنے ہوسٹر سے پھل نکال کر اس کا رخ مثل کی طرف کر دیا۔

”بس اب اپنی اچھل کو بند کر، ورنہ اس مثل کی ساری گولیاں تیرے جسم میں اتار دوں گا۔“ اسی وقت دروازے کی طرف سے ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”یہ فاول ہے کچھ تو شرم کرو تم دو سر، ایک ہمتی لڑکی سے پٹ رہے ہو اور اب اس کے مقابلے میں ہتھیار نکال لئے، پھینکنا نہیں اور مردانہ وار لڑو، ورنہ میں خود تمہیں گولی مار دوں گا۔“ تینوں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر لہاڑا کا درزشی جسم کا مالک ادھر مڑ کر ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں جدید رائفل اٹھا رکھی تھی۔ جس کی نال کا رخ ان

کی طرف تھا۔

”باس آپ۔“ ان دونوں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں میں تم نے سنا نہیں اپنے ہتھیار پھینک کر اس لڑکی کا مقابلہ کرو۔“ وہ غریب۔ ان دونوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی دونوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے اور ایک ساتھ ہی مثل پر چھلانگ لگا دی۔ مثل نے فٹبال بازی کھائی اور کھلی کی طرح لہرا کر فضا میں غوطہ کھایا اور ان کے درمیان سے نکل گئی، رائفل بر دار باس نے رائفل کندھے سے لٹکائی اور بے اختیار تالیاں بجانے لگا۔ ”دھول خوش کرو یا شیر کی بچی۔“ وہ باس کی آواز سن کر دونوں جوش میں آ گئے مگر کھلی بنی مثل کو ہاتھ بھی نہ لگا سکے جبکہ وہ ان دونوں کی دل بھر کر ٹھکانی لگا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں خند پر پڑنے والی مار کی وجہ سے بری طرح پھل رہے تھے۔

باس نے اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف کر کے لڑکر دیا۔ پے در پے دو فائر ہوئے۔ اس کا نشانہ غضب کا تھا۔ گولیاں دونوں کے سروں میں پیوست ہو گئیں۔ ”یہ آپ نے کیا کیا، یہ تو آپ کے سامھی معلوم ہوتے ہیں۔“ مثل جبران تھی۔

”جس طرح لوگ دشمنی گھوڑوں کو گولیاں مار دیتے ہیں اس طرح میں کمزور انسانوں کو مار ڈالتا ہوں۔“ وہ مسفاک لہجہ میں بولا اور مثل کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم رات کے اس پہر اس ویران عمارت میں کیوں داخل ہوئی تھیں؟“

مثل نے اس کے پوچھنے پر اپنی روداد سنائی ڈالی۔ ”اوہ تو سڑک پر کھڑی پولیس جیپ تم نے کر بھاگی تھی۔ میں تمہاری بہادری سے متاثر ہوا ہوں، چلو میرے ساتھ میرے ٹھکانے پر۔“ وہ اپنی رائفل کا رخ مثل کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ وہ بے بسی اور لا چاری سے اسے دیکھنے لگی۔ رائفل کے سامنے حراست بے کار تھی۔ بہتر یہی تھا کہ بے چوں چراں اس کے ساتھ چلی جاتی۔

واؤچ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

درو کی شدت سے اس کے دماغ میں وحشی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنی دوسری ٹانگ کو اٹھایا اور ایک زوردار لٹ راشدی ناف کے نیچے ٹانگوں کے درمیان ماری، جسم کے ٹانگ ترین حصے پر چوٹ لگتے ہی راشد کے حلق سے چیخ نکلی، اس نے مثل کی ٹانگ چھوڑ دی اور کوع کے بل جھک گیا وہ بری طرح تڑپ رہا تھا جبکہ مثل اس کی گرفت سے نکلنے کے باوجود کوئی حرکت نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی اس ٹانگ سے محروم ہو چکی ہو۔

بڑی مشکل سے چلتی ہوئی تکلیف کی شدت سے تڑپے راشد تک پہنچی اور کھڑی پھٹلی کا زوردار وار اس کی گردن پر کیا۔ لڑکی کی آواز کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ کئے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر کر کھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

مثل دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی اور گہرے کمرے پر سانس لینے لگی، راشد کے ساتھ معرکہ آرائی میں اسے دائمی دانتوں تلے پینہ آ گیا تھا کچھ دیر اسی طرح پڑے رہنے کے بعد اس نے اپنی دھکتی ٹانگ کو آہستہ آہستہ ہلانا شروع کیا۔ اسے اس سے اتفاق ہونے لگا وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔

رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی۔ وہ چلتی ہوئی گیٹ پر پہنچی، اب اسے چلنے سے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ گیٹ کے پاس ہی ایک گرین ٹمبر پلیٹ دالی جب کھڑی تھی جس پر چلی حروف سے پولیس لکھا تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا اور جیپ تک جا پہنچی، خوش قسمتی سے چابی انکیش میں موجود تھی، جیپ اسٹارٹ کر کے برن رقماری سے عمارت سے باہر نکلی اور مخالف سمت کی طرف دوڑ دی۔ خدشہ تھا کہ اسپیکر شمشاد میں زلزلہ آئے، صورتحال دیکھے بھی سمجھیں ہو چکی تھی، اس کے ہاتھوں ایک پولیس اہلکار مارا جا چکا تھا، اگرچہ وہ مارا جانے والا جرائم

چیتھا لیکن پولیس اہلکار تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے چینی بھائی کا ہی ساتھ دیتے۔

مختلف سڑکوں پر جیپ دوڑاتی ہوئی وہ ویران حدود سے باہر نکل چکی تھی۔

رات کے تقریباً تین بجے وہ ایک سنسان سڑک سے گزر رہی تھی کہ جیپ ایک جھنگل سے رک گئی۔ اس نے فوٹو بتانے والے کانٹے کو دیکھا اور سر آدھ بھری گاڑی کا ٹیول ختم ہو چکا تھا۔ دور دور تک کسی پٹرول پمپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اگر پٹرول پمپ ہوتا بھی تو اس کے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی، وہ جیپ سے اترتی اور ارگرد کا جائزہ لینے لگی، سڑک سے کچھ فاصلے پر

ایک عمارت دکھائی دینے پر وہ عمارت کی طرف بڑھی، رات کے اس پہر اسے سردی لگنے لگی تھی، وسیع و عریض عمارت کی بیرونی لائسن آف تھیں۔ بیرونی گیٹ پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ وہ بندر کی طرح پھرتی سے دیوار پھلانگ کر اندر کودی، عمارت سنسان پڑی تھی۔ اندرونی لائسن آف تھیں، فرش پر گرد و غبار کی تہہ جی ہوئی تھی۔ گویا عرصے سے یہ عمارت کسی انسان کے زیر استعمال نہ تھی۔ وسیع مچن کے اختتام پر درجنوں کمرے بنے تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا یہ ہال نما کمرہ تھا۔ جس میں درجنوں کی تعداد میں کیمیکل کے ڈرم پڑے تھے۔ گویا یہ عمارت فیکٹری یا گودام تھی۔ وہ وہاں سے چلتی اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا، حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی کمرے کا دروازہ لاک نہ تھا۔ یہ کمرہ پندرہ بائی بارہ کا تھا، فرش پر کارپٹ پڑا تھا۔ جب کہ دیواروں کے ساتھ صوفہ سین رکھے تھے۔ ایک صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو گئی۔

کسی کے سمجھوٹے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے دو درمیانی عمر کے سانولے چہرے والے محنت مند شخص کھڑے تھے اور غور سے اسے گھور رہے تھے۔ ایک کے چہرے پر تلوار معرکہ بڑی بڑی مونچھیں اور فرخ کٹ واڑھی تھی جبکہ دوسرا کھن شیوا تھا۔ ”اوئے موہن!

شاید راستے میں نجات کی کوئی صورت نظر آجائے۔ یہ سوچ کر وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

باس اس کی طرف سے چوکنافٹا۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی جبکہ رائفل تھا۔ باس اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ وہ دونوں گیٹ پر پہنچے تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ باہر ایک شاندار سی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ ”تم گاڑی چلاؤ میں پچھلی نشست پر بیٹھوں گا۔“ مشعل نے اس کی ہدایت پر لینڈ کروزر اسٹارٹ کی اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر دوڑادی۔ وہ راستے بتاتا رہا اور وہ گاڑی چلائی رہی۔ کچھ گھنٹوں بعد ان کی گاڑی جنگل کی حدود میں داخل ہوگئی۔ صبح ہوئی تھی۔ سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہو رہی تھیں۔ جنگل میں مختلف اقسام کے جانور اپنی اپنی بولیوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلارہے تھے۔ اب وہ گھنے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔

”گاڑی دائیں سمت موڑو۔“ اس نے ہدایت دی۔ مشعل نے اسٹیئرنگ کھما کر گاڑی کا رخ دائیں سمت کر دیا۔ یہاں درختوں کی تعداد کم تھی۔ کچھ دور جا کر سپاٹ میدان آ گیا۔ میدان کے عین وسط میں طویل و عرض چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ اس کی دیواریں کئی فٹ اونچی تھیں۔ گیٹ کاٹی بڑا اور مضبوط تھا۔ مشعل نے اس کے اشارے پر گاڑی گیٹ پر روکی، اچانک ارد گرد سے پانچ مسلح افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے کمانڈر طرز کی خاکی دریاں پہن رکھی تھیں۔ گاڑی کے قریب آ کر انہوں نے سیلوٹ کیا۔

”گیٹ کھلاؤ۔“ باس نے سر کے اشارے سے ان کے سیلوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ان میں سے ایک گیٹ کی طرف بڑھا اور دیوار پر نصب ٹرن پر انگلی رکھ دی۔ گیٹ سے متصل کھڑکی سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ مشعل نے باس کے اشارے پر گاڑی آگے بڑھا دی۔ ”بس اب گاڑی یہیں روک کر نیچے اترو۔“ باس نے کہا اور مشعل گاڑی روک کر اس کے ہمراہ نیچے اتری۔ چاروں طرف اونچی چار دیواری کی گئی تھی۔ دیواروں پر خاردار تاریں نصب

تھیں جن میں شاید کرنٹ دوڑ رہا تھا۔

گیٹ پر نصف درجن بھر رائفل بردار چوکنافٹ کھڑے تھے۔ میدان میں ایک طرف نو جوان رائفل تھا۔ نشانہ بازی کی مشقیں کر رہے تھے جبکہ یونیفارم میں بلیوں ایک مختصا اور دیگر کچھ انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ شاید وہ ان کا انسٹرکٹر تھا۔ وہ ان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھے۔ دائیں طرف درجن کے قریب نو جوان کرائے کے مخصوص یونیفارم میں بلیوں کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک درمیانی عمر کا قبول صورت مرد کھڑا انہیں تربیت دے رہا تھا۔ ایک طرف درجنوں کی تعداد میں خیمے موجود تھے۔ بائیں سمت ایک شاندار سی عمارت تھی۔ مشعل حیران پریشان یہ مناظر دیکھتے ہوئے باس کے نشانہ بٹانہ چل رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا یہاں کرائے اور نشانہ بازی کی تربیت کیوں دی جا رہی ہے۔ باس شکل و صورت ہی سے جرائم پیشہ نظر آ رہا تھا۔ اب وہ عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں بھی اکا دکا یونیفارم میں بلیوں رائفل بردار نظر آ رہے تھے۔ آنے والے سامنے ترتیب وار کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور مشعل کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کمرے میں میز کے گرد چار افراد بیٹھے تھے۔

”میفوس مشعل“ اس نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس کی برابر دانی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سب سے پہلے تو میں آپ سب سے ان خاتون کا تعارف کروانا ہوں۔ یہ ہیں جس مشعل ان کا تعلق شاداب مگر سے ہے۔ ان کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ان کے کزن نے ان کی جائیداد پر قایض ہونے کے لئے اسپیکر شمس کو ان کے پیچھے لگا دیا جو ان کو قتل کرنے کی نیت سے ایک عمارت میں لے گیا۔ جہاں سے یہ ایک درندہ صفت پولیس اہلکار کو قتل کر کے سرکاری جیب میں بھاگ نکلیں۔

ایک دیران فیکٹری میں ہمارے ہی دو کارندوں

کی نیت انہیں دیکھ کر خراب ہوگئی۔ انہوں نے بے مثال بہادری سے ان کا مقابلہ کیا اور خالی ہاتھ انہیں زیر کیا۔ میری زیرک نگاہوں نے ان کی بہادری کے جوہر کو دیکھ لیا اور انہیں یہاں لے آیا۔ اب یہ ہمارے سامنے ہیں۔ ہماری تنظیم میں کام کریں گی۔ آپ لوگ انہیں تنظیم کے مقاصد سے آگاہ کریں۔ اور مس مشعل یہ چاروں میری تنظیم میں ریزہ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلے نمبر پر راجیش، دوسرے نمبر پر اکبر، تیسرے نمبر پر رنبہ اور چوتھے نمبر پر راہول۔“ باس نے ان کا تعارف کروایا۔

”مس مشعل، ہم آپ کو اس تنظیم میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس ملک میں کمزور اور بے بس لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ اس کی ایک مثال آپ بھی ہیں۔ پولیس نے آپ کی مدد کرنے کے بجائے آپ کو مارنے کی کوشش کی۔ ہماری تنظیم کی کوشش ہے کہ اس ملک میں انصاف کا بول بالا ہو۔

اس مقدمہ کے لئے ہمارے انکان جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“ راہول نامی شخص نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

مشعل سوچنے لگی۔ اگر اس نے ان کی مخالفت کی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ان کا ساتھ دینے کی حالی بھر لے اور موقع ملنے پر فرار ہو جائے۔

”آپ کس سوچ میں پڑ گئیں۔“ راہول اسے سوچتے دیکھ کر بولا۔

”وہ میں سوچ رہی تھی کہ آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اس ملک میں ہمارے ساتھ بہت زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ پھر ہم کیوں خاموش بیٹھیں۔“

”بہت خوب آپ کافی سمجھ دار لگتی ہیں۔ مسٹر راہول آپ انہیں نی آنے والی لڑکی کے ساتھ رکھیں اس نے کافی تنگ کر رکھا ہے۔ یہ انہیں گائیڈ کر لیں گی۔“ باس نے کہا اور راہول کرسی سے اٹھ گیا۔

دونوں ساتھ چلتے ہوئے پانچویں نمبر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں دو لڑکیاں پہلے سے موجود تھیں،

ایک اسٹارٹ اور خوب صورت تقریباً پانچ سالہ لیکن چہرے سے سبھی ہوئی اور خوفزدہ نظر آ رہی تھی جبکہ دوسری پچیس سالہ دیلی تھی بے لی ٹنگ بالوں کے ساتھ شوخ و چٹکل نظر آ رہی تھی۔

”یہ شازیہ ہیں۔“ راہول نے خوفزدہ لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ کس سارہ ہیں۔ اب آپ لوگ آپس میں کپ شپ کریں میں چلتا ہوں۔“ راہول کمرے سے باہر نکل گیا۔

مشعل نے کمرے کا جائزہ لیا۔ چودہ پائی پارہ کے اس کمرے میں دو خوبصورت بیٹھے، فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ٹرائی پر لکڑی دی اور DVD رکھا تھا۔ دونوں لڑکیاں ایک ہی بیڈ پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”میرا نام مشعل ہے۔“ مشعل نے ہاتھ ملاتے ہوئے ان سے اپنا تعارف کر دیا۔ اور ان کے برابر بیٹھ گئی۔

”مشعل آپ یہاں کیسے پہنچیں؟“ سارہ نے پوچھا اور مشعل نے اپنی رواد سنا دی۔

”اور تم یہاں کیسے پہنچیں؟“ مشعل نے سارہ کی طرف دیکھا۔

”میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ مجھے شروع سے ہی فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ کالج کے ایک اسٹیج ڈرامے میں پرنام کر رہی تھی کہ وہاں بیٹھے ایک پروڈیوسر کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے مجھے فلموں میں کام کرنے کی آفر کی، میں تو اس کی آفر سن کر ہواؤں میں اڑنے لگی۔ مگر جب گھر میں ذکر کیا تو طوفان کھڑا ہو گیا۔ میرے والدین اور بھائی نے سخت مخالف کی مگر مجھ پر جنون سوار تھا۔ میری بھوک ہڑتال کا بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں کالج کے یہاں گھر سے نکلی اور پروڈیوسر کے گھر جا پہنچی۔ جو مجھے اپنی چٹنی چٹری باتوں سے ادنیٰ خواب دکھاتا۔ ایک روز اس نے چائے میں مجھے نہ جانے کیا پلوایا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔

رات گئے مجھے ہوش آیا تو یہ لگا کہ اس کیمینے نے میری عزت لوٹ لی تھی۔ میں نے بہت داؤ بٹا کیا مگر وہ خبیث ہنستا رہا، اس کا یہی دھندا تھا، بھولی بھائی لڑکیوں کو

چونکہ پڑی۔

شازیہ نے اپنے گلے سے لاکٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ ”ہاں یہ وہی لاکٹ ہے جو میرے نانا اور جلال نے میرے لئے بچھوایا تھا۔“ مشعل بے ساختہ بولی اور شازیہ چونک پڑی۔ ”نور جلال بابا کا نام زندہ خوشی لاش نے بھی لیا تھا۔“ شازیہ نے لاش کی زبانی سنی کہانی بھی اسے سنا ڈالی۔

”اگر تمہارے پاس یہ لاکٹ نہ ہوتا اور میں اسی شکل و صورت کی برف میں دفن لاش خواہوں میں بھی نہ دیکھتی تو تمہاری باتوں پر یقین نہ کرتی، ویسے ایک بات تو بتاؤ تمہارے شوہر کیسے مرے تھے؟“ مشعل نے پوچھا۔ ”جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب بتانے سے انکار وہی بڑھتا ہے۔“ وہ اس لمحے میں بولی اور گم سم ہو گئی۔ ”سارہ مجھے تو یہ لوگ۔“ مشعل نے کچھ کہنا چاہا مگر سارہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہا اور میز کی دراز سے بال پین نکال کر ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اسے تھما دیا۔ مشعل نے پڑھا۔ لکھا تھا کہ ”اس کمرے میں حساس بائیکرو فون نصب ہے یہاں ہونے والی ہر بات آفس میں سنی جاتی ہے۔ ان کے خلاف اس عمارت میں کوئی بات مت کرنا اور نہ ہی اس عظیم کم کے بارے میں کسی سے کچھ کہنا جو بات کرنی ہو، مونیج یا کمرنارت سے باہر میدان میں کرنا۔“ مشعل نے پڑھ کر اسے دیکھا، سارہ نے کاغذ کا ٹکڑا اس سے لیا اور ہاتھ دوں میں جا کر فٹش میں بہا دیا۔

”سارہ میں تو کہتی ہوں یہ لوگ ہمارے بچے ہمدرد ہیں اس ملک نے ہمیں دیایا کیا ہے۔“ مشعل نے سارہ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا اور سارہ مسکرائی۔ ان میں کافی ویرنک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، جیسے وہ اس عظیم کم کی وفادار ہیں۔ مشعل کا ان باتوں سے متعقد تھا کہ عظیم کے لوگ ان سے بے فکر ہو جائیں۔ اس روز وہ کمرے میں ہی رہیں۔ کافی ویرنک کپ شپ کرتی رہیں۔ ان کا کھانا کمرے میں ہی آیا۔ شازیہ جب چاہی تھی۔

رات میں وہ جلد ہی سو گئیں۔ آدھی رات کو

بہکا کر برباد کرنا، بعد ازاں اس نے مجھے عصمت فردوش کے اڈے پر فروخت کر دیا۔ جہاں میں چھ ماہ تک رہی، پھر ایک دن موقع پا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ مگر پوچھیں، میرے صدمے اور رسوائی سے میرا پاپ ہمارا ایک سے مرچکا تھا۔ والدہ زندوں میں شمار بھی نہ مرووں میں، اسے فاج ہو چکا تھا۔ غیرت مند بھائی نے وہ دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ در بدر بھٹکتے اور انسان نما بھیڑیوں کے ہتھے چڑھتے میں سے راہوں صاحب تک جا پہنچی۔ جو مجھے یہاں لے آئے اب یہاں پر مجھے تین ماہ سے زائد بیت چکے ہیں۔“ سارہ نے اپنی آپ جتنی ختم کرتے ہوئے ٹالکس بچھپا کیں۔

”اب تم بتاؤ شازیہ کہ تم یہاں کیسے پہنچیں؟“ مشعل نے شازیہ کی طرف غور سے دیکھا۔

وہ اس لمحے میں بولی۔ ”میری داستان عام سی ہے۔ لومیرج کی وصل سے پہلے ہی جدائی ملی، میرے شوہر انتقال کر گئے۔ میں ہر وقت ان کی یادوں میں کھوئی رہتی تھی۔ میرے کزن اور ان کے دوست اپنے ساتھ برفانی پہاڑ پر کھو مانے لے گئے وہاں ہمیں ایک لاش ملی جو برف میں دبئی ہوئی تھی۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود بھائی کے ایک دوست نے برف کو دھو کر لاش کو باہر نکالا اس قدر بھیا تک لاش تھی کہ میں بتا نہیں سکتی، ہم لاش کو وہاں چھوڑ کر نکلے۔ رات کے وقت خیمے میں وہی لاش زغہ ہو کر گھس آئی، غرض یہ کہ اس لاش نے میرے سوا سب کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ میں بھی اس لاکٹ کی بدولت زندہ بچ پائی جو میں نے پکڑ رکھا ہے۔ لاش سے نجات پا کر میں گاڑی میں روانہ ہوئی، وہاں چند اوباشوں نے پکڑ لیا اور ایک ویران مکان میں لے گئے میں نے عزت بچانے کے لئے چیخا چلانا شروع کر دیا۔ راہوں صاحب وہاں آن پہنچے۔ انہوں نے مجھے ان سے بچایا اور یہاں لے آئے۔“ شازیہ نے اپنی کہانی ختم کی اور اپنے گلے میں پڑے لاکٹ کو اٹھائے ملتے لگی۔

”ایک منٹ یہ لاکٹ مجھے دکھانا یہ مجھے وہی لگتا ہے جو پولیس کی کچھپتائی میں مجھ سے گر پڑا تھا۔“ مشعل

شازیہ کی چیخ سن کر ان کی آنکھ کھلی۔ سارہ اور مشعل ایک بیڈ پر تھیں جبکہ شازیہ ایک بیڈ پر تھیں تھیں تھیں۔ سارہ نے پھرئی سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ناقابل یقین منظر تھا۔ لمبا چوڑا دیویدیل شخص جس کا چہرہ انتہائی بھیا تک تھا۔ شازیہ سے لپٹا ہوا تھا جبکہ وہ چٹخیں مارتے ہوئے اسے اپنے اوپر سے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ بھی کہ کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ پھر وہ شخص کمرے میں داخل کیسے ہوا؟

”غیبت انسان چھوڑ داسے۔“ مشعل چلائی اور ساتھ ہی ایک بڑا شوپیس اٹھا کر اس شخص کے سر پر مارا۔ وزنی شوپیس اس کے سر سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ شازیہ سے علیحدہ ہوا۔ اور کمرے ہو کر مشعل کی طرف اپنی خون آشام آنکھوں سے کھورنے لگا۔ ”کون ہو تم اور یہاں کیسے پہنچے دروازہ تو مقفل تھا؟“ مشعل نے حیرت سے پوچھا اور سارہ ایک طرف خوفزدہ سی کھڑی تھی جبکہ شازیہ بیڈ پر سکتے کے سے عالم میں پڑی تھی۔

”میں طان شے ہوں یہ دیواریں اور مقفل دروازے مجھے نہیں روک سکتے نہ ہی تمہاری دنیا کے لوگ مجھ پر قابو پا سکتے ہیں جن کے خون کی خوشبو ایک بار سوگھ لوں یا جسے ایک بار دیکھ لوں پھر وہ مجھ سے چھپ نہیں سکتا۔ یہ لڑکی میرے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ آج جیسے ہی اس کے گلے سے لاکٹ اترائے معلوم ہو گیا اور میں یہاں پہنچا۔ مگر یہاں تو ایک کے بجائے تین تھیں۔ اس کے بعد تم دونوں کی باری ہے۔“ وہ سفاک لہجے میں بولا اور دروازہ شازیہ کی طرف بڑھا۔

مشعل نے فضا میں قذا بازی کھائی اور اسے فلائنگ کلک ماری۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھوٹکا لگا وہ اپنی جگہ پر تن کر کھڑا تھا۔ فلائنگ کلک کا اس پر ذرا برابر اثر نہ ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر زور وار کھونٹہ طان شے کے منہ پر مارا۔ اس کا ہاتھ جھنجھٹا اٹھا اسے یوں لگا جیسے اس نے فولاؤ کے جیسے پر کھونٹہ مارا ہو، اب وہ بھی خوفزدہ ہونے لگی تھی۔ شوپیس کا بھاری بھر کم ٹکڑا

لگنے کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ زور وار کھونٹہ مارنے کے باوجود اسے چوٹ نہ پہنچی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مشعل کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے آگئی۔ وہ خون آشام بلا اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا تھا۔ مشعل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اچانک اسے ایک خیال آیا اور اس نے بابا نور جلال کا لاکٹ گریبان سے نکال کر اس کے سامنے کیا۔ طان شے لاکٹ کو دیکھ کر اپنی جگہ پر رک گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

اسی وقت کمرے کے دروازے پر زور وار دھتک ہوئی۔ سارہ نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ راہول اور راجیش ہاتھوں میں جدید ساخت کی رائفلیں تھامے اندر داخل ہوئے، طان شے پل بھر میں وہاں سے ایسے غائب ہوا جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو جبکہ شازیہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ سارہ بھئی بھئی نگاہوں سے اس جگہ کو گھور رہی جہاں چند لمحے قبل طان شے موجود تھا۔

راہول اور راجیش جیسے سفاک دہشت گردوں کے ہاتھ بھی پکپکا رہے تھے۔ ”یہ کون تھا؟“ راہول خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی بھکی ہوئی آتما تھی۔“ راجیش نے کہا۔

”تم لوگ اپنے اپنے مذہب کے مطابق کچھ پڑھ کر سو جاؤ۔“ راجیش نے کہا۔

راہول بولا اور راجیش کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل گیا، پردہ خوف کے مارے رات بھر نہ سو سکیں۔ مشعل کی ٹریٹنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔ یہ دائمی دہشت گردی کا ٹیپ تھا۔ جہاں سیدھے سادھے نوجوانوں کو بہکا کر دہشت گردی کی ٹریٹنگ دی جاتی تھی۔ انہیں کرائے، نشانہ بازی، ڈانٹا مایٹ، دسی بھ، ٹائم بھ، ریوٹ کنٹرول کے ذریعے بھ دھماکوں کی تربیت دی جاتی تھی، اسی عمارت کی مخالف سمت ایک بہت بڑی عمارت تھی جہاں ہر قسم کے بم اور اسلحہ بھاری مقدار

میں موجود تھا۔ مثل کو وہاں رہتے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے اس دوران اس نے تقریباً ہر قسم کے اسلحے کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ تنظیم کے خاص ارکان اس پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ تربیت کا دورانیہ چھ ماہ تھا۔ اس کے بعد تربیت مکمل کرنے والوں کو ملکی میدان میں اتارا جاتا تھا۔ جو یہاں سے باہر جاتے ہی اپنے ہی وطن کے خلاف اپنی طاقت کا استعمال کرتے تھے۔

اس تین ماہ کے دوران مثل یہاں کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ کچھ رہنمائی سارہ نے بھی کی تھی۔

سارہ کی تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ اب کچھ روز بعد اسے بھی اس کمپ سے بھیج دیا جاتا۔ اس وقت وہ دونوں گراؤنڈ میں تربیت حاصل کرنے کے بعد چھل قدمی کر رہی تھیں۔ یہی اراکین اب ان پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان پر نظر نہیں رکھی جاتی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی دوسری عمارت کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ جہاں اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ عمارت کے دروازے پر گینڈے کی جسامت کا ایک سیاہی نال مجنبا شخص کھڑا تھا جس کا نام کشن تھا۔ اس کے کندھے سے جدید ساخت کی رائفل لٹک رہی تھی۔ اس کی نگاہیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر بار بار نیندوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

”ہیلو ہینڈسم کیا ہو رہا ہے؟“ سارہ نے اسے چھیڑا، ہینڈسم کا لقب سن کر خوشی سے اس کی باپچیں کل گئیں۔ ”اندرا آئیں ناں آپ لوگ۔“ اس نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔

سارہ کے نیم عریاں حسن کو دیکھ کر اس کی عقل خبط ہو چکی تھی۔ ”ابھی نہیں میرے ہیرو، میں رات بارہ بجے کے بعد آؤں گی۔“ سارہ نے سرگوشی کی اور مثل کے ہمراہ آگے بڑھ گئی، کچھ روز بعد وہ اپنے کمرے میں تھیں، اوپر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ رات کا کھانا کھا کر وہ لیٹ گئیں۔ شاز یہ سوچتی تھی جبکہ وہ دونوں جاگ رہی تھیں۔ آدھی رات کے وقت تقریباً عمارت کی تمام

لائٹس آف ہو چکی تھیں۔ ہر طرف سناٹا چھا چکا تھا وہ دونوں اپنے بستر سے اٹھیں دروازہ کھٹکھٹا کر باہر چھاٹکا، کوریڈور سناٹا پڑا تھا۔ باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور دبے قدموں چلے گئیں۔ عمارت کے داخلی دروازے سے میدان میں پہنچیں تو وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ وہ دونوں حیران تھیں، اتنے بڑے دہشت گردی کے کمپ میں رات کے اس پہر محافظ کہاں جا سوتے تھے۔ یا شاید وہ اس لئے مطمئن تھے کہ اس جنگل میں رات کے اس پہر اول تو کوئی آبی نہیں سکتا اگر آ بھی جائے تو اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔ اس کی چار دیواری اس قدر بلند تھی کہ اس پر چڑھنا ناممکن تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف خاردار تاریں تھیں جن میں ہر وقت کرنٹ دوڑتا رہتا تھا۔ عمارت میں بجلی کی سپلائی کے لئے انہوں نے احاطے میں ایک طرف پلانٹ بنا رکھا تھا جہاں سے بجلی سپلائی ہوتی تھی۔

وہ دونوں محتاط انداز میں چلتی ہوئی اس عمارت تک جا پہنچیں جہاں اسلحے کا ذخیرہ موجود تھا۔ دروازے کے پاس کشن بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ تم نے آنے میں بہت دیر کر دی، اس نے سارہ سے گلا کیا۔

”کشن ہم مشرقی لڑکیاں ہیں، سب کے سامنے آنا مناسب نہیں تھا۔ اندر دوسرا تو کوئی نہیں؟“ سارہ نے پوچھا۔

”نہیں میں اکیلا ہوں، درما کو میں نے رات دس بجے آرام کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی، آ جاؤ اندر۔“ اس نے دروازہ کھولا وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں اور اس نے دروازے کو اندر سے جفنی لگا دی۔

”یہاں بھی کوئی مائیکروفون تو نصب نہیں؟“ مثل نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں، مجھے جہاں تنظیم کے اپنے بندے ہوں وہاں مائیکروفون نہیں ہوتا۔“

عمارت میں درجن کے قریب کمرے تھے۔ ”کیا سب کمروں میں اسلحہ ہے؟“ مثل نے پوچھا۔

”ہاں سوائے ایک کمرے کے سب کمروں میں اسلحہ ہے، جس کمرے میں، میں آرام کرتا ہوں وہاں اسلحہ نہیں ہے۔“ کشن بولا۔ اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ ”تمہارے پاس موبائل فون تو موجود ہوگا؟“ مثل نے پوچھا۔

”ہاں مگر اس سوال کا مقصد؟“

”دراصل میں چاہتی ہوں کہ تمہیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے! اپنا سیل فون آف کر دو۔“ مثل نے کہا اور اس نے بیٹے ہوئے پیش کی جیب سے موبائل فون نکال کر آف کر دیا۔ اس دست و دلیز کمرے میں صرف ایک بیڈ پڑا تھا۔ دیواروں پر جا بجا نیم عریاں اداکاروں کے فوٹو لگے ہوئے تھے۔ بیڈ کے قریب میز پر غیر ملکی شراب کی بوتل دھری تھی جو آدھی سے زائد خالی پڑی تھی، غالباً ان کے آنے سے پہلے شراب نوشی میں مشغول تھا وہ نشے میں جھومتا ہوا سارہ کی طرف بڑھا۔ مثل نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ حیرت زدہ ہو کر مڑائی تھا کہ مثل نے زوردار اسٹریٹ کلک اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ماری۔ وہ کراہتے ہوئے جھک گیا، مثل نے آگے بڑھ کر اپنے گھٹنے کا دار اس کے منہ پر کیا، وہ چیختا ہوا منہ کے بل گرا، مثل اپنی جگہ سے اچھلی اس بار نیچے گرتے وقت اس کا ہڑا ہوا ٹھٹھا کشن کی گردن پر پڑا، کڑاک کی آواز کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کا جسم چند لمحوں ہی میں بھڑبھڑایا، پھر ساکت ہو گیا۔ سارہ یہ معرکہ آرائی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ”مثل یم نے کیا کیا۔ اس کی موت کی خبر پھیلے ہی ہم دونوں بری طرح مارے جائیں گے۔“

”خبر آؤ نہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ دہشت گرد ہیں۔ کتنے ہی بے گناہ انسانوں کا خون ان کے سر پر ہے۔ ان سے لڑتے وقت ہماری جان بھی چلی جائے تو کوئی حرج نہیں، آؤ یہاں کی تلاشی لیتے ہیں۔“ وہ کمروں کی تلاشی لینے لگی۔ تمام کمروں میں بے انتہا اسلحہ تھا۔ خود کار رائفلیں، مشین گنیں، پستول، دستی بم، ٹائم بم، ڈائنائٹ، وہ ان سب سے بخوبی واقف

تھیں۔ اسی کمپ میں اس تمام اسلحہ کو استعمال کرنے کی تربیت انہیں دی گئی تھی۔ مثل نے دو جدید ساخت کی رائفلیں اٹھائیں۔ ایک خود رکھی اور دوسری سارہ کو تھما دی۔ ”آ خر تم کو کیا کیا چاہتی ہو؟“ سارہ نے بے تابی سے پوچھا۔

”تمھوڑی دیر چپ رہو، سب کچھ میں آ جائے گا۔“ مثل نے بولتے ہوئے رائفل کندھے سے لٹکائی اور ایک ٹائم بم میں نوے سنٹ کا ٹائم سیٹ کر کے بموں کے ذخیرے میں رکھ دیا۔ چار ٹائم بم اٹھائے چند دسی بم سارہ کو تھما دیے اور تیزی سے کشن کے کمرے میں داخل ہو گئی، بیڈ پر پڑے تھکے سے غلاف اتارا اور ٹائم بم غلاف میں ڈال دیے۔ ”تم بھی اپنے دستی بم اس میں ڈال دو۔“ اس نے سارہ کو ہدایت کی۔ سارہ نے اپنے ہاتھ میں موجود دستی بم تھیلے میں ڈال دیے۔ ”اب چلو شاز یہ کے پاس۔“ وہ بولی اور ساتھ ہی اسلحہ خانے سے باہر نکلے گئی۔ وہ محتاط انداز میں تیزی سے چلتی ہوئی دوسری عمارت میں داخل ہو گئیں۔

شاز یہ اب تک سو رہی تھی۔ مثل نے اسے جھنجھوڑ کے اٹھایا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اس نے بولنے کے لئے منہ کھولا نہی چاہا تھا کہ مثل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اسے خاموش رہنے کو کہا۔ غلاف سے ٹائم بم نکالے اور ان پر ساتھ سنٹ کا وقت سیٹ کیا۔ ایک ٹائم بم بیڈ کے نیچے رکھا اور ان دونوں کو کمرے سے نکلنے کا اشارہ کر کے باہر نکل آئی، عمارت میں اب تک سکوت چھایا ہوا تھا۔ عمارت کے کین آنے والی بتائی سے بے خبر اطمینان سے سو رہے تھے۔

کوریڈور سے نکلے نکلے وہ جگہ جگہ ٹائم بم رکھتی جا رہی تھی۔ عمارت سے باہر نکل کر وہ تینوں محتاط انداز میں کیراج کی طرف بڑھنے لگیں اس کیراج میں تنظیم کے ارکان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کیراج میں پہنچ کر مثل نے بڑے ٹائروں والی جیب فٹب کی، جیب سب گاڑیوں سے آگے کیراج کے دروازے پر ہی کھڑی تھی۔

مشل ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ سارہ نے اس کے برابر والی سیٹ منتخب کی۔ شازبہ پچھلی سیٹ پر دروازہ ہوئی، وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھی تھیں۔ مشل بار بار اپنی کلائی پر بندھی کھڑی میں ٹانگوں دیکھ رہی تھی۔ خوش قسمتی سے گاڑی کی چابی انکلیشن میں موجود تھی۔ جب ہم پچھلے میں پانچ منٹ رہ گئے تو مشل نے جیب اشارت کی اور کیراج سے نکلے ہی آندھی اور طوفان کی طرح فل اسپڈ سے مین گیٹ کی طرف دوڑا دی۔ جیب جیسے ہی مین گیٹ کے قریب پہنچنے لگی وہاں موجود گاڑوں پر چوکنہ ہو گئے۔ انہوں نے رائفلس کندھے سے اتار کر تانی ہی تھیں کہ مشل اور سارہ نے دو دکنی بم ان کی طرف اچھال دیئے ہولناک دھماکہ ہوا اور وہاں موجود گاڑوں کے جسم کے پرچے اڑ گئے۔

اسی وقت اسلحہ خانے کی عمارت اور رہائشی عمارت میں بے درپے خوفناک دھماکے شروع ہو گئے۔ دھماکے اس قدر شدید تھے کہ زمین لرز اٹھی۔ دھماکوں کی شدت سے جیب بری طرح لہرا رہی تھی۔ جیب اب مین گیٹ کے قریب پہنچ چکی تھی ان دونوں نے بے درپے دو دکنی بم مین گیٹ پر پھینکے۔ مین گیٹ کے پرچے اڑ گئے، گیٹ کے قریب موجود دو بج جانے والے گاڑوں نے جیب پر فائر کئے، خوش قسمتی سے گولیاں لہرائی ہوئی جیب کے ارد گرد سے گزر گئیں، سارہ نے لاک پن ہٹائی اور کھوم کر برسٹ مارا، دونوں گاڑوں کے جسم گولیوں سے چھنٹی ہو گئے، جیب ٹوٹے ہوئے گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔ دھماکوں کی آوازیں دور تک آرہی تھیں۔ دوسروں کو دہشت گردی کا شکار کرنے والے آج اپنے ہی بھوں سے دہشت گردی کا شکار ہو چکے تھے۔

اچانک دو افراد جیب کے سامنے آ گئے، یہ عمارت سے باہر موجود گاڑوں تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلس سیدھی کر کے فائر کئے، سارہ کے حلق سے بچ نکلی، دو گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو چکی تھیں۔ مشل نے دانت پیچھے ہونے جیب گاڑوں پر چڑھا دی، وہ دونوں جیب سے ٹکرا کر نیچے گرے اور جیب ان کے

جسوں کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی، کچھ دور جا کر مشل نے جیب روک دی۔ سارہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔ ”یہ کیا ہوا سارہ؟“ مشل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”روڈ مت..... میں نے اپنے..... گناہوں کا کفارہ ادا..... کروایا ہے..... میری زندگی..... نیک مقصد کی خاطر گئی.....“ سارہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گئی۔

شازبہ بے تحاشہ رو رہی تھی، مشل کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ دھماکوں کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔ مشل نے جیب اشارت کی اور آگے بڑھا دی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ شہری حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے جیب ایک طرف روک دی اور شازبہ کو اتارنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنی رائفل جیب میں ہی رکھی اور نیچے اتر کر ننگا ننگا ہوں سے سارہ کی طرف دیکھا جو ملک کے دشمنوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان دے چکی تھی۔

شازبہ کا ہاتھ بکڑ کر وہ ایک طرف چل دی۔ یہ اس کی مجبوری تھی، گولیوں سے پھلتی سارہ کی لاش اور جیب میں موجود اسلحہ ان دونوں کو کسی بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا، اس نے جیب سے کشن کا موبائل فون نکالا اور پولیس ایمرجنسی کا نمبر طایا، رابطہ ہونے پر جہاں جیب کھڑی تھی اس جگہ کا ایڈریس بتا کر بولی، ”اس سڑک پر جیب میں ایک لڑکی کی لاش موجود ہے۔“ اس سے پہلے کہ دوسری طرف موجود آفیسر کوئی سوال کرنا اس نے موبائل فون ایک طرف اچھال دیا۔ ”چلو شازبہ۔“ اس نے کہا اور اس کا ہاتھ تمام کر چلے گئی۔

مشل اور شازبہ جیب سے دور ہوتی جا رہی تھیں، اچانک انہیں ٹھٹک کر رکنا پڑا، ایک بڑا شہت اور رضوان ان کے سامنے کھڑے خباثت سے دس رہے تھے۔ شہت کے ہاتھ میں پتل موجود تھا، جس کی نال کارخ ان کی طرف تھا۔ ”میں میری رانی بہت بھاگ دوڑ کر لی، اب کچھ آرام کر لو۔ ہمیں بھی اپنی خاطر تواضع کا موقع

دو۔“ شہت ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یار یہ دوسری کون ہے، ہے تو بڑی خوب صورت اسے مت مارنا۔“ رضوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مہارانی صاحبہ یہ سامنے جو گاڑی کھڑی ہے اس میں تشریف رکھیں۔“ شہت نے ایک طرف کھڑی لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دھکیلا۔ ان کے قریب پہنچنے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے ہاتھ بڑھا کر پچھلی طرف کا دروازہ کھولا، شہت نے پتل کی نال سے مشل کو آگے کی طرف دھکیلا وہ دونوں اندر بیٹھ گئیں۔ شہت اور رضوان ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے، قوی میل شخص جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے مڑ کر انہیں دیکھنے لگا اس کے چہرے پر بڑی بڑی موہچیں اور گال پر چاقو کے پرانے زخم کا نشان دیکھتے ہی مشل چونک پڑی۔ وہ اس منحوس چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی یہ وہی تھا جس نے اس کے والدین اور بھائی کا قتل کیا تھا۔ ”گاڑی چلاؤ گے یا نہیں دیکھتے رہو گے۔“ رضوان نے اسے ڈانٹا تو اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے گاڑی اشارت کی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر سے دوڑتی ہوئی پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ لینڈ کروزر دائیں سڑک پر مڑی تو سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک حزار کا بڑا سا گتہہ نظر آ رہا تھا۔ حزار کے سامنے سڑک پر بھولوں کی دکانیں تھیں، کچھ دور جانے کے بعد گاڑی سڑک سے اتر کر دونوں اطراف سے جھاڑیوں میں گھرے راستے پر جا گئی، سامنے سینٹ کی چادروں سے بنا ہوا مکان تھا، ڈرائیور نے گاڑی روک کر ہارن بجایا۔ مکان کا دروازہ کھلا اور ایک پستہ قامت سیاہ چہرے والا شخص باہر نکلا۔ ”راجو! نہیں اندر لے جاؤ۔“ شہت نے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص سے کہا۔ راجو نے نیچے اتر کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور مشل اور شازبہ کو اتارنے کا کہا۔ مشل کی پینڈلی سے تیز دھار خنجر بندھا ہوا تھا وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی کہ بساط کارخ پلٹ سکے۔ خالی

ہاتھ راجو نے اسے باہر آنے کا کہا تو اس نے سوچا موقع آ گیا ہے۔ باہر نکلتے ہی راجو پر ٹوٹ پڑے گی۔ وہ دروازہ کھول کر جیسے ہی لینڈ کروزر سے اتر کر راجو نے اسے لباس میں سے ریو اور نکال کر اس کی نال کارخ ان کی طرف کر دیا، وہ دونوں ریو اور کی زو میں مکان کے گیٹ کی طرف بڑھیں، پستہ قامت شخص کو دیکھ کر مشل لمحہ بھر کو رک کر اور پھر مکان کے اندر داخل ہو گئی، یہ پستہ قامت شخص وہی تھا جس نے راجو کے ساتھ مل کر کئی سال پہلے اس کے والدین اور بھائی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

راجو نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور دونوں لڑکیوں کو اندر جانے کا کہا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ایک طرف چار پائی پڑی تھی، قریب ہی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر شخص موجود تھا جسے دیکھ کر مشل حیرت سے اچھل پڑی، وہ اس کا بچا احسن حسین تھا۔

”انکل آپ بھی۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں میں بھی اب تم ان کاغذات پر سائن کر دو، ورنہ اپنی زندگی سے محروم ہو جاؤ گی۔“ احسن حسین کاغذات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کیا ہے ان کاغذات میں؟“ مشل نے پوچھا۔

”ان میں لکھا ہے کہ تم اپنی مرضی سے اپنی تمام پراپرٹی اور بزنس میرے نام کر رہی ہو۔ اور تمہارے والد نے کروڑوں روپے کا جو قرض مجھ سے لیا تھا اس کے عوض بیٹوں میں موجود تمام رقم بھی مجھے دو گی۔“ صفدر حسین بولا۔

”یہ دونوں میرے والدین کے قاتل ہیں، ان کی آپ کے پاس موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ ان کے قتل میں آپ کا بھی ہاتھ تھا۔“ مشل سچ لہجے میں بولی۔

”ہاں یہ کام میں نے ہی ان سے کر دیا تھا اب جلدی سے ان کاغذات پر سائن کر دو۔“ احسن حسین غرایا۔

اسی وقت رضوان اور شہت بھی کمرے میں

داخل ہو گئے۔ حشمت کے ہاتھ میں پتلن اب تک موجود تھا۔ ”کیا ہوا لڑکی سنا نہیں تم نے؟“ حشمت نے انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔

”میں سنا نہیں کرتی، تم نے جو کرتا ہے کر لو۔“ مشعل فیصلہ کن لہجے میں بولی اور حشمت نے دانت بھینچے ہوئے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔

☆.....☆.....☆

ساحل شدید زخمی حالت میں ریل کی پٹری پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر رسی سے مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ اسی وقت ٹرین کی دسل سنائی دی اور پٹریاں ٹرین کے بھاری بھرکم پہیوں کی دھمک سے لرزنے لگیں، بے ہوش پڑے ساحل کے سر میں پٹریوں کی لرزش سے دھمک ہونے لگی، اس نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھول دیں، بمشکل گردن گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ خوف سے اس کے روٹ گئے کھڑے ہو گئے۔ وہ ریل کی پٹریوں پر پڑا تھا۔ آنے والی ٹرین کے بھاری بھرکم پہیوں سے پٹریاں لرز رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کی کوشش کی تو کراہ کر رہ گیا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کے ساتھ ساتھ پورا جسم تکلیف کی شدت سے چھوڑے کی طرح دھک رہا تھا۔ اٹھنا تو درکنار اس سے ہلنا بھی نہ جا رہا تھا۔ اسی وقت ٹرین کی دسل سنائی دی، اس نے گردن گھمائی دور سے ٹرین آنی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے جیسے ٹرین نزدیک آتی جا رہی تھی، پٹریوں کی لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کی کوشش کی، اس بار وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ پہلو بدل کر اٹھ بیٹھا۔ گراس کا سر بری طرح چکرار رہا تھا۔ وہ کمزوری کی شدت سے دوبارہ گر پڑا تو اس کا سر پٹری سے ٹکرایا اور نگاہوں کے سامنے تارے رقص کرنے لگے، اس کی نگاہوں کے سامنے وحشت کی چھا رہی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر ہوش میں آنے کی کوشش کی، اس وقت بے ہوش ہونے کا مطلب اذیت ناک موت تھی، اس نے تیزی سے پلٹیں جھپکا نہیں اور سامنے سے آتی ٹرین کو نزدیک ہوتا دیکھ کر آنکھیں کی کوشش کی وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ

گیا، لیکن کھڑے ہونے کی ہمت اب بھی نہ تھی، وہ کوشش کر کے لرزتے قدموں سے اٹھا۔ پٹریوں کی لرزش بڑھ چکی تھی، ٹرین کے شور کی آواز اس کے کان کے پردے چھا رہی تھی، اس نے قدم آگے بڑھنا چاہے تو محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں سن بھر کے ہو چکے ہوں، اس سے ہلنا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھانے لگا۔

ٹرین اس سے محض چند سو گز کے فاصلے پر تھی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں، اسی وقت اس کے جسم کو دھکا لگا، وہ اڑتا ہوا سائیکل طرف جا گرا، اور ہوش و حواس سے عاری ہو گیا تھا۔

اسے ہوش آیا تو خود کو پتال کے بیڈ پر پایا۔ جسم پر جگہ جگہ پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ بیڈ کے سامنے پولیس یونٹ فارم میں لمبوس ایس بی ریک کا آفیسر بیٹھا تھا۔ ”ہیلو یوگ مین کیسے ہو؟“

”سیر پورے بدن میں درد کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔“ وہ بمشکل دانت بھینچ کر بولا۔

اچانک اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا، اسے وہ معصوم لڑکی مشعل یاد آنے لگی نہ جانے اس ورنہ مفت ”اسپیکٹر حشمت“ نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔

”نوجوان تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟ تمہیں ہاندھ کر کس نے ریل کی پٹری پر پھینکا تھا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں پھاٹک کے قریب اپنی گاڑی میں موجود پھاٹک کھٹکنے کا انتظار کر رہا تھا کہ تم پر نظر پڑی، میں بھاگتا ہوا تم تک پہنچا اور تمہیں دھکا دے دیا، تمہاری زندگی تھی اس لئے بچ گئے ورنہ ٹرین تم سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔“ ایس بی بولا۔

”سر میرا نام ساحل ہے۔ اور میری اس حالت کا ذمہ دار اسپیکٹر حشمت ہے۔ میں مشعل اب تک اس کی قید میں ہیں، نہ جانے اس ورنہ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔“ ساحل بھراہٹ ہوئی آواز میں بولا، ایس بی کے پوچھنے پر اس نے ایس بی کو اس عمارت کا ایڈریس

بتایا جہاں انہیں قید رکھا گیا تھا۔ ایس بی نے پینٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی کانمبر ملایا رابطہ ہونے پر بولا۔ ”ہیلو ایس بی اسفند یار اسپیکٹر، حشمت کو فوراً گرفتار کر لو۔“ ساتھ ہی اس نے ساحل کا بتایا ہوا ایڈریس دہرایا اور رابطہ منقطع کر کے بولا۔ ”تم فکر مت کرو، میں نے ڈی ایس بی کی دودھی کو اس کی پٹنا گاہ پر ریڈ کرنے کا حکم دے دیا ہے، کچھ دیر بعد ہی نتائج سامنے آ جائیں گے۔“

ساحل نے مشکورانگہ ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، اسی دوران ایک خوب صورت سی لڑکی ڈاکٹر آئی اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد اسے پین کٹر انجکشن لگا دیا۔ ”انجکشن میں شاید کوئی سکون آدور دو، مگر وہ دوا کے زیر اثر ہو گیا۔ اسے دوبارہ ہوش آیا تو ایس بی اسفند یار سامنے ہی بیٹھا تھا۔ ”نوجوان مجھے افسوس کے ساتھ کہتا پڑ رہا ہے کہ مشعل کا کوئی سراغ ہمیں وہاں نہیں ملا۔ اسپیکٹر حشمت وہاں سے فرار ہو چکا ہے۔ اس کی غیر قانونی حرکات کی وجہ سے آئی جی صاحب نے اسے معطل کر دیا ہے۔ بہر حال تم فکر مت کرو، حشمت کے خلاف ایف آئی آر کٹ چکا ہے اور اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں، دراصل میں مشعل کے ملازم نے مجھے حشمت کی اس غیر قانونی حرکت کی کپی لین کی تھی، مگر میرے پوچھنے پر حشمت نے انکار کر دیا کہ اس نے ساحل یا نوجوان اور مشعل مای لڑکی کو حراست میں نہیں لیا اب جبکہ تمہارے بتانے پر وہاں چھاپے مارا تو وہاں سے ایک پولیس اہلکار کی گردن ٹوٹی ہوئی لاش ملی ہے۔ وہاں ٹارچر سیل کا سراغ بھی ملا ہے۔ اذیت رسانی کے آلات بھی ملے ہیں، جائے وقوعہ پر خون کے دھبے بھی پائے گئے ہیں۔ حشمت نہ ہی اپنے گھر پر ہے اور نہ ہی اپنے کسی ٹھکانے پر موجود ہے۔“ ایس بی نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

ساحل تقریباً پندرہ دن زیر علاج رہا، اس دوران ایس بی اسفند یار برابر روزانہ اسے ملنے آتا رہا۔ صحت یاب ہوتے ہی ایس بی اسے اپنے گھر لے گیا۔ تقریباً

ایک ہفتہ ساحل وہیں رہا۔ اس دوران ایس بی اسے جیب خرچ کے لئے پیسے بھی دیتا رہا۔ ایک روز جبکہ ایس بی اپنے آفس میں تھا ساحل وہاں سے نکل پڑا۔ اب وہ اپنی عبت شازیہ کے گھر اس کے لئے جا رہا تھا۔

شازیہ کے بچکے کے سامنے پہنچ کر اسے دھچکا لگا۔ گیٹ پر بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ وہ چند لمبے حیرت اور پریشانی سے گیٹ پر لگے تالے کو دیکھتا رہا۔ پھر برابر والے بچکے کی اطلاع چھٹی بیوی۔ گیٹ کھلا اور ایک صحت مند چوکیدار کندھے پر رائفل لٹکائے باہر نکلا۔ ”ہاں صاحب کس سے ملنا ہے؟“

”یہ برابر میں بچکے کو تالا لگا ہے اس کے کلین کہاں گئے؟“ اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

”اوصاحب کیا پوچھتا ہے خود ادر بہت جلم ہوا ہے انداز تو کو بڑی کام نہیں کرتا کہ ادر کا لوگ ایسا ہے۔“ چوکیدار اپنے مخصوص لب و لہجہ میں شروع ہو گیا۔

”خان صاحب میں نے پوچھا ہے یہ لوگ کہاں گئے؟“ اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔

”بات یہ ہے بانی کہ اس بچکے کا مالک نخل (قتل) ہو گیا۔ اس کا دادا اس کو قتل کے الزام میں پھانسی ہو گیا۔ اس کا بانی اپنا رستے دار کے ساتھ گونے گیا۔ اس کا سب رستہ دار نخل (قتل) ہو گیا کو اس کا بانی کا گائب ہو گیا۔ اس کا جوان بی وی ماریہ اور سیکریٹری آجھان کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ آجھان (آفاق) نے ماریہ سیکرٹری کو گولی مار دیا، اس کو پولیس پکڑ کر لے گیا، پولیس کو آجھان نے بتایا کہ اس نے ماریہ کے کہنے پر وادہ سیدھ کو قتل کیا تھا۔ اب دولت ہاتھ میں آنے کے بعد نہ اس کا حصہ دے رہا تھا نہ ہی اس سے سادی کر رہا تھا، ام کو تو ایک بات کا بھروسہ ہے اس کا دادا پچھارہ مفت میں مارا گیا۔“

چوکیدار کی زبانی شازیہ کی گمشدگی کا سن کر ساحل کو ایسا لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر آگرا ہوا۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں وہاں سے چل پڑا۔ وہ پیدل ناک کی سیدھ میں چلا رہا، رات پڑی تو ایک پارک میں سو گیا۔ وہ شازیہ کی یاد میں پاگل ہو چکا تھا۔

دن بھر ادھر ادھر مچھتا پھرتا۔ کوئی ترس کھا کر کچھ کھانے کو دیتا تو کھالیتا، درنہ بیوقوفی رہتا۔ رات جہاں پڑتی وہیں سو جاتا، کبھی فٹ پاتھ اور کبھی پارک میں اس کا لمبرا ہوتا۔ واٹھی سوچیں بڑھ کر جھاڑ جھکاڑ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ لباس میلا کچلا ہو چکا تھا۔ بعض لوگ اسے بھکاری جان کر پیسے دے جاتے تھے۔ وہ سارا سارا دن چلتا رہتا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ ایک روز وہ چلتے چلتے ایک مزار پر جا پہنچا۔ جمترات کا دن تھا۔ حرار کے باہر جا بجا پھولوں کی دکانیں تھیں جن پر چڑھنے کی چادریں موجود تھیں۔ کئی روز سے پیدل چلنے کی وجہ سے اس کی جینٹیں بے حال ہو چکی تھیں اور نیچے پاؤں بری طرح زخمی اور خاک آلود تھے۔ وہ لوگوں کے ہجوم سے گزرتا ہوا دائیں طرف بہنے ہوئے احاطے کی طرف بڑھا۔ تقریباً چار سو گز کے گرد چار فٹ کی چار دیواری کی گئی تھی۔ درجنوں کی تعداد میں خواتین مرد اور بچے احاطے کی دیواروں سے جھانک رہے تھے۔ وہ بھی غائب رہی تھی۔ آگے بڑھا ایک موٹی تو ندوالے شخص کو دھکیل کر ایک طرف کیا اور دیوار کے اوپر سے جھانکنے لگا۔ احاطے میں کافی بڑا تالاب موجود تھا جس میں کئی مگرچہ موجود تھے۔ مگرچہ کا رکھوالا لکڑی کی ڈنڈی سے ان کے منہ میں گوشت کے ٹکڑے ڈال رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ان کا نظارہ کر کے پلٹا۔ وہ مزار کی سڑکیاں چڑھنے لگا۔ ایک طرف ہال نما کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس میں قوال جھومتے ہوئے قوالیں سارے تھیں۔ قوالی سننے والے سامعین میں سے درخص اٹھ کر دیوانہ داراچے لگے کچھ دیر قوالی سننے کے بعد وہ ہال نما کمرے سے باہر نکلا اور سڑکیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچا۔ بابا کی قبر کے گرد نصب خوب صورت ریلنگ کے پاس بیٹھ کر فاتحہ خوانی کی، دعا مانگتے ہوئے منجانبے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہاں موجود درجنوں کی تعداد میں خواتین اور مرد اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ”یا اللہ پھڑے ہوڈں کو ملانے والے شازیہ کو صرف ایک بار مجھ سے ملا دے۔“

دعا مانگنے کے بعد وہ حرار کی سڑکیاں اتر رہا تھا کہ سڑکیوں پر موجود ایک مجذوب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا وہ مختصر الوجود مجذوب تھا۔ وہ انجھی ہوئی نگاہوں سے مجذوب کو دیکھنے لگا۔ ”عشق جہازی کو چھوڑ، عشق حقیقی کر، اپنی امیدیں رحمان سے وابستہ کر لے، منزل آسان ہو جائے گی۔ دنیا کے پیچھے مت بھاگ، دنیا بھوکا ہے جو دنیا کے سراب میں جھلا ہے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ خالق حقیقی کے عشق میں ڈوب جا، دنیا تیرے پیچھے ہوگی۔“ بند آنکھوں سے مجذوب نے کہا۔

ساحل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”اب اپنی آنکھیں کھول دے۔“

اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران ہو گیا۔ وہ ایک پہاڑ پر موجود تھا اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ”ہم تو بابا کے حرار پر تھے اب یہاں پہاڑ پر کیسے آ گئے؟“ ساحل نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم نے بابا کے حرار پر چلے ولے دعا کی تھی۔ بابا بچے دل کی پکار سنتے ہیں۔۔۔۔۔ بابا نے ان ہی پہاڑوں میں چلے کاٹا تھا اور دعا کی تھی۔“

”بابا کیا شازیہ مجھے ملے گی، آپ کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میں مرنے سے پہلے اس سے مل لوں۔“

ساحل نے اپنی خواہش کا اظہار مجذوب سے کیا۔ انہوں نے چند لمحے سوچا اور بولے۔ ”ٹھیک ہے آج سے تم چالیس روز کا چلے کاٹو گے ان چالیس دنوں میں تم نے حصار سے باہر نہیں نکلنا۔ میدان کی طرف تمہاری پشت ہوگی۔ تم نے چالیس دن تک پلٹ کر نہیں دیکھنا۔ سوچ لو چلے کل کر کسکو گئے؟“

”ہاں میں تیار ہوں۔“ ساحل نے حای بھری۔

مجذوب کی ہدایت کے مطابق حصار میں بیٹھ کر مجذوب کا بتایا ہوا وظیفہ ساحل پڑھنے لگا۔ کئی گزر گئے۔ اس دوران وہاں گھومنے کے لئے کچھ لڑکے آئے۔ انہوں نے اس فقیر (ساحل) کو عبادت میں مشغول دیکھا تو علاقے میں جا کر بتایا، اپنے اپنے مسائل کا شکار لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لئے

آنے لگے، حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی بھی اس پہاڑ پر چڑھ نہ پاتا۔ جو بھی ساحل تک جانے کے لئے اوپر چڑھتا چاہتا، اس کے قدم اس کا ساتھ چھوڑ جاتے۔ میدان میں موجود لوگ اسے آوازیں دیتے۔ لیکن وہ کسی کی آواز پر توجہ نہیں دیتا، وہ صرف اور صرف وظیفہ پڑھنے میں مشغول رہتا۔ بہت سے لوگوں نے اس میدان میں کھڑے ہو کر دعائیں مانگیں۔ شاید وہ قبولیت کی کھڑی تھی۔ ان کی مرادیں پوری ہوئیں۔ لوگوں نے اسے اس کی کرامات گردانا۔

چلے کے خاتے کا آخری روز تھا کہ وظیفہ پڑھتے ہوئے اس نے ایک ایسی آواز سنی کہ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ آواز وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا اس نے بے اختیار مڑنا چاہا مگر رک گیا، اسے مجذوب کی سببیہ یاد آ گئی۔ مجذوب نے کہا تھا کہ چلے کے دوران نہ ہی پلٹ کر پیچھے دیکھنا اور نہ ہی حصار توڑنا۔ اس بار وہی آواز اس نے دوبارہ سنی اور وہ اندر سے اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

☆-----☆

ایس پی اسفندیار بہت پریشان تھا، اپنی سروس کے دوران اس کا اس قسم کے حالات سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ شہر سے آئے دن ٹھکانے کی نو جوان لڑکیوں کی لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ ان کے جسم میں خون کی رقیق تک نہ موجود ہوتی تھی۔ اس پر انفران بالا کی طرف سے دباؤ الگ تھا اوپر سے میڈیا پر قانون نافذ کرنے والے اداروں پر سخت تنقید کی جا رہی تھی، شہر میں جگہ جگہ پولیس والے پکڑے رہے تھے۔

مگر اس کا بچی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہر گلی ہر محلے میں پولیس اہلکار گشت کرنے لگے۔ ٹھکانوں کی ٹھکانی لاشوں کے ملنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ایس پی اسفندیار اس وقت اپنی کار میں سوار مگر کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک چونک پڑا، اس کے قریب سے ایک لینڈ کروزر گزری تھی، اسے یوں لگا جیسے پچھلی نشست پر شہر میں موجود ہو اس نے کار کی رفتار بڑھا دی اور لینڈ کروزر کا محتاط انداز میں پیچھا کرنے لگا۔ لینڈ کروزر میں پچھلی نشست پر دو خواتین

سمیت دو افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک کودہ اچھی طرح پہچانتا تھا وہ شہر تھا، لینڈ کروزر ایک پسماندہ علاقے سے گزر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سڑک کے دونوں اطراف پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ کچھ دور جا کر لینڈ کروزر سڑک سے ہوتی ہوئی سڑک سے اتر کر جھاڑیوں سے گھرے ایک جگہ رک گئی۔

ایس پی اسفندیار نے اپنی کار سڑک پر ہی روکی اور محتاط انداز سے اس راستے پر چل دیا۔ اس دیران راستے میں سینٹ کی چادروں سے بنے مکان کے سامنے لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ وہ جھاڑیوں کی آڑ میں جا چھا۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک پست قامت شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سینٹ سے دیو پیکل شخص اتر اچھلی نشست پر بیٹھی لڑکیوں کو یو لور کی زد میں لے لئے ہوئے پست قامت شخص کے ہمراہ مکان میں داخل ہو گیا جبکہ شہریت اور دوسرا شخص لینڈ کروزر میں ہی بیٹھ رہے، کچھ دیر بعد وہ بھی اس مکان میں داخل ہو گئے۔

مکان کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔ اسفندیار کچھ دیر وہیں دیکھا رہا، مگر مکان کی طرف بڑھا۔ اچھل کر دیوار پر جا چڑھا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ برآمدے میں کوئی بھی موجود نہ تھا، سامنے موجود کمروں میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بیچوں کے مل اندر کودا، چند لمحوں تک دیکھا رہا، جب یقین ہو گیا کہ اس کے کونے کی آواز کسی نے نہیں سنی تو اپنے ہوسٹر سے پھسل نکال کر دے قدموں دروازے پر جا پہنچا، اندر شہریت اور دوسرا شخص ایک لڑکی پر اسلحہ تانے اسے دھکا رہے تھے، اسی وقت شہریت کے سامنے کھڑے ادیبز شخص کی نظر اسفندیار پر پڑی، تو وہ چلا یا۔ ”یہ کہاں سے آ گیا۔“

شہریت نے مڑ کر پھرتی سے قائل کرنا چاہا مگر اسفندیار پھرتی میں اسے مات دے گیا، اس کے منسل سے ٹکلی گولی۔ شہریت کے سینے میں لگی تو وہ کرناک آواز میں چیخا اور کمرے کے فرش پر گر کر تر پنے لگا۔

راجو کی توجہ اسفندیار کی طرف ہو چکی تھی۔ مشعل

نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ریلوور والے ہاتھ پر لک مار دی ریلوور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ ریلوور ہاتھ سے نکلنے ہی راجو نے مشکل کے چہرے پر کھ مارا، مشکل نے جھکاؤ دے کر خود کو بچایا اور اس کی ٹانگوں کے نیچے اسٹریٹ لک مار دی تو وہ گر کر رہ پڑے۔

پستہ قاصت نے بساط پٹنے دیکھ کر حشمت کی لاش کے قریب پڑا مشکل اٹھاتا چاہتا تھا مشکل نے اپنی پٹنی سے بندھا خنجر نکالا اور تیزی سے اس کی طرف پھینکا، خنجر اس کے سینے کے عین دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔ وہ بنا آواز نکالے جین ڈھیر ہو گیا۔

اسفندیار مشکل ہاتھ میں لے کر گئے میں ہونے والی محرک آرائی دیکھ رہا تھا۔ رضوان نے دوڑتے ہوئے اسفندیار پر چھلانگ لگائی، اسفندیار نے ٹریگر دبا دیا، رضوان کی خوش قسمتی کہ اسفندیار کا نشانہ خطا گیا۔ رضوان اس پر جاگرا اور اس کا مشکل والا ہاتھ پکڑ لیا، اب دونوں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

اپنے سینے کو اسفندیار سے لڑتے دیکھ کر امیر حسین ان کی طرف بھاگا۔ اس کے پاؤں کی زوردار ٹھوکر اسفندیار کے ہاتھوں پر پڑی۔ مشکل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جاگرا۔ اب اسفندیار کو دونوں باپ بیٹوں سے لڑنا پڑ رہا تھا۔ امیر کرے میں مشکل راجو پر لاشیں لاد رکھنے پر سراسر ہی تھی۔

شاذیہ ایک طرف خوفزدہ سی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ایک موقع پر راجو نے لک مار دی مشکل کی ٹانگ پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے اسے دھکا دے کر گرانے کے بعد اس پر چھلانگ لگائی مشکل نے ایک طرف کودتے بدل کر خود کو بچایا اور پھرتی سے کھڑی ہو گئی۔ راجو نے پستہ قاصت کے سینے میں پیوست خنجر نکالا اور غضب ناک ہو کر مشکل پر پے در پے وارے کر دے وہ چیخے بٹھے ہوئے خود کو اس کے مہلک حملوں سے بچاتی رہی۔ چیخے بٹھے بٹھے اس کے ہاتھ میں لکڑی کی کرسی آگئی، جسے اس نے تیزی سے اٹھالیا۔ اب وہ کرسی سے اپنا کامیابی کے

ساتھ دفاع کر رہی تھی۔ راجو اس پر خنجر سے وار کرتا تو وہ کرسی آگے کر دیتی۔ راجو کا خنجر والا ہاتھ کرسی سے نکرا جاتا، ادھر اسفندیار اور رضوان آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ان میں مشکل کے حصول کی جنگ جاری تھی۔

امیر حسین ہاتھوں میں مضبوط ڈنڈا پکڑے مناسب موقع کی تاک میں تھا کہ اسے موقع ملے اور وہ اسفندیار کے سر پر ڈنڈا ارسید کر دے۔ بالآخر اسے موقع مل گیا، اسفندیار رضوان کو رگیدتا ہوا اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔ مشکل اسفندیار کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کو رضوان گرفت میں لے لے ہوئے مشکل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مشکل کی نال کار رخ بھی رضوان کی طرف ہو جاتا اور بھی اسفندیار کی طرف۔

اسی وقت امیر حسین نے اسفندیار کے سر پر ڈنڈا رسید کر دیا۔ اسفندیار کی انگلی اسٹریٹ لک مار پر دب گئی اور مشکل سے نکل گئی اس کے سر پر ڈنڈا ارسید کرتے ہوئے امیر حسین کی گردن میں پیوست ہو گئی وہ چیختا ہوا گر پڑا۔ اسفندیار سر پر ڈنڈا لگنے سے رضوان پر سے لڑھک کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

رضوان گہرے سانس لیتا ہوا اٹھا اور مشکل ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کا باپ امیر حسین ایک طرف مردہ پڑا تھا دوسری طرف اسفندیار بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے نیچے پڑا مشکل اٹھایا اور محوم کیا۔ اسی وقت مشکل نے کرسی سے راجو کا خنجر کا دار روکا اور زور وار فرنٹ لک مار اس کے سینے پر رسید کی راجو لڑکھڑاتا ہوا اپنی پشت پر موجود پوڈار سے نکل کر نیچے گر پڑا۔ ”بس بہت ہو گیا مشکل اپنی اچھل کود بند کر دے اور نہ گولی چلا دوں گا۔“ رضوان سانپ کی طرح پھنکا اور مشکل نے اپنے ہاتھوں میں موجود کرسی ایک طرف پھینک دی، ایک نظر رضوان پر ڈالی اور دوسری نظر پر آمد سے میں پڑی امیر حسین کی لاش پر اور بولی۔ ”رضوان اب بھی وقت ہے سدھر جاؤ اور دیکھو اپنے باپ کی لاش کی طرف مکافات عمل نے اس کا کیا حشر کیا ہے۔“

”مجھے اپنے باپ کی موت کا ذرہ برابر بھی افسوس

نہیں اس کے مرنے کے بعد اس کی اور تمہارے مرنے کے بعد تمہاری بھی دولت و جائیداد میری ہوگی۔“ رضوان ہڈیانی ہنسی بٹھتے ہوئے بولا۔

”دولت کی لالچ نے تمہارا خون سفید کر دیا ہے، جنہیں اپنے باپ کی موت کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں، سچ کہا ہے کسی نے کہ جو شخص حرام کی دولت سے اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے اس کی اولاد اس کے کسی کام نہیں آتی۔“ مشکل نے کہا۔

”بند کرو اپنا لکچر اور ان کاغذات پر سائن کر دو۔“ رضوان بولا۔

اسی وقت نیچے پڑے راجو کا جسم متحرک ہوا وہ گر پڑا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”بد ذات! شرافت سے ان کاغذات پر سائن کر دو ورنہ تیری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔“

مشکل کے لیوں پر استہزاء مسکراہٹ ابھری۔ ”زندگی تمہارے ہاتھ میں نہیں اور نہ ہی تم دونوں کے خواب دیکھنے پر باندھی ہے۔“

”اگر تم زندہ رہی تو دیکھ لو گی کہ میں نے خواب دیکھا ہے یا پختہ ارادے کا اظہار کیا ہے۔“ راجو کا داغ لگ اٹھا۔

”اگر تمہارے ارادے پختہ ہیں تو ورس بات کی ہے چلاؤ گولی۔“ مشکل نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اور کرخت لہجے میں کہا۔

شاذیہ ایک طرف پریشان سی کھڑی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ رضوان نے مشکل کو گندی گالیاں دیں۔ اس کے منہ سے گلیاں سننے میں مشکل کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے رضوان کے ہاتھ میں موجود مشکل کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برقی مستعدی سے رضوان پر چھلانگ لگا دی، اسے مشکل سے اس ویرانہ اقدام کی توقع نہ تھی، اس کے مشکل سے گولی نہ نکل سکی۔ مشکل نے اسے سنبھلنے کا موقع دینے بغیر کھنٹوں اور ٹکٹوں کی ضربوں پر رکھ لیا۔ نیچے گرنے سے رضوان کا سر کمرے کے فرش پر زور سے

نکرا یا تھا، اس لئے وہ مزاحمت نہ کر سکا اور وہ نہ صرف چت ہو گیا بلکہ اس کے ہاتھ سے مشکل چھوٹ کر گر پڑا، جسے مشکل نے لٹو بھر میں اٹھالیا۔

راجو نے بھی ایک طرف پڑا مشکل اٹھالیا جو شاید مردہ حشمت کا تھا۔ مشکل ہاتھ میں آنے کے باوجود وہ مشکل پر گولی نہ چلا سکا، شاید اس ڈر سے کہ کہیں گولی رضوان کو نہ لگے، وہ مشکل لہرتا ہوا مشکل کی طرف لپکا مگر مشکل رضوان کے سینے پر بیٹھ کر مشکل کی نال اس کی پیشانی پر رکھ چکی تھی۔ وہ سفاک لہجے میں بولی۔ ”مشکل پھینک دو ورنہ۔“ رضوان اور راجو کے چہرے خوف سے تاریک ہو گئے، بساط کو پلٹا دیکھ کر دونوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ لڑکی ہونے کے باوجود ان پر حادی ہو چکی تھی۔

راجو نے مشکل کا رخ شاذیہ کی طرف کر دیا۔ ”اے چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ تو مارنا گولی کس نے منع کیا ہے اس کے بعد رضوان کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی اور اگر مجھ پر گولی چلائی تب بھی نہیں بچے گا، میں مرتے مرتے اسے بھی جہنم رسید کر دوں گی، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ مشکل پھینک کر رضوان کی زندگی بچالو۔“ وہ سانپ کی طرح پھنکارتی۔

رضوان بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خوف زدہ تھا۔ بلکہ وہ کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا۔

”جلدی کرو مشکل پھینکو ورنہ گولی چلا دوں گی۔“ ”مشکل پھینک دو راجو۔“ رضوان بے چارگی سے بولا اور راجو نے مشکل پھینک دیا۔

”اب دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے پیچھے ہٹو۔“ اس نے مشکل کے حکم کی تعمیل کی اور ہاتھ سر سے بلند کر کے پیچھے ہٹا۔ مگر پیچھے ہٹتے ہی اس نے زمین پر پڑا خنجر اٹھاتا چاہا۔ مشکل نے نیچے کی سی تیزی سے حرکت کی اور راجو کا نشانہ لے کر ناز کر دیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی راجو کی پیشانی میں اتر گئی۔ اس کے حلق سے کرناک چیخ نکلی اور وہ نیچے گر پڑا۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو، مجھے مت مارتا۔“ رضوان مثل سے زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ مثل نے دانت بچھنے ہوئے ٹرگر بٹا دیا۔ گولی اس کے نیچے وہے رضوان کی پیشانی میں اتر گئی۔ اس کے جنم رسید ہوتے ہی مثل اس پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

مثل نے ایک طرف خوفزدہ کھڑکی شازبہ کا ہاتھ تھامنا اور کمرے میں بڑی رضوان، پست قامت شخص اور راجو کی لاشوں کی طرف نفرت بھری نظر ڈالتے ہوئے ان کی لاشوں کو پھلانگ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ برآمدے میں اصغر حسین کی لاش پر نفرت بھری نظر ڈالتے ہوئے اس نے ایک طرف پڑے اسفند یار کو دیکھا جو کسمپاسا ہوا اٹھ رہا تھا۔

”آپ دونوں کون ہیں اور انہیں کس نے کیفر کر دیا تک پہنچایا ہے۔“ اسفند یار نے کمرے میں بڑی راجو اور رضوان کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں میرے ہی ہاتھوں مرے ہیں ان میں سے ایک میرے والدین اور بھائی کا قاتل تھا۔“ مثل لاشوں کی طرف نفرت انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں ایسی بی اسفند یار ہوں، حشرت کو لینڈ کروڑ میں دیکھ کر اس کا پیچھا کرنے لگا، وہیں پتہ چلا کہ اس نے آپ لوگوں کو کڈ نیپ کیا ہے، جب یہ آپ لوگوں کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو میں دیوار پھلانگ کر مکان میں داخل ہو گیا اس کے بعد جو ہوا آپ کے سامنے ہوا، آپ دونوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ اسفند یار اپنی جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے بولا۔

”میرا نام مثل ہے اور یہ شازبہ ہے۔“ مثل نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی روداد سنا ڈالی۔

”اُدھ تو آپ ہیں مثل، مجھے ساحل نے آپ کے بارے میں بتایا تھا، آپ کو جگہ جگہ تلاش کیا مگر آپ نہیں ملیں اس دوران ساحل بھی غائب ہو چکا تھا۔“ ایس بی بولا۔

شازبہ ساحل کا نام سن کر لکھ بھر چوکی پھر سوچا۔ ”لازمی نہیں کہ یہ میرے ساحل کا ذکر کر رہے ہوں، ساحل نام کے بہت سے لوگ ہیں۔“

ایس بی اس دوران پولیس ایمر جنسی کا نمبر ملا کر اپنا تعارف کر دیا کہ پولیس باری کو طلب کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کیا اور بولا۔ ”پولیس کے آنے سے پہلے آپ لوگ یہاں سے جائیں، میں صورت حال کو سنہال لوں گا۔ آپ دونوں اچھے گھرانے کی لڑکیاں ہیں، بلاوجہ غیر ضروری تشویش میں پڑ جائیں گی اور ہاں میں مثل آپ اپنا ایڈریس دے جائیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر آپ سے رابطہ کر دوں گا۔“

مثل نے سے اپنا ایڈریس دیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ ”آپ اگر چاہیں تو میری کار لے جاسکتی ہیں۔“ وہ مثل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اسے یہ بہادر لڑکی پسند آئی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اس کا آئیڈیل چل کر اس کے سامنے آچکا ہو، جھٹک پو آفیسر، ہم نیکی سے چلے جائیں گے۔“ مثل بولی۔

”آفیسر نہیں میرا نام اسفند یار ہے۔“ وہ شونی سے بولا اور مثل شازبہ کا ہاتھ تھامے مکان سے باہر نکل گئی۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی فائرنگ اور ہنگامے کے باوجود اس مکان کی طرف کسی نے رخ نہیں کیا تھا، یہ وہی نہیں سکتا کہ فائرنگ کی آواز کسی نے نہ سنی ہو، پھر سوچا پھر کے حالات بھی کس قدر خراب ہیں، آئے روز کی دہشت گردی نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ مقامی پولیس مجرموں کے بجائے بے ضرر لوگوں کو پکڑ لیتی ہے، اس لئے بھی لوگ جانتے بوجھتے ہوئے گتے اور بہرے بن جاتے ہیں۔

وہ دونوں چلتی ہوئی جہاز یوں والی گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچیں اور نیکی کا انتظار کرنے لگیں۔ اسی وقت دو پولیس موبائل آگے پیچھے جہاز یوں والی گلی میں داخل ہوئیں۔ ”ہماری پولیس بڑی مستعد اور چاک دچو بند ہے ہمیشہ واردات کے کئی گھنٹوں بعد پہنچتی ہے۔“ مثل نے

طرز پر لکھ میں کہا اور شازبہ کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی۔ نیکی کا دور دور تک نام نشان نہ تھا، ابھی وہ نصف کلومیٹر ہی چلی تھیں کہ ٹھٹھک کر رک گئیں۔ طان شے اپنے بھیا تک چہرہ سمیت ان کے سامنے کھڑا خطرناک تیوروں سے انہیں گھور رہا تھا۔ مثل نے بے اختیار اپنے گلے میں موجود ہاتھوں جلال کے لاکٹ کو ٹولا اور دھک سے رہ گئی، لاکٹ گلے میں موجود نہ تھا شاید بھاگ دوڑ اور کھینچا تانی سے لاکٹ کہیں گر چکا تھا۔ ان دونوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا دل خوف سے جھل کر طعن میں آ گیا ہو۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جان بچانے کے لئے ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ طان شے انہیں بھاگتا دیکھ کر کسی عنفیت کی طرح ان کے پیچھے دوڑا۔ سڑک سے گزرنے والے لوگ تعجب سے یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہے تھے۔ دونوں جوان لڑکیاں سڑک پر بھاگ رہی ہیں جبکہ ایک بھیا تک صورت دیوہیل شخص ان کے پیچھے دوڑ رہا ہے، راستے میں چند افراد نے طان شے کی راہ میں حزام ہوتا چاہا۔ مگر ان کا حشر بہت ہی برا ہوا، طان شے نے انہیں کھلونوں کی طرح اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا۔ اس کا ہاتھ تھا کہ ہتھوڑا جسے پڑا تو دوبارہ اٹھ نہ سکتا۔ ان کا انجام دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ طان شے کو روک سکیں۔

وہ دونوں بھاگتی ہوئی پہاڑی سلسلے کے درمیان پہنچ چکی تھیں، چاروں طرف پہاڑ تھے جبکہ درمیان میں میدان تھا، اس میدان میں درجنوں کی تعداد میں لوگ موجود تھے جو پہاڑ پر موجود ایک شخص کو بڑی توجہ اور اشنہاک سے دیکھ رہے تھے۔

شازبہ، مثل اور ان کے پیچھے بھاگتے بھیا تک صورت طان شے کو دیکھ کر کہاں موجود لوگ سکتے ہیں آگئے، وہ عنفیت معلوم ہو رہا تھا۔ بہت سے لوگوں کی ڈر کے مارے پیچھے نکل گئیں۔

وہ دونوں بھاگتی ہوئی میدان میں داخل ہو چکی تھیں۔ طان شے ان کے پیچھے چھٹا چلا تا دو تار ہاتھ۔ یہاں بھی کچھ افراد نے اسے روکنا چاہا۔ جنہیں اپنی غلطی

کا خیال وہ اپنی زندگی کی صورت میں بھٹکتا پڑا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ وہ اس عنفیت سے جان بچانے کے لئے ایک طرف بھاگنے لگے۔ اسی وقت طان شے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بھاگتی ہوئی شازبہ کو پکڑ لیا۔ ”اب تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟“ وہ شیطانی آواز میں ہنسا۔

مثل شازبہ کو اس کے ہاتھ میں جکڑے دیکھ کر اپنی جگہ کر گئی۔ ”میں جان چکا ہوں تو میرے دشمن کی بیٹی اور دوسرے دشمن کی نوای ہے، اس لڑکی کے بعد تیری باری ہے۔“

شازبہ خود کو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑاتے ہوئے بلند آواز سے چیخ رہی تھی۔ ”بچاؤ بچاؤ۔۔۔۔۔ خدا کے لئے مجھے اس عنفیت سے بچاؤ۔“

اسی وقت پہاڑ پر بیٹھے عبادت میں مشغول شخص نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ شازبہ کی آواز سن کر مڑا تھا، اس کے بدلے ہوئے جلے کے باوجود شازبہ اسے پہچان چکی تھی۔ وہ اس کا محبوب اس کی محبت ساحل تھا۔ وہی ساحل جو تیل کی کال کوٹھری میں مڑوہ پایا گیا تھا۔ جسے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ قبر میں اتارا گیا تھا۔

شازبہ عنفیت کے ہاتھوں میں جکڑی ساحل کو دیکھ رہی تھی۔

ساحل کو دیکھ کر بھیا تک صورت طان شے کا خوف اور ڈر دل سے نکل چکا تھا۔ ”ساحل“ وہ بلند آواز سے چلائی۔

ساحل جو خود بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اپنا حصار توڑ کر تیزی سے پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔

اسے نیچے اترتا دیکھ کر ادھر ادھر بھاگنے والے لوگ رک چکے تھے۔ ”اچھا تو تو نے اسے مدد کے لئے بلایا ہے، چل اسے بھی آنے دے۔“ طان شے نے قہقہہ لگایا۔ اس کا قہقہہ اس قدر خوفناک تھا کہ لوگوں کے دل دھل گئے۔ اس اثناء میں ساحل پہاڑ سے اتر کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

”چھوڑ دے اسے۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔
 ”نہیں یہ دونوں میرا شکار ہیں آج انہیں میرے ہاتھوں مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تو بھی اپنی جان بچا کر بھاگ جا۔“ وہ ہماری ہر گونجیل آواز میں بولا۔
 ”شیطان تو اپنی شیطانی طاقتوں پر اتنا غمنڈ مت کر۔“ اسے اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی۔ طان
 شے نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک مجذوب کھڑا تھا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے تجھے دوبارہ زندگی شیطان نے دی ہے یہ تیری غلط فہمی ہے۔ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ نے اسباب کھنک پر ایک عمارت میں موت کو طاری کیا پھر وہ زندہ ہو گئے۔ زندگی بھی اللہ کی دی ہوئی تھی۔ تجھے مرنے کے بعد زندگی پر یقین نہیں تھا۔ تجھے یہ زندگی اس لئے دی گئی کہ تو جان سکے کہ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے، مگر تیرے دل پر مہر لگ چکی ہے، اسی لئے تو شیطان کا پیروکار بنا رہا ہے۔

ساحل کا عشق مجازی میں مبتلا ہو کر جیل جانا پھر جیل سے نکل کر مثل تک پہنچنا۔ شاز یہ کاتھ تک پہنچنا۔ ساحل کا عشق مجازی سے عشق حقیقی میں مبتلا ہونا سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ جو اللہ سے لوگ تائے شیطان اور اس کے پیروکار اس کا کچھ نہیں بناؤ سکتے۔ ساحل نے اللہ سے لوگ پایا ہے، اللہ ہی اس کی مدد بھی کرے گا۔ حق حق ہے اور باطل جتنا بھی طاقتور کیوں نہ ہو۔ فتح آخر حق کی ہی ہوتی ہے۔“ مجذوب جلال میں اچکا تھا۔

”یہ تیری بھول ہے، مجذوب میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، مجھے زندگی میں پہلی بار کسی پرترس آ رہا ہے، یہ مولوی بلا وجہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔“ وہ شاز یہ کو ایک طرف دھکیل کر ساحل کی طرف بڑھا۔

ساحل اپنی نظریں اس پر جمائے پرسکون انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس عفریت سے اسے ذرا ہراس بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ شاز یہ اور مثل کی آنکھیں خوف سے پھٹی جا رہی تھیں، انہیں ساحل کا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ ساحل نے نجانے کس خیال کے تحت زمین سے مٹی اٹھائی اور بلند آواز سے آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ اچانک

بادل گر جتنے لگے، طان شے نے خوف زدہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک دم ہی موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ بارش اس قدر تیزی سے برس رہی تھی کہ وہاں موجود تمام افراد بلب بلبھری میں طرح بلبگ چکے تھے۔ طان شے کی انگوٹھی بارش کے پانی میں بلبگ چکی تھی۔ اس نے بھاگتا چاہا تو ساحل نے اپنی مٹھی میں موجود مٹی طان شے پر چھینک دی، مٹی کا جسم سے لگنا تھا کہ وہ زمین پر گر کر تر پنے لگا۔

”مثل بننا اس کے دل میں خنجر اتار دو۔“ مجذوب کی آواز گونجی اور مثل نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر ہاتھ میں لیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر طان شے کے سینے میں عین دل کے مقام پر پھپھرت کر دیا۔

طان شے کی آخری چٹخیں لرزہ خیز تھیں۔ اب حیرت انگیز طور پر برسنے والی بارش رک چکی تھی۔ طان شے کی لاش دھوئیں میں غلیل ہو کر غائب ہو گئی۔ میدان میں موجود تمام افراد خوف زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مجذوب نے ساحل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”چلے کے آخری روز چلے مکمل کئے بغیر پلٹ کر دیکھنا تیری غلطی تھی، میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ مڑ کر مت دیکھنا۔ خیر تو نے مجبوری کی حالت میں یہ سب کیا۔“ مجذوب نے کہا اور ساحل نے اداسی سے اپنی گردی اثبات میں ہلا دی۔

”خیر! اوپر والے کو تجھ پر ترس آ گیا، تو نے بہت دھکے کھائے اور پھر آخر کار اللہ کو خالق مالک اور مددگار سمجھتے ہوئے اس سے لوگایا، جاننا خواہش کی تکمیل کر، اللہ کے آگے ہمیشہ جھکتے رہنا، اور آئندہ کوئی بھی ناش غلطی نہ کرنا۔“ اور یہ بولتے ہی مجذوب اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔

مثل کے ساتھ ساحل اور شاز یہ نے آگے کی جانب قدم بڑھا دیے، ان تینوں کوئی زندگی اپنی آغوش میں لینے کے لئے انتظار کر رہی تھی۔

